۳۳
روشنائی
کراچی
مدیر
احمد زین الدین
ڈاکٹر وحید قریشی
قیمت: ۱۰۰ روپے

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

خصوصی شمارہ

تخلیقی ادب کا فکر انگیز ترجمان

سہ ماہی

روشنائی

کراچی

مدیر

احمد زین الدین

خصوصی مشیر

نکہت بریلوی

تزئین کار:

بشیر موجد

زیرِ اہتمام: نثری دائرہ پاکستان۔ کراچی

روشنائی: ۳۳

جلد: ۹ شمارہ: ۳۳ اپریل تا جون ۲۰۰۸ء

قیمت فی شمارہ: ۱۰۰ روپے زرِ سالانہ (برائے چار شمارے پاکستان میں بمعہ ڈاک خرچ): ۴۵۰ روپے

بھارت میں فی شمارہ: ۱۰۰ روپے (علاوہ ڈاک خرچ) رجسٹرڈ ڈاک سے: ۴۰۰ روپے

سعودی عرب/امارات: ۱۲۵ ریال/درہم، امریکہ: ۳۵ ڈالر، یورپ: ۲۵ پونڈ، دیگر ممالک ۳۵ ڈالر کے مساوی

بیرونِ ملک سے زرِ رفاقت ڈرافٹ/پے آرڈر/چیک بیرونِ ملک کسی بھی پاکستانی بینک کے ذریعہ (روپوں میں) تبدیل شدہ رقم کی صورت میں بنام ''زین پبلی کیشنز'' یا ''کوارٹرلی روشنائی'' ارسال کریں۔

رابطہ دفتر رجسٹری و ترسیلِ زر زین پبلی کیشنز یا کوارٹرلی روشنائی، کراچی کے نام

A-8 ندیم کارنر، بلاک 'N'، نارتھ ناظم آباد، بالمقابل ڈی۔ سی سنٹرل آفس، کراچی۔ 74700

فون نمبر: 6679796, 6645177

e-mail: sabaekram@hotmail.com

quarterlyroshnai@hotmail.com

Regd.No.: SC 1296
dated: 3.4.2008

Declaration No.DC(C)GB/PUB(Q)587/20 dated 26.2.2000

ایڈیٹر، پبلشر، پروپرائٹر احمد زین الدین نے الحمد برادرز پرنٹرز، ناظم آباد، کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

ترتیب

اداریہ

گلہائے عقیدت

حرفِ نقد

خصوصی مطالعہ

شعلہ و شبنم — نظمیں

کتھا، کہانی

شخصیت

حسنِ تغزل

زندہ تحریریں

فنونِ لطیفہ

خراجِ تحسین۔ ڈاکٹر وحید قریشی

گوشۂ ڈاکٹر وحید قریشی

نمونۂ تحریر

شاعری

ترجمہ، تبصرہ، تجزیہ

خراجِ عقیدت۔ڈاکٹر خورشید جہاں

نمونۂ تحریر

جہانِ ادب

......کہ لب آزاد ہیں تیرے

اداریہ

نوکِ قلم !

قارئین کرام!

"روشنائی" کا تینتیسواں شمارہ سال رواں کی دوسری سہ ماہی کے دوران حسب روایت پابندیٔ وقت کے ساتھ پیش خدمت ہے۔ اس طرح یہ ادبی مجلّہ اپنی عمر کے نویں سال میں قدم رکھ رہا ہے، جس کے لیے ہم اللہ رب العزت کے بے حد شکر گزار ہیں کہ اس نے ہمیں ہمت دی کہ ہم گونا گوں مسائل اور مشکلات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے اپنے کام کو جاری رکھنے میں کامیاب ہوئے۔

ادبی رسالہ نکالنا اور زبان وادب کے دیگر کاموں کو جاری رکھنا روز بروز مشکل سے مشکل تر ہوتا جارہا ہے۔ ہوش رُبا مہنگائی نے جہاں معاشی مشکلات پیدا کر کے زندگی کو اجیرن بنادیا ہے وہاں اچھے کاغذ کی روز افزوں بڑھتی ہوئی قیمت اور چھپائی نیز جلد بندی سے متعلق اشیاء کی قیمتوں میں بے پناہ اضافے نے ہوش اُڑا دیے ہیں، یوں رسالوں اور کتابوں کو اچھے کاغذ اور نفاست وسلیقے کے ساتھ شائع کرنا دشوار ہوتا جارہا ہے (انھیں وجوہ کی بنا پر 'روشنائی' کو معمولی نیوز پرنٹ پر نہ چاہتے ہوئے بھی مجبوراً شائع کرنا پڑ رہا ہے)۔ اس ضمن میں جب لاگت کے اعتبار سے کتابوں اور رسالوں کی قیمت کا تعین کیا جاتا ہے تو وہ عام آدمی (قاری) کی پہنچ اور قوت خرید سے بالاتر ہو جاتی ہیں۔ اس طرح علم کا فروغ اور فکر انگیز خیالات کی ترسیل ناممکن ہوتی جارہی ہے۔ جبکہ ارباب اختیار علم کے فروغ کا چرچا کرتے رہتے ہیں اور تعلیم کے فروغ پر کروڑوں بلکہ اربوں روپے کے فنڈ مختص کیے جاتے ہیں۔ بچوں کو اسکول بھیجنے پر زور دیا جاتا ہے مگر کاپی، کتاب اور دیگر اسکولوں کے لوازمات پر بالکل توجہ نہیں دی جاتی۔ ایک عام اور متوسط درجے کا شہری اپنے بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں مہنگی ترین کاپی اور کتاب کی خرید کے سلسلے میں جس قدر زیر بار اور بے بس ہے اس کا احساس شاید ارباب اختیار کو بالکل نہیں۔ مفت تعلیم کا سیاسی نعرہ لگا کر شاید وہ یہ سمجھتے ہوں کہ ہم نے میدان مار لیا، مگر ایسا غالباً بالکل نہیں ہے۔ زمینی حقائق اور اصل صورت حال بالکل مختلف ہے۔ جن کے چار چھ پڑھنے والے بچے ہیں ان کے دل سے پوچھیے کہ ان پر کیا گزرتی ہے۔ ان مسائل اور مشکلات پر فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ کاغذ کی فیکٹریاں لگانے، مارکیٹ کو کنٹرول کرنے، منافع خوری کی لعنت کو دور کرنے اور غیر ضروری ٹیکس اور ڈیوٹی کو ختم کرنے کی اشد ضرورت ہے ورنہ ہم تعلیمی میدان میں کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکیں گے۔

دوسری جانب محکمہ ڈاک نے ٹکٹ اور فیس کے نرخوں میں اضافے کے ذریعہ جو ظلم روا رکھا ہے اس نے رابطے کے سستے اور آسان ذریعہ کو مشکل تر بنا دیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ 'خط کے ذریعہ نصف ملاقات ہو جاتی ہے' مگر اب ایسا نہیں رہا۔ محکمہ ڈاک کا سلوگن 'خدمت، دیانت اور امانت' ہے، مگر عام ڈاک سے خط بھی نہیں پہنچتا۔ رجسٹرڈ ڈاک میں پھر اضافہ کر دیا گیا ہے، وہ بھی بیرون ممالک کی رجسٹری فیس میں دوگنا اور ملکی رجسٹری فیس میں اسی تناسب سے اضافہ کیا گیا ہے۔ دیگر مد میں بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ 'لوکل ایکسپریس سروس' (L.E.S) جو اندرون شہر کے لیے رجسٹرڈ سروس تھی اسے ختم کر دیا گیا ہے حالانکہ اس سے بڑی سہولت میسر آ گئی تھی۔ یہ تو اضافے کی چند مختصر باتیں ہیں، اس کی تفصیل تو شاید زیادہ اذیت ناک اور روح فرسا ہو۔ جس کے سبب کئی دشواریاں پیش آ رہی ہیں۔ کتابوں اور رسالوں کے پیکٹ کو جسٹرڈ ڈاک کے ذریعہ بحفاظت بھیجنا مشکل ہو گیا ہے۔ اس کی دادرسی کون کرے گا۔

کچھ عرصہ پہلے جب محکمہ ڈاک نے اپنی خدمات میں ۳۵ فی صد اضافہ کیا تھا تو لاہور کے دردمند ادیبوں اور دانش وروں اور چند ادبی رسالوں (بشمول 'روشنائی') نے پُرزور احتجاج کیا تھا مگر اس کا بھی کوئی خاطر خواہ اور حوصلہ افزا نتیجہ نہیں نکلا تھا۔ محض چند روپے کم ہو گئے تھے۔ اب پھر رجسٹری فیس، منی آرڈر فیس اور وی پی کے نرخ میں بلا جواز اضافہ کر دیا گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ محکمہ ڈاک کا عوام سے کوئی رابطہ قائم نہیں رہا۔

ہم ارباب حکومت سے استدعا کرتے ہیں کہ ان مسائل پر فوری توجہ دی جائے تا کہ کتابوں، ادبی مجلّوں اور دیگر عوامی سہولت کے ذریعہ علم کا فروغ ممکن ہو سکے اور جو چند ادبی رسالے جوکھم اٹھا کر شائع ہو رہے ہیں وہ غیر ممالک اور دور دراز کے قارئین تک بہ آسانی پہنچ سکیں اور ادب کے ذریعہ ذہنی نشوونما ہوتی رہے ورنہ معاشرہ بنجر ہو جائے گا اور ہم روشن مستقبل سے محروم ہو جائیں گے۔

——احمد زین الدین

''روشنائی'' کا آئندہ شمارہ بابت جولائی تا ستمبر ۲۰۰۸ء ''قرۃ العین حیدر نمبر'' ہوگا جو ان کی پہلی برسی کے موقع پر شایانِ شان انداز میں شائع کیا جائے گا۔ اس اہم اور منفرد نمبر کی تیاری تقریباً مکمل ہو چکی ہے۔ اس نمبر کے عام ایڈیشن کے علاوہ اس کا مجلّد ڈیلکس ایڈیشن بھی محدود تعداد میں شائع کیا جائے گا جس کی مناسب قیمت رکھی جائے گی تا کہ ان کے چاہنے والے اپنی آسانی اور سہولت سے حاصل کر سکیں۔

ہماری گزارش ہے کہ بک سیلرز اور اس یادگار نمبر کے خواہش مند حضرات ہمیں پہلے سے مطلع فرما دیں اور اپنا آرڈر بک کرا دیں تا کہ انھیں اس کے حصول میں دشواری نہ ہو اور مایوسی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ (ادارہ)

پروفیسر سیّد محمد ابوالخیر کشفی انتقال کر گئے

''روشنائی'' کا موجودہ شمارہ۔۳۳ پریس جا چکا تھا جب اچانک سناؤنی آئی کہ اردو کے نامور ادیب، نقاد اور دانشور نیز مذہبی اسکالر اور جامعہ کراچی کے شعبۂ اردو کے سابق چیئرمین اور استاد الاساتذہ پروفیسر ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی، فالج کے حملے کی وجہ سے مختصر علالت کے بعد جمعرات ۱۵رمئی ۲۰۰۸ء کے دن ایک مقامی ہسپتال میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ان کی عمر ۷۷ برس تھی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے اور پس ماندگان کو یہ صدمہ برداشت کرنے کی توفیق عطا کرے۔ آمین۔ ان کی نمازِ جنازہ جامعہ کراچی کی مرکزی جامع مسجد ابراہیم میں ادا کی گئی اور اسی مادرِ علمی کے قبرستان میں انھیں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ ان کی تجہیز و تکفین میں ان کے چاہنے والوں، شعراء، ادباء، اساتذہ اور شاگردوں نے بڑی تعداد میں شرکت کر کے انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ ان کا انتقال علم و ادب کے لیے ایک عظیم سانحہ ہے۔ ادارہ ''روشنائی'' ان کے غم میں نہایت سوگوار ہے۔

مجلّہ ''روشنائی'' سے ان کی ذہنی اور قلبی وابستگی دمِ آخر تک برقرار رہی۔ انھوں نے ہر قدم پر ہماری رہنمائی فرمائی۔ ''روشنائی'' کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ دوبارہ انھیں ادبی دنیا میں واپس لے آیا اور ان کی فکر انگیز تحریروں نے اس کے وقار و اعتبار میں اضافہ کیا۔ ان کی ہر تحریر ''روشنائی'' کے لیے ہوتی تھی جس کا انھوں نے بعض مدیروں سے برملا اظہار بھی کیا تھا۔

ادارہ ''روشنائی'' نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ شماروں سے ان کی یاد کو زندہ رکھنے اور ان کی ادبی خدمات کو تابندہ تر بنانے کے لیے ''روشنائی'' کے سرنامہ پر ''سیّد محمد ابوالخیر کشفی کی یاد میں'' تحریر کیا جائے گا۔

ادارہ

گلہائے عقیدت

حمد

صدیق فتح پوری

کچھ اس میں شائبہ نہیں وہم و گمان کا
"لاریب تو کفیل ہے دونوں جہان کا"

تجھ کو ہی یاد کرتے ہیں مشکل گھڑی میں سب
آتا ہے وقت جب بھی کوئی امتحان کا

کشتی کنارے لگتی ہے تیرے ہی فضل سے
رکھتا بھرم ہے تو ہی مرے بادبان کا

محفوظ میں جو ہوں، مجھے پختہ یقین ہے
رکھتا ہے تو خیال مرے جسم و جان کا

یہ تیری شان ہے کہ تو بلوا کے عرش پر
رتبہ بلند کرتا ہے شاہِ زمان کا

توقیر تو نے بخشی ہے کیا مشتِ خاک کو
مہماں بنا دیا ہے اسے آسمان کا

موسم خزاں کا ہو کہ بہاروں کا سلسلہ
ہے ترجمان تو ہی تو پیر و جوان کا

نکلی جو بات دل سے فلک تک پہنچ گئی
حائل ہوا نہ مسئلہ کوئی زبان کا

صدیق اس نے بخش دیئے میرے سب گناہ
جب ذکر بار بار کیا اس کی شان کا

دُعا

نذیر فتح پوری

مسافتوں کے تصور سے ہے ملال مجھے
سفر مدام سفر ہے ذرا سنبھال مجھے

مرے حواس کو لوٹا دے پھر توانائی
کہ بوڑھے لگنے لگے ہیں یہ ماہ و سال مجھے

قبولیت کی حدیں میری راہ تکتی ہیں
دعا کے ہاتھ سے اوپر ذرا اُچھال مجھے

ابھی تو بوجھ ہے کاندھوں پہ میرے ہستی کا
ابھی تو کرنی ہے بچوں کی دیکھ بھال مجھے

میں خود کو سونپنا چاہوں گا تیری دنیا کو
کسی خلوص، کسی آشتی میں ڈھال مجھے

مدافعت کا کوئی حوصلہ عطا کر دے
جکڑ نہ لے کہیں حالات کا یہ جال مجھے

جو کچھ بچی ہے وہ یادِ خدا میں کٹ جائے
نذیر آنے لگا ہے یہی خیال مجھے

☆☆

نعت

حباب ہاشمی

آپؐ ہی ختمِ رسل ہیں اور کہیں کوئی نہیں
آپؐ ہی محبوبِ رب ہیں بالیقیں کوئی نہیں

سارے اوصافِ حمیدہ مجتمع ہیں آپؐ میں
دو جہاں میں آپؐ کے جیسا حسیں کوئی نہیں

آپؐ ہی شمس الضحیٰ ہیں، آپؐ ہی بدرالدجیٰ
حق تو یہ ہے دوسرا ماہِ مبیں کوئی نہیں

آپؐ اخلاقِ مجسم، پیکرِ صبر و رضا
آپؐ کی تمثیل بر روئے زمیں کوئی نہیں

آپؐ ہی ہیں رحمتِ برحق زمانے کے لیے
آپؐ ہی ہیں رحمت اللعالمیں کوئی نہیں

ایک طوفانِ بلا ہے الامان و الحفیظ
اور سہارا اے شہہِ دنیا و دیں کوئی نہیں

میں گنہگار مجسم سر بسر عصیاں حبابؔ
توشۂ محشر شفیع المذنبیں کوئی نہیں

☆☆

اکرام تبسم

ادھر بھی ہو جو کرم کی نظر رسول اللہ
شبِ حیات کی دیکھوں سحر رسول اللہ

تمھاری آیتیں ہیں میرے راستے کے چراغ
تمھارے نقشِ قدم میرا گھر رسول اللہ

میں زندگی کے سفر پر چلا ہوں خالی ہاتھ
عطا ہو کچھ مجھے زادِ سفر رسول اللہ

تمھارے عشق میں سرشار ہونا چاہتا ہوں
بندھاؤ تم مری ہمت اگر رسول اللہ

زہے نصیب میسر تمھارا سایا ہے
زمانہ دھوپ ہے اور تم شجر رسول اللہ

☆☆

حرفِ نقد

اردو کی نئی تنقید پر کچھ باتیں

سید محمد عقیل

اردو کی نئی تنقید ادھر کچھ دنوں سے اسلوبیات کے پیچاک میں اسیر ہو گئی ہے۔ مگر یہ کوئی انہونی اور عجوبہ نہیں ہے۔ جب کوئی تخلیق وجود میں آتی ہے تو یقیناً تخلیق کو اس کی تمام صورتوں کے ساتھ سمجھنا ضروری بھی ہے۔ پھر اسلوب نگارش اور اس کے تمام متعلقات تخلیق مذکورہ کو سمجھنے اور اسے آنکنے میں ضرور زیر بحث آئیں گے اور انھیں آنا بھی چاہیے۔ 'خیال' جب مادّے کے ساتھ وجود میں آتا ہے تو 'خیال' کی پیدائش اور اس پیدائش میں فکرِ انسانی پر مختلف دباؤ (Pressures) کو سمجھنا اور ان کے منابع نیز متعلقات پر غور اور ان کا آنکنا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ تو پھر تخلیق کے میک اپ، اس کی خوبیوں (Nicities)، تزئین، کمیوں اور ان سے پیدا ہونے والے تاثرات اور ان کے اسباب و علل پر بھی باتیں ہوں گی اور یہ باتیں کی بھی جانی چاہیے ہیں۔

یوں بھی تخلیقات پر بحث کرتے ہوئے، ہر دور میں اپنی کچھ ترجیحات ہوا کرتی ہیں۔ کبھی متن و بیان پر زور ہوتا ہے تو کبھی ظاہری حُسن و صورت پر۔ کبھی فکری اعماق کی تلاش، تنقید کی دلچسپیاں بنتے ہیں کہ تخلیق، متن سے الگ کچھ نہیں، بلکہ انھیں سب صورتوں کا مجموعہ ہے۔ آج جو یہ ساختیات، ردِ تشکیل، یا تعبیر اور متنیت (Textuality) کی باتیں، تنقید میں ہو رہی ہیں یہ سب اصولِ تنقید یعنی (Theory of Criticism) سے آگے بڑھ کر، ایک طرف تو یہ اصولِ تنقید کی تجربی عملی (Applied) صورتیں ہیں تو دوسری طرف خیال کی ترسیل اور پھیلاؤ نیز اس کی بُنت کی بھی باتیں ہیں جو نئے نقاد کر رہے ہیں۔ ہاں اس میں عندیہ یعنی تجربی Message اور خبر کو جیسے تیسرا درجہ مل رہا ہے۔ تخلیق میں 'بیان' اور اس کا Application اس کے اوزار (Tools)، ان کے Coordinations، پھر ان کی تشکیل اور اس تشکیل میں سلیقے، حُسن کے برتاؤ، الفاظ کی چمک، قدیم اور نئے حالات کے ساتھ ان کی بدلتی ہوئی لفظی و معنوی کیفیات، ایجاب و انکار وغیرہ پر خاصا زور ہے۔ راقم کا خیال ہے کہ تخلیق کو اس طرح پرکھنے اور سمجھنے کی کوششیں، اردو تنقید میں ایک خاص ہوا ہے جو عملی تنقید کا اگلا قدم ہے جس سے اتفاق کرنا چاہیے۔

ہم، خیال کے سرچشموں اور ان کے سیاسی و سماجی اثرات، مخرج اور مدخل کو تو تلاش کر لیتے ہیں کہ بغیر 'خیال' کے تخلیق بے مصرف ہے مگر 'خیال' کے اطراف و جوانب، علی الخصوص 'تخلیق' کے اطراف و جوانب کی ایک

کھوج اور چھان پھٹک جیسی کہ نئی تنقید کر رہی ہے یہ پرانی تنقید میں کماحقہ نہیں ہو سکتی۔ 'تخلیق' کی تجسیمی (Built up) صورتوں، ان کے طور طریقوں، عضویتی پیکروں نیز ترکیبی فضا، اوزاروں اور ان سے ہوئی تعمیری فضا اور آخر پر باتمیں تخلیق کی پوری طرح تکمیل کرتی ہیں۔ کبھی تشبیہات اور استعاروں سے کبھی آہنگ، الفاظ اور ان الفاظ کی کھنک دار آوازوں سے، کبھی نفسیات پوشیدہ اشاری موڑوں (Turns) اور نہاں خانوں کو سامنے لا کر۔ الفاظ کے دار و بسط اور ان کے تحرکات کو بھی نئی تنقید نظر میں رکھے ہوئے ہے کہ کب الفاظ اپنی محض معنویت اور ماہیت کی فضا کو چھوڑ کر روزمانی آہنگ کو ساتھ لے کر کیسے بیان اور نئی معنویت میں داخل ہو رہے ہیں۔

یہ جو تجزیاتی تجربے ادھر اُدھر نئی تنقید میں ہو رہے ہیں ان سے تخلیق کی تفہیم میں ایک نئی امتشانی صورت پیش ہو رہی ہے جو نئی تنقید کا نیا اور کارآمد طریق کار ہے جس سے تنقید کی دنیا کی جرگہ بندی اور کسی حد تک 'انانیت' اور 'من مانا پن' بھی ٹوٹ رہے ہیں اور نئی تنقید کو سانس لینے کے لیے شاید ایک نسبتاً بسیط فضا ملے گی۔ پھر تخلیقات کی مشروط بلٹ اَپ (Built up) فضا میں ایک رخنہ بھی پڑے گا۔ یقیناً 'تخلیقی خبر' اور 'خبر رسانی' (Message from Creation) اہم اشیا ہیں۔ مگر اس 'تخلیقی خبر' کی تعمیر میں کون کون سے عوامل اور مسالے کام کر رہے ہیں، ان کی بھی تلاش لازمی ہے کہ یہ باتمیں تخلیق کا پیکری مطالعہ بھی ہیں جن سے تخلیق کی کلیت کو سمجھنے میں خاصی مدد ملے گی۔

اس تجسیمی مطالعے میں کچھ اوپری صورتیں بھی ہیں جنھیں ساختیات، پس ساختیات اور خالص متنیت (Textuality) کے مطالعاتی طریق کار سے بھی لیا جا رہا ہے جہاں معنویت کی سطح اور ادبی مثبت کاریاں نیز فکری گہرائیاں جیسے چھوٹ سی جاتی ہیں اور صرف ماورائے معنی و بیان صورتیں ہی زیر بحث اور عمل ہو کرتی ہیں۔ ایک ذرا باریک سی بات یہ بھی ہے کہ یہ ایک عالمی بہاؤ ہے جو شاید مارکسی تنقیدی فکر کے برخلاف وجود میں آیا ہے کہ مارکسی تنقیدی رویے، فن پارے اور تخلیقات کو زیادہ تر آئیڈیالوجی کے دائرے ہی میں پرکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ کھلی تنقیدی فکر (Open Critical Cosmogny) میں یہ رویہ تقریباً مشروط طریق کار بن جاتا ہے خواہ کوئی اس کا تابع ہو یا نہ ہو۔ مگر یہاں تک تو یہ رویہ ضرور قابل غور ہے کہ زندگی نیز فکر میں جو سماجی اُتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں بس انھیں کو خاص طور سے فوکس میں رکھا جا رہا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ اس طریق کار سے خفا بھی ہوں کہ 'تخلیق' صرف وقت، زمانہ، سماج، تہذیب یا تہذیبی ورثے کے محاسبے کا ادراک یا بیان نہیں۔ 'تخلیق' اس کے علاوہ بھی بہت کچھ اپنے ساتھ لیے رہتی ہے۔ اس کا بھی تو محاسبہ ہونا چاہیے۔ آخر 'تخلیق' کا حُسن، ارتکاز، معنی و بیان اور طرز بیان سب کو بھی تو تنقید میں آنکنا چاہیے۔ ورنہ تخلیق کا مجموعی تاثر اور حُسن، اکہرا ہو سکتا ہے۔ تو اب تنقید میں 'صرف' 'خبر' (Message) کی بات نہ کر کے 'صرف' ان 'خارجی لوازمات' پر باتمیں ہوں گی اور تخلیق نیز اس کی 'خبر' (Message) جو ایک عضویتی

(Organic) عمل بھی ہے اس کی قدر و قیمت اور تشخیص صرف آئیڈیا لوجی کی پرکھ اور کسوٹی کے ساتھ ممکن نہیں ہوگی بلکہ 'تخلیق' کی تعمیر (Built up) میں دوسرے اجزا بھی زیرِ غور ہوں گے۔ ادیب کا خود اپنا نقطۂ نظر اور مقصد بھی، ساتھ ہی ساتھ 'تخلیق' کا ہدف (Thrust) بھی۔

تخلیق میں اسلوب نگارش کی باتیں ایک زمانے میں اس طرح ہونے لگی تھیں جیسے ادب کا مقصد صرف اسلوب اور ڈکوریشن ہی ہے اور 'خیال' میں صرف رومانیت ہی اہم موضوع ہے۔ ایسے طریق کار اور ایسی سوچ نے ادب کا توازن کھو دیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ نئی تنقید نے ایک توازن بنا لیا ہے۔ چنانچہ آج جب اسلوب نگارش کی بات اٹھتی ہے تو نثر میں اسے اس طرح آنکا جا رہا ہے کہ "اسلوب نثری ہے"، "شعریت زدہ ہے"، یا "صحافیانہ۔" الفاظ کی تصریف مرصع کاری کے ساتھ ہے یعنی Ornate ہے، عاری ہے یا کوئی ملی جلی صورت ہے یا کیا ہے۔ پھر ملی جلی صورت میں بھی کہیں بلند آہنگی ہے اور کہیں سادگی، جیسے کہ آزاد کی نیرنگِ خیال والی اسٹائل یا پھر ابوالکلام آزاد والی وہ مرصع بیانی جس کے لیے کیفی اعظمی نے کہا تھا:

"مولانا آزاد کو دیکھا، لفظوں کے صیاد کو دیکھا" وغیرہ۔

نئی اردو تنقید، جیسا کہ راقم نے کہا ہے، اجر گہ بندی کو توڑ کر آگے بڑھ آئی ہے۔ کم از کم اس نئی اردو تنقید کے متعلق راقم کا یہی خیال ہے۔ یہ نئی تنقید، نیو کریٹسزم والے میکیان، کرین، کیسٹ اور میکلین والے طور طریقوں اور آئی اے رچرڈس نیز ایمپسن والے اسکول سے بھی بہت آگے آگئی ہے۔ کبھی کبھی چند بزرگوں کی قیادت میں کچھ نو آموز، ضرور چند مغرب کے کچھ نامانوس ناقدین کا حوالہ دے کر اپنی کارگزاریوں کا اظہار کرتے رہتے ہیں مگر انھیں صرف ایرنٹس سمجھنا چاہیے۔ انھیں شاید اندازہ نہیں کہ اب اردو کی رواں دواں تنقید، فرانسیسی ماہر لسانیات ناقدین، دریدا، ساسور اور لاکان وغیرہ کو بھی پیچھے چھوڑ رہی ہے اور ان ناموں کا اس پر سے رعب ہٹ رہا ہے۔ یقیناً دریدا اور ساسور وغیرہ نے اردو کی نئی تنقید کو خاصا متاثر کیا اور ان سے نئی تنقید نے خاصا فائدہ بھی اٹھایا کہ علم و ادب کی دنیا میں دروازے کھلے رکھنے چاہئیں، چاہے ہم ان سے اتفاق کریں یا نہ کریں۔ نئی تنقید میں کبھی کبھی یہ بھی معلوم ہونے لگتا ہے کہ یہ تنقید، تخلیق میں الفاظ کے صرف، ان کی مختلف الجہاتی اور کیفیات کی باتیں تو کر رہی ہے جو اچھی بات ہے لیکن الفاظ کی سماجی اور تہذیبی حیثیت نیز زمانہ اور تاریخ کی ارتقائی یا تغیر پذیر کیفیات کو بہت کم زیر بحث لاتی ہے جو ایک طرح کی کمی ہے۔ یہ راقم الحروف کا اندازہ (Observation) ہے کوئی تحکیم نہیں، نہ "Dictation" ہے۔ راقم کا خیال ہے کہ یہ ایک طرح کی کمی ہے۔

اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ آخر ذوق اور غالب کے دور کے صرفی الفاظ اور ان کی ساری تہذیبی، نحوی، صرفی اور تاریخی صورتیں، امکانات اور ادبی طاقتیں، نیز محلِ استعمال کیسے اور کیوں بدل گئے؟ میر انیس کے شعر "چمکی جو محبت چمن شاہ و بجرونہ" یا "جھڑی ہوا نے جو کے یہ ادب روزی خبر"، "پھر" جب تک وہ محو فیض بڑے

وضو بڑھے/بڑھ کر قدم تو نے کہ تری آبرو بڑھے" یا "ہر اک کی جانب دیر دولت نگاہ ہے"، "بیٹھے ہیں زین پوش بچھائے ہوئے سوار" اسی تنظیم زندگی ہی میں ممکن تھے جنھیں آج سمجھنا یقیناً مشکل ہے۔ کیا یہ تمام باتیں لائق مطالعہ نہیں کہ ان میں ایک تہذیب سموئی ہوئی ہے جو تاریخ کے ساتھ بدلتی گئی ہے؟ اسے محض یوں کہہ کر تو ٹالا نہیں جا سکتا کہ "ان الفاظ اور محاورات کی سطحیں پیچیدہ ہو گئی ہیں اور یہ اب استعمال کے لائق نہیں رہ گئے۔" "قدم لینا" اور "آبرو بڑھنے یا بڑھانے کی تمنا" آج بھی کسی نہ کسی شکل میں دلوں میں جاگزیں ہے اور اس نیتا گیری کے سماج میں آج بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ سوچ یا تو دورگزری (Side Tracking) ہے یا پھر بے خبری یا دانستہ بے خبری ہے۔ اس پر بھی نئی تنقید میں کھل کر باتیں ہونی چاہیے تاکہ اردو تنقید کی تاریخ ان کیفیات اور ایک خاص وقت اور تاریخی زندگی کی ان منجمد تصویروں کا بھی احساس دلاتی رہے اور تبدیلیوں کے اُتار چڑھاؤ کی بھی تاریخ یہ تنقید مرتب کرتی چلے۔ "تحقیقات" میں الفاظ اور محاوروں کے پیچھے خاندانی، طبقاتی، گھریلو اور ایک خاص دور کے ادبی تصرفات، پسندیدگی اور ناپسندی کا آہنگ یا اشاری، مطبوع اور نامطبوع تصرف، سب کچھ زبانوں اور خاص طور پر اردو کے مستقروں پر ہوتے رہے ہیں اور جو الفاظ آج ایک بالکل نئی فضا میں پہنچ کر اپنے چہرے مہرے بدل چکے ہیں یا علاقائی اثرات ان پر اپنی کارستانیاں دکھاتے رہے ہیں ان کا بھی محاسبہ نئے مغربی اور مشرقی لسانی معیاروں کے ساتھ کر لینا چاہیے۔

اردو کی تقریباً تمام کلاسیکی تحقیقات میں مشرقی زندگی ادب اور ادب کے آنکنے کے مشرقی تنقید کے اصول شامل رہے ہیں یہاں تک کہ افلاطون کا نظریہ بھی جہاں تخلیق الہامی کیفیات کی حامل سمجھی جاتی رہی ہے اور پھر تمام یونانی اور رومن ادبی مفکرین کے خیالات بھی جو اپنی تدوینی حیثیت میں الفاظ کی بحث اور مباحث میں لانجائنس (Longinus) یعنی لانگ گینس تک چلے آتے ہیں۔ یہاں "تحقیق" میں وہ مخصوص لفظی تنظیم بھی شامل ہے جسے کبھی "جدیدیے" اپنا بنایا ہوا نظریۂ ادب بتاتے تھے۔ اسی پس منظر سے آج مغرب میں تنقید میں نئی شاخیں پھوٹی ہیں جن میں برابر ایجاب وقبول، اقرار وانکار اور حک واصلاح ہوتے رہتے ہیں۔ کوئی بھی تنقیدی یا ادبی اصول حتمی یا آخری نہیں کہ تغیر ہی ادب اور زندگی کی جان ہے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ مصنفین ادب کچھ دنوں بعد خود اپنے ہی بنائے ہوئے تنقیدی اصولوں اور ادبی تھیوریوں کا انکار کرنے لگتے ہیں جیسا کہ خود ژاک دریدا نے کیا۔ تقریباً پندرہ برس پہلے دلّی کی جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے ایک لیکچر میں اس نے برسرِ محفل کہا تھا کہ اب وہ خود اپنے بنائے ہوئے بہت سے لسانی اصولوں سے اتفاق نہیں کرتا۔ اور یہ بھی کہ ردِ تشکیل ایک طرح کا تجزیہ ہے منسوخی (Dissolution) نہیں۔ یعنی الفاظ اور معنی پر یک قلم خطِ تنسیخ نہیں کھینچا جا سکتا جیسا کہ اردو کے عام ناقدین سمجھتے ہیں۔

ردِ تشکیل یا تعمیر جس کا اردو میں بطورِ خاص ایک زمانے میں بڑا چرچا تھا اور اب بھی کچھ نہ کچھ ہے،

دراصل زبان کی ساخت سے اس کی معنوی جہتوں کی بحث ہے۔ ردتشکیل یا تعبیر، معنی کی قطعیت کا انکار کرتی ہے۔ یہاں تک کہ خود اپنی تعریف یا وضاحت کو بھی وہ ممکن نہیں، تا آنکہ الفاظ کے متعینہ معنی حتمی اور قطعی ہو ہی نہیں سکتے کہ وہ اپنے محور اور معنوی ارتکاز بدلتے رہتے ہیں۔ آج نئے تنقید نگار کو ان ادبی ہواؤں سے واقف رہنا چاہیے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان پر کہاں تک کاربند ہوا جاسکتا ہے۔ کبھی کبھی تو یہ سب باتیں، جیسے کسی فلسفے کا مبہم نکتہ بن جاتی ہیں اور ''ذور کو سنجھارہا ہے اور سرا ملتا نہیں'' والی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

اس مقالے میں ابتدا جو متن و معنی کی بات اٹھائی گئی ہے اس میں تخلیق کی حتی اہمیت کو پیش نظر رکھا گیا ہے کہ معنی متن کے اندر چھپے ہوتے ہیں جسے قاری اور سامع اپنے اپنے ادبی طریق کار سے تلاش کر سکتے ہیں۔ اس طرح ردتشکیل میں معنی و مطالب کی ایک طرح کی سیال صورت تفہیم کی دست گیری پہلو بدل بدل کر کرتی رہتی ہے جس میں متن کی قرأت بھی اپنے بیانیہ ارتکاز سے ایک نئی معنی و دنیا پیش کرتی رہتی ہے۔ متن کی قرأت اپنی آواز کے اُتار چڑھاؤ سے ایک نئی معنوی جہت اس طرح پیش کر دیتی ہے کہ محض تحریر اور متن اس کی وضاحت نہیں کر پاتے۔ ''کچھ آدمی کی بھی مجبوریاں ہیں دنیا میں / ارے وہ درد محبت سہی تو کیا مر جائیں'' جیسے شعر میں آواز کا ارتکاز شعر کے تحریری معنی سے الگ ہٹ کر ایک نئی معنوی دنیا میں لے جاتے ہیں جسے صرف طریق قرأت ہی بنا اور بتا سکتا ہے۔ یہاں خالص الفاظ اور تحریر معنوی مدد نہیں کر سکتے۔ یہ بیانیہ اور قرأت کا حیرت انگیز کرشمہ ہے جس کا کمال قصیدے اور مرثیے کی قرأت میں بطور خاص دیکھا جاسکتا ہے جس میں قاری کے جذبات اور حرکات و سکنات تک شامل ہو جاتے ہیں۔ اردو کی نئی تنقید آج بیانیہ کے اس راز کی طرف متوجہ ہے جس سے متن کی معنوی جہت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ نئی تنقید میں یہ باخبری اسے وقت کے ساتھ قدم ملا کر چلنے میں مددگار رہے گی۔

کبھی کبھی اور کہیں کہیں اسلوبیات تک ہی متن کی تفہیم یا طریق کار کو مرکوز کر دینے میں ایک طرح کی زیادتی (Over Doing) بھی پیدا ہو جاتی ہے اور پھر متن اور تفہیم متن کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ یہ بات اس وقت خاص طور پر نظر آتی ہے جب تنقید نگار تنقید میں حتمی اور حرف آخر ہونے کی کوشش میں اکثر شماریات کی حدوں میں داخل ہو جاتا ہے۔ ایک اسلوبیاتی مطالعے میں سودا، میر اور غالب کے اشعار پیش کر کے الفاظ کی تعداد گنی گئی اور نتیجہ یوں نکلا:

''سودا...... کل الفاظ ۴۷...... اوسط فی شعر...... سات اعشاریہ آٹھ تین (۷٫۸۳)

میر...... کل الفاظ ۸۷...... اوسط فی شعر...... نو اعشاریہ دو پانچ (۹٫۲۵)

غالب...... کل الفاظ...... ۹۷...... اوسط فی شعر...... نو اعشاریہ سات (۹٫۷)

کبھی کبھی یہ مطالعہ آوازیں اور حروف گننے سے بھی متعلق ہو جاتا ہے۔ پھر مصوتوں اور مصمتوں کی لسانی بحثیں بھی خاصی غیر دلچسپ اور بے رس ہو جاتی ہیں۔ یہ ایک طرح سے لسانیات کا ادبی تنقید میں حد درجہ دخل

دینے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ شاید ادب اور تخلیق کی معنوی تفہیم میں یہ طریق کار زیادہ فائدہ مند نہیں۔ کسی ناقد نے یہ بھی کہا کہ ادب میں ''مجرد فردیت'' کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ ادب میں مختلف رنگوں اور کیفیتوں کے تجربے ہو سکیں۔ ہاں یہ ایک طرح کی کوشش ضرور ہو سکتی ہے مگر یہ کوشش کسی فکری ٹکراؤ سے پیدا ہو کر وجود میں آرہی ہے یا محض تجربہ اور شخصی انا اس کا محرک ہے یا محض اپنی نارسائی کے جواز کے طور پر یا محض ''ایک چال میری بھی'' ہے۔

نئی تنقید کو بہر حال یہ بات نظر میں رکھنا چاہیے کہ 'تخلیق' کا اولین مقصد خیال کی ترسیل اور تفہیم ہی ہوتا ہے۔ ہاں اس میں درجہ بندی ضرور ہو سکتی ہے کہ یہ تفہیم کس کے لیے ہوگی کہ 'تخلیق' دانش ور، عامی، وقت گزارنے والے یا صحافیانہ ذہن، سبھی طرح کے قارئین کی دلچسپی اور تشفی کے لیے ہو سکتی ہے، جس کا پتہ 'تخلیق' اپنی ابتدا ہی سے دے دیتی ہے۔ تنقید نگار کو یہ بات اور نکتہ اپنی نظر میں رکھنا چاہیے کہ وہ کس درجے کے قاری کے لیے اپنے فنِ نقد کا صرف کر رہا ہے۔

یہ جومتیت اور قرأت کی تقریباً جدید تر تنقید میں داخل ہو رہی ہے اگرچہ یہ تفہیم اور تشریح ہی کا ایک حصہ ہے مگر راقم اسے اردو تنقید میں ایک نیا طریق کار سمجھتا ہے اور اسے خوش آمدید کہتا ہے۔

☆☆☆

کتنے پاکستان۔ایک جائزہ

نامی انصاری

ہندی کے نامور ادیب کملیشور کا ناول ''کتنے پاکستان'' (اردو ترجمہ: خورشید عالم) صرف ناول نہیں ہے بلکہ تاریخ اور تہذیب کے انسانی سروکار کا ایسا مجموعہ ہے جس کی بازگشت عہد حاضر ہی میں نہیں بلکہ آنے والے زمانوں میں بھی سنائی دے گی۔ میرا خیال ہے کہ ہندی/اردو میں ایسا ناول کبھی لکھا ہی نہیں گیا جس میں تاریخ کی ابتدا، بلکہ اس سے بھی پہلے کے زمانے سے لے کر پوکھرن اور چاغی کے نیوکلیائی تجربوں کے درمیان، قتل و غارت گری، ہوس اقتدار اور انسانیت کی اعلیٰ اقدار کے بیچ کا سنگھرش عہد بہ عہد، اتنی صفائی اور خوب صورتی سے بیان کیا گیا ہو جیسا کہ اس ناول میں درج ہے۔

دس سال کے مسلسل غور و فکر کے دوران لکھا گیا یہ ناول، ناول کے روایتی کردار سے ہٹ کر ایک ایسی تخلیق ہے جس میں کوئی ہیرو، ہیروئن، ماجرا، واقعہ یا پلاٹ نہیں ہے۔ مربوط و مسلسل قصہ بھی نہیں ہے لیکن انسانی تاریخ کے ان گنت کردار موجود ہیں جو اپنی اپنی قبروں سے اٹھ کر وقت کی عدالت میں آئے ہیں یا لائے گئے ہیں اور یہاں آکر اپنے کردار کا سچ بولنے پر مجبور ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان میں لکھی گئی تاریخ کی بے شمار کتابیں سچ نہیں بولتیں کیونکہ وہ گروہی عصبیت کا شکار ہیں، لیکن قبروں سے نکل کر آئے ہوئے اورنگ زیب، داراشکوہ، شجاع اور مراد، ہرجنگر اور ماؤنٹ بیٹن، لارڈ کرزن، میکالے اور ریڈ کلف، گاندھی اور جناح، پوکھرن اور ہیروشیما جھوٹ نہیں بول سکتے۔ خاص بات یہ ہے کہ تاریخ کے ان گنت کرداروں اور حادثات و سانحات کی ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی شمشیروں کے بیچ بھی مصنف کے افکار و تصورات کو کملیشور نے اس ناول میں جتنی سہولت اور سادہ دھانی سے پار کیا ہے وہ نہ صرف قابل تحسین ہے بلکہ ادبی دیانت داری کی ایک عمدہ مثال بھی ہے۔ اس کتاب میں ایسے سیکڑوں منظر نامے ہیں جن میں کوئی کمزور دل و دماغ کا مصنف آسانی سے گروہی ترغیبات کا شکار ہو سکتا تھا لیکن کملیشور کے پختہ ذہن اور اس سے بھی زیادہ پختہ سیکولر نظریات نے ان کے قدموں میں ذرا بھی لغزش نہیں آنے دی۔ ہندوستان کے موجودہ فرقہ وارانہ تناظر میں یہ ایک بڑی بات ہے۔

''کتنے پاکستان'' ناول کی شروعات تو ایک بہت معمولی، ایک بہت چھوٹے سے، دھند میں لپٹے رومانی واقعے سے شروع ہوتی ہے جس میں کانپور اسٹیشن کا پل پار کرتے وقت ودیا کا رومال نیچے گر جاتا ہے یا گرادیا

جاتا ہے۔ پھر اس سے جڑا ایک اور چھوٹا سا واقعہ رونما ہوتا ہے جس میں نہ معلوم کہاں سے چلا ہوا ایک لفافہ مصنف کو ملتا ہے جس کے اندر اردو میں لکھا ہوا خط غالبؔ کے تین شعروں کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے آگے جو مہابھارت شروع ہوتی ہے اس کے مرکزی کردار صرف دو ہیں یعنی وقت یا ادیب عالی اور اس کا اردلی محمود، جو بے شمار تاریخی ہستیوں کو ان کی قبروں سے نکال کر وقت کی عدالت میں حاضر کر دیتا ہے۔ یہ سب کردار چونکہ مر چکے ہیں اس لیے ان کے جھوٹ بولنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔ ایک حساب سے یہ میدانِ حشر ہے، جس میں ہر کردار اپنے اعمال کی جوابدہی کے لیے مجبور ہے۔

کارگل دراس میں پاکستانی فوجوں کی دراندازی پر ابھی ادیب عالی غور ہی کر رہا تھا کہ اچانک:

''طوفانِ باد، کالی آندھیاں، جنگل میں ہر طرف مچتا کہرام، ادھر اُدھر پریشان سے بھاگتے جنگلی جانور، اتنا زیادہ شور وغل اور چیخ و پکار، ادیب نے دونوں کانوں پر ہتھیلیاں رکھ کر اپنے ذرائع سماعی بند کر لیے اور چیخا، ''محمود!''

کہاں تھے تم؟''

''حضور! میں پچھلی صدیوں میں چلا گیا تھا۔''

''کیوں؟''

''حضور! میں اپنے اسلاف سے ملنے گیا تھا۔''

''اسلاف سے!'' ادیب نے حیرانی سے پوچھا۔

''حضورِ اعلیٰ! آپ کو اتنا تعجب کیوں ہو رہا ہے۔ ہمارا مذہب سب سے نیا ہے۔ ہم نے اسے سب سے بہتر پایا، تبھی تو ہم اپنے پرانے مذہب کو چھوڑ کر اسلام میں آئے ہیں۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہمارے اسلاف نہیں!''

''یہ بحث چھوڑو۔ سب سے پہلے یہ معلوم کرو کہ کالی آندھیاں کیوں چل رہی ہیں؟''

''شاید اس کی وجہ شمبوک کا قتل ہوگا۔ جب جب اس زمین پر دھرم کا نقصان ہوتا ہے، تب تب یہ کالی آندھیاں چلتی ہیں۔'' (ص: ۳۵، ۳۶)

یہ کالی آندھیاں، طوفان برق و باد اور ہاہاکار اس ناول میں شروع سے آخر تک جاری رہتا ہے، دیوتاؤں کے زمانے سے لے کر پوکھرن اور چاغی کے ایٹمی دھماکوں تک، کیونکہ جب جب انسانیت کا خون ہوتا ہے، تو یہ کالی آندھیاں ہی وقت اور تاریخ کا بیرومیٹر بن جاتی ہیں۔

مہابھارت کی جنگ اور لاتعداد انسانوں کا قتل، سمیری تہذیب کے مہان سمراٹ جل جامیش کا اعلان

''میں درد سے لڑوں گا، عذاب سہوں گا، کچھ بھی ہو، موت کو شکست دوں گا۔ میں موت سے نجات کی دوا کھوج کر لاؤں گا۔''

یہ جل جامیش، گوتم بدھ بھی ہو سکتا ہے، سنت کبیر بھی ہو سکتا ہے اور گاندھی بھی ہو سکتا ہے۔ انسانیت کا تحفظ جس کی اصل منزل ہے۔

''شہنشاہ جل جامیش کی یہ بردبار اور سنجیدہ آواز کائنات میں گونجنے لگی۔ بھی لونیا، میسوپوٹامیہ، سمیری اور وادیٔ سندھ کی تہذیب کے دیوتا کانپنے لگے۔'' (ص: ۴۱)

جل جامیش کی کاٹ کرنے کے لیے عظیم طاقتور دیوتا انو نے آسمان کے بیٹے انکیدو کو انسانی پیدائش دے کر زمین پر بھیجا۔

''انکیدو جنگلی جانوروں کی طرح بے رحم تھا، وہ انھیں کی طرح کچا گوشت کھاتا تھا اور ضرورت پڑنے پر گھاس بھی کھالیتا تھا۔''

جل جامیش نے اس کو قابو میں لانے کی ترکیب پر عمل کرنے کا حکم دیا۔

''سپت سندھو کی آریہ تہذیب بھی اپنے دیوتاؤں کو بس میں رکھنے کے لیے اپسراؤں کا استعمال کرتی ہے۔ تم فوراً بے حد خوب صورت دیوداسی رُونا کو لے کر جنگل میں جاؤ اور اس مبعوث جنگلی آدمی کو اس کا غلام بنادو۔''

''یہی ہے وہ! اب تم اپنے استنوں کے استر کو ہٹادو۔ شرماؤ نہیں، دیر مت کرو۔ تمھیں برہنہ دیکھ کر وہ تمھاری طرف کھنچا چلا آئے گا اور تب تم اسے اپنے قابو میں کر لینا۔''

حیران کن بات یہ تھی کہ لطفِ مباشرت کے بعد بھی انکیدو اس دیوداسی سے الگ نہیں ہوا۔ وہ اسے اپنی بھری بھری بانہوں میں لے کر دیر تک دیکھتا رہا۔ نہ معلوم وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں کیا تلاش کرتے رہے۔ مجھے تو لگتا ہے یہ محبت کا جذبہ تھا جو انسان نے عورت میں تلاش کر لیا۔''

(ص: ۴۵)

اور پھر مصنف کا یہ اعلان بزبانِ پیغامبر:

''انسان نے جن عظیم قوتوں کو ایجاد کر لیا ہے، وہ آپ کے پاس نہیں ہے۔ اس نے ایجاد کر لیا ہے زندگی، غم، محنت، محبت، دوستی اور امن جیسے زندگی کے عظیم عناصر کو..... اس لیے اب اس کی یہ دوائی کی خواہش غیر مناسب نہیں ہے۔'' (ص: ۴۹)

کملیشور نے اس عظیم صداقت کو پیش کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں کی۔

"فیرالڈوں کی تاریخ سے زیادہ بڑی اور پرانی ہے انسانی محبت کی تاریخ۔ دیوداسی رُونا اور جنگلی مرد انکیدو کے وہ تنہا لمحے جب واسنا کے بعد، انھوں نے اپنے وجود کی تلاش کی تھی اور اسے حاصل کیا تھا۔ محبت کی یہی قدیم کہانی تب سے اب تک سانس لے رہی ہے۔" (ص: ۵۴)

اس ناول کا کینواس بہت وسیع، بہت رنگارنگ اور تہذیب و تاریخ کے غالباً سب سے بڑے منظر نامے کا احاطہ کرتا ہے۔ بقول پروفیسر گوپی چند نارنگ:

"اس (ناول) میں ہمارے عہد کے المیے بھی درج ہیں اور ماضی کے خوں چکاں واقعات بھی، جن کی وجہ سے ہمارا حال اور مستقبل دونوں شکست خوردہ اور لہولہان لگتے ہیں اور وہ حادثات اور واقعات بھی جو ماقبل کے زمانے میں وقوع پذیر ہوتے رہے ہیں۔ "کتنے پاکستان" تینوں زمانوں کی ایک مربوط اور منظم داستان ہے۔ وقت کی دستکوں کو سننے اور اپنی ہتھیلیوں پر اپنے عہد کے ضرب کو محسوس کرنے کی یہ ایک سچی تخلیقی کوشش ہے۔" (ص: ۹)

لاتعداد تاریخی اور ادبی کرداروں کے تصوراتی تفاعل پر مبنی اس کتاب میں شعور کی رو کی تکنیک بھی کامیابی سے آزمائی گئی ہے۔ اورنگ زیب اور دارا شکوہ کی سیاسی اور مذہبی کشمکش کی جو تفصیل ہے، وہ اگرچہ تاریخ کا حصہ بن چکی ہے تاہم مصنف نے وقت کی عدالت میں جہاں اورنگ زیب اور دارا کو لا کر کھڑا کر دیا ہے، وہیں اولذکر کے دفاع میں شبلی نعمانی اور موخرالذکر کے دفاع میں قاضی عبدالستار بھی دوش بدوش کھڑے نظر آتے ہیں۔ وقت کے وکیل کی منطقی جرح جب شبلی نعمانی کے نظریات کی موثر کاٹ کر دیتی ہے تو فراق اور اختر الایمان بھی اپنا اپنا بیان درج کراتے ہیں اور یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ تاریخ کے وال کلاک کی سوئی شاید غلط سمت میں چلی گئی تھی۔ پھر تقسیم ملک کے سانحات و واقعات، پاکستان، بوٹا سنگھ اور زینب، کیبنٹ مشن پلان، لارڈ ماؤنٹ بیٹن، جناح، راہی معصوم رضا، پروفیسر مشیر الحق (وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی)، شاہی امام، اشوک سنگھل جو ہندو نہیں جین ہیں اور بھاگلپور کا قتل عام۔

"ترشول دھارک! جب تم مرے تھے اس وقت تم کیا تھے؟"

"تب میں ہندو تھا۔"

"ہندو کیا انسان نہیں ہوتے؟"

"ہوتے ہیں، لیکن جب نفرت کا زہر میری رگوں میں دوڑتا ہے تب میں انسان کا چولا بدل کر ہندو بن جاتا ہوں۔" (ص: ۸۴)

اس کے بعد بابری مسجد۔

"میں دنت دھاون کنڈ کا پہلا مہنت چھتر داس ہوں۔ مجھے پتہ چلا کہ بابر آپ کی عدالت میں حاضر ہوئے ہیں۔ اس لیے میں سمادھی سے نکل کر اپنے بادشاہ کا درشن کرنے آیا ہوں۔"

"یہ دنت دھاون کنڈ کیا بلا ہے اور کون سی جگہ ہے؟"

"یہ بلا نہیں۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں رام چندر جی داتون کیا کرتے تھے۔ آج بھی ایودھیا میں یہ کنڈ موجود ہے۔ بادشاہ بابر نے ہمیں معافی نامہ کا تانبے کا تمغہ دیا تھا جسے انگریزوں نے بعد میں سند میں بدل دیا۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ بابر ایودھیا آیا تھا؟"

"ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ تھے۔ تب بادشاہ نہیں اس کی مہربانیاں آیا کرتی تھیں۔"

"تم یہ بتاؤ کہ بابری مسجد بابر نے بنوائی تھی یا نہیں؟ کیونکہ لگتا ہے کہ تم بابر کے [illegible]۔"

"جی ہاں! ہوں! لیکن مسجد تو خالی جگہ پر ابراہیم لودھی نے بنوائی تھی۔ ہو سکتا ہے اس [illegible] رد و بدل میر باقی تاشقندی نے کی ہو۔" مہنت چھتر داس بولا۔ "میر باقی کے گاؤں [illegible] میں اس کی اولاد آج بھی موجود ہے۔ آپ اس سے معلوم کر سکتے ہیں۔" (ص: ۹۱)

بابری مسجد جیسے حساس اور نازک مسئلے کو خطرہ مول لے کر بھی کملیشور نے نہ صرف چھیڑا ہے بلکہ تاریخ کی پرتوں کو الٹ پلٹ کر سچ جاننے کی ایماندارانہ کوشش کی ہے۔ "بابر نامہ" سے نکالے گئے پانچ چھ اوراق کی روداد، مسجد میں لگا ہوا وہ کتبہ جسے سروے آف انڈیا کے اس وقت کے ڈائرکٹر جنرل اے۔ فیوہرر نے خود پڑھا تھا۔ اسکے مطابق:

"ہجری ۹۳۰ یعنی قریب ستمبر ۱۵۲۳ء میں ابراہیم لودھی نے اس مسجد کی بنیاد رکھوائی تھی اور جو ۱۰ ستمبر ۱۵۲۴ء کو بن کر تیار ہوئی تھی جسے اب بابری مسجد کہا جاتا ہے......اس کتبے کو وقت نے نہیں بلکہ ان لوگوں نے برباد کیا ہے جو اس بابری مسجد اور رام جنم بھومی مندر کے تنازعے کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔" (ص: ۸۶)

"کتنے پاکستان" میں صرف تاریخ ہی نہیں۔ تاریخ کا فلسفہ بھی ہے عمل اور اس کا ردِ عمل بھی ہے لیکن بڑی بات یہ ہے کہ کہیں ٹھہراؤ نہیں ہے، انجماد نہیں ہے، بوریت نہیں ہے بلکہ تاریخ اور تہذیب کی یہ دلچسپ داستان آگے بھی بڑھتی ہے اور پیچھے بھی لوٹتی ہے۔ اس کا سفر گزری ہوئی صدیوں میں بھی ہے اور عصر حاضر میں بھی ہے۔ اگر ایک طرف مصر کے پیرامڈ اور بیبی لونیا کی قدیم تاریخ ہے تو دوسری طرف سجاد ظہیر (بنے بھائی) ہیں جو یہ بھول گئے ہیں کہ "پاکستان محنت کشوں کا نہیں، بڑے سرمایہ داروں کا ملک ہے" اور تب مصنف خود، امرتا پریتم، کرتہ رشمہ

دنگل، موہن راکیش، بھیشم ساہنی، دیویندر ستیارتھی، یہاں تک کہ یش پال اور اگیئے تک خاموش رہے:

''لیکن اب تو بھی ملکوں میں نفرت کا ایک پاکستان بنانے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ کیا ہوا بوسنیا میں، کیا ہوا سائپرس میں، کیا ہوا تب کے سوویت یونین اور آج کے رشین فیڈریشن میں۔ کیا ہو رہا ہے آج کے افغانستان میں، ہر شخص نفرت کے سہارے، اپنے ہی لوگوں کے خلاف ایک دوسرا پاکستان ایجاد کرنا چاہتا ہے۔'' (ص:۱۰۹)۔

یہی اس ضخیم ناول کے نام ''کتنے پاکستان'' کی وجہ تسمیہ بھی ہے۔ جن لوگوں نے پوری کتاب نہیں پڑھی اور صرف اس کا نام ہی سنا ہے ان کو شاید یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ ہندوستان سے کٹ کر دو پاکستان تو بن چکے اب اور کتنے پاکستان بنیں گے؟ ہندو شدت پسند سیاسی پارٹیاں اکثر اس اندیشے میں مبتلا رہتی ہیں کہ اقلیتوں اور خاص کر مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور سماجی ترقی کے لیے کوئی بھی اسکیم چلائی گئی تو گویا اس نے ایک اور تقسیم کی بنیاد ڈال دی۔ اس ناول میں اسی ٹیڑھی سوچ کا مستحکم جواب ہے کہ فلاح و بہبود کے کاموں سے ملک تقسیم نہیں ہوتا بلکہ دنیا کے کئی ملکوں میں جو تقسیم در تقسیم کا عمل جاری ہے، اس کی بنیاد میں صرف اور صرف نفرت کا بارود ہے۔

کملیشور نے حالات اور حادثات کا جو تجزیہ پیش کیا ہے وہ منطقی بھی ہے اور قدرے فلسفیانہ بھی لیکن مصنف نے اپنی شہرت اور مقبولیت کو داؤں پر لگا کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرنے کی جو ایماندارانہ کوشش کی ہے اس میں کسی رو رعایت یا جانب داری کا شائبہ بھی نہیں ملتا۔

یہ ناول پہلے پہل ہندی میں چھپا تھا اور اس کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ ہندی میں اس کے اب تک گیارہ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندی زبان کے قاری بھی تاریخ کے سچ کے متلاشی ہیں اور جب ان کو اس قسم کا مسالہ ملتا ہے، جس کو باریکی سے چھان پھٹک کر کے، اصلیت کو اجاگر کیا گیا ہو تو وہ اپنا مثبت ردِ عمل ظاہر کرتے ہیں۔ مجھے ہندی کی ادبی دنیا سے زیادہ واقفیت نہیں لیکن اندازہ ہے کہ ہندی کا ادبی پریس فرقہ واریت کے خلاف جتنا سنگھرش کرتا ہے، اتنا ہمارا اردو ادب کا پریس نہیں کرتا اور اس کو میں ایک المیہ ہی تصور کرتا ہوں۔

''کتنے پاکستان'' میں اورنگ زیب اور دارا کی کشمکش کا منظر نامہ کچھ زیادہ ہی پھیل گیا ہے لیکن اورنگ زیب کے تاریخی کردار کے اردگرد جو دھند چھائی ہے، اس کو چیر کر اورنگ زیب کے اصل محرکات کو پرت در پرت اکھاڑنے کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ تاریخ کا سچ اگلنے کے لیے کتنی ہی دستاویزی کتابیں اپنے اپنے پر پھڑپھڑا رہی ہیں۔

''بادشاہ نامہ، عمل صالح، عالمگیر نامہ، اور مآثر عالمگیری سامنے آنے لگے۔ منوچی اور برنیئر کی

تفصیلات کے صفحات پھڑ پھڑانے لگے۔" اور پھر یہ بھی کہ "ہر کتاب کوئی نہ کوئی راہ دکھاتی ہے لیکن ہر دور اپنی کتاب لکھنا یا لکھوانا چاہتا ہے، اس لیے ہر سچی کتاب جھوٹی بن جاتی ہے اور ہر جھوٹ سچ بن جاتا ہے۔" (ص: ۲۰۸)

بشمبھر ناتھ پانڈے بتاتے ہیں کہ اورنگ زیب نے کاشی وشوا ناتھ مندر کیوں توڑا تھا۔ پھر وہ پٹابھی سیتارمیہ کا حوالہ دے کر خود کو غیر جانبدار کر لیتے ہیں۔

"آج کے ذہین منطقی ہندوستانی کے لیے آپ کی بھائی چارگی اور ایکتا کی یہ جو بے حد آسان سادگی پسندی ہے اسی نے ہندو کٹر پنتھیوں اور ہندوتو وادیوں کو غلط تاریخ لکھنے کی چھوٹ دے دی ہے...... ویسے اورنگ زیب ایک بھیانک ذہنی پیچیدگی اور خلل بھرے دماغی جنون کا شکار تھا۔" (ص: ۱۸۴)

اس بحث میں شبلی نعمانی بھی شامل ہیں اور مورخ سری رام شرما بھی۔ پروفیسر محمد حبیب بھی ہیں، بھوانی سین گپتا اور ڈاکٹر کالکا رنجن قانون گو بھی اور سب اپنا اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے سچائی کو پرت در پرت اکھاڑنے کے لیے بیتاب ہیں لیکن بقول پروفیسر حبیب یہ نکتہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ:

"اسلام فقط ایک مذہب کا ظہور نہیں تھا، اسلام ایک ریاستی اقتدار کی شکل میں بھی ابھرا تھا اور ریاستی اقتدار کے قانون قاعدے الگ ہوتے ہیں، مذہب کے الگ۔" (ص: ۱۹۰)

اور جب سیف الدین سوز اسلام کی جغرافیائی، ثقافتی اور مذہبی صورت حال کی تصویر پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"کشمیر کا اسلام کشمیر میں، ایران کا ایران میں، مصر کا مصر میں اور ترکی کا اسلام ترکی میں آزاد ہے، اور اسلام کی عظمت یہی ہے کہ اس نے زمین کے ہر حصے کی تہذیب کو اپنایا۔ اس لیے کشمیر کا مسلمان کشمیری ہے، وہ ایرانی یا تورانی مسلمان نہیں ہے۔ وہ پاکستان کے پنجابی مسلمان کے ساتھ ایک گھنٹہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ وہ اپنی ثقافتی روایت میں جینے والے کشمیر کے ہندو پنڈتوں کے ساتھ صدیوں زندہ رہا ہے اور رہے گا۔ للیشوری اور حبہ خاتون کا بٹوارا کشمیر میں نہیں ہو سکتا۔" (ص: ۲۰۳)

حقیقت یہ ہے کہ کملیشور از خود کوئی فیصلہ نہیں کرتے ہیں۔ وہ تاریخی حقائق اور مسائل کو اس کے پورے سیاق و سباق کے ساتھ پیش کر دیتے ہیں جس سے قاری خود اپنے نتائج اخذ کر سکتا ہے۔ وقت کا فیصلہ بہر حال وقت کا فیصلہ ہے جس کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ لیکن وقت کا فیصلہ بھی از خود صادر نہیں ہو جاتا۔ اس کے لیے تاریخ کے پنوں کو پورے حزم و احتیاط کے ساتھ پلٹنا پڑتا ہے اور مصنف کی یہ پوری کوشش ہوتی ہے کہ وہ اس عمل کا باریک بینی سے

مشاہدہ کرے اور اس میں کوئی ملاوٹ اپنی طرف سے یا کسی اور کی طرف سے نہ ہونے دے۔ کملیشور نے ایک بے حد اہم اور ذمے دار ادیب کی حیثیت سے ''کتنے پاکستان'' میں اپنا یہ فرض بخوبی نبھایا ہے اور ان عوامل کی نشاندہی میں خطرہ مول لیتے ہوئے بھی کسی مروت یا جانب داری سے کام نہیں لیا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ہندی میں ان کا یہ ناول بہت مقبول ہوا جبکہ اردو میں یہ بے حد اہم ناول اردو والوں کی روایتی سستی یا پھر جذباتی عصبیت کا شکار ہو کر رہ گیا۔

کملیشور نے مسلم لیگی انتہا پسندی اور محمد علی جناح کی قیادت کے پس منظر کا بھی باریکی سے جائزہ لیا ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ:

''جناح صاحب نے تاریخ نہیں بنائی تھی۔ تاریخ نے جناح صاحب کو بنایا تھا۔'' (ص:۱۲۱)

مصنف نے اس حقیقت کو بھی واضح کیا ہے کہ:

''مذہب کی بنیاد پر ثقافتیں بنتی ہیں لیکن کافی عرصے بعد وہ دھرم سے نجات پا کر انسانی ثقافتوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔''

''اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ بعد میں اقبال اور سرسید نے جو رنگ اختیار کیا تھا وہ ٹھیک تھا۔''

''ہرگز نہیں۔ لیکن یہ تبدیلی اس وقت آئی تھی جب لوکمانیہ تلک نے تحریک آزادی کو گیتا سے جوڑ کر اسے آزادی کی ہندو تحریک بنا دیا تھا۔''

''لیکن گاندھی جی نے آ کر اس غلطی کو سدھارا بھی تو تھا۔''

''تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ دل تقسیم ہو چکے تھے۔ لوکمانیہ تلک نے بالآخر سارے ہندو وادیوں کو جنم دیا۔ ساورکر جیسے انقلابی ہندو ہو گئے۔ ان کی نسل نے ناتھورام گوڈسے پیدا کیا۔ آخر اسی نے گاندھی جی کو قتل کیا۔ تو گاندھی، نہرو، پٹیل اور مولانا آزاد کے رہتے ہوئے بھی مسلمانوں کے لیے امید بچی ہی کہاں تھی؟'' (ص:۱۴۰)

دراصل امید کی جڑیں کاٹنے کا کام تو اسی وقت شروع ہو گیا تھا جب اکبر کی پالیسی کے خلاف، سرہند کے علماء نے شاہی قاضی عبدالعزیز کی موجودگی میں شہنشاہ اورنگ زیب کو یہ مشورہ دیا تھا کہ:

''اکبر اور جہانگیر کے زمانے کی جو میل جول، ہندو مسلم مساوات کی روایتیں چلی آ رہی ہیں ان کو ختم کیا جائے۔ ہندو کو رعایا مانا جائے اور ریاست کو نظام مصطفی کے تحت چلایا جائے۔'' (ص:۱۸۴)

مذہب، سیاست، تاریخ اور تہذیب کے پس منظر میں سلمان حسین آئی اے ایس کی نوجوان بیوہ سلمیٰ کا کردار ابھرتا ہے۔ رومانس، تحیر اور لذت کوشی سے بھرپور ادیب عالی کے ذاتی اور جسمانی تناؤ سے نجات کی آخری

پناہ گاہ مگر فرار پھر فرار ہے۔ اردلی محمود اس کو ڈھونڈ کر پھر وقت اور تاریخ کی اس دنیا میں لے آتا ہے جہاں سے ادیب نے راہِ فرار اختیار کی تھی۔

اس ناول میں ان گنت کردار اپنی اپنی بولی بولتے ہیں یا برسبیل تذکرہ آ جاتے ہیں اور آخر میں کبیر اور نروان کا درخت۔

"میرے اس جھولے میں اسی کا پودا ہے۔ معرفت کے درخت کی جڑیں، نیل کنٹھ کی طرح سارا وِش پی لیتی ہیں۔ پہلا درخت میں پوکھرن میں لگاؤں گا۔ پھر سرحد پار کر کے دوسرا درخت چاغی کی پہاڑیوں میں لگاؤں گا۔" (ص: ۳۸۰)

ایک ایماندار دانشور اور ادیب اس سے زیادہ کہہ ہی کیا سکتا ہے۔

خورشید عالم کا اردو ترجمہ نہایت صاف اور رواں ہے۔ پڑھنے میں اور یجنل کتاب کا لطف آتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ کتاب اصلاً اردو ہی میں لکھی گئی ہو۔

☆☆☆

"میری تنقید کی زبان واضح اور دو ٹوک ہے، میں تنقید میں استعاراتی، زیوراتی زبان کا قائل نہیں لیکن اسلوب میں دلکشی اور طرح داری ہو تو تنقیدی مواد کی قدر و قیمت دو چند ہو جاتی ہے اور اس کی مطالعاتی اپیل بڑھ جاتی ہے۔ دوسری طرف ژولیدہ بیانی، الجھاؤ، سپاٹ، بے رس زبان، غیر ضروری فلسفیانہ موشگافی تنقید کے دائرے کو محدود کر دیتی ہے اور پڑھنے والوں میں ایک قسم کی لاتعلقی کو جنم دینے کی ذمہ دار بن جاتی ہے۔"

نامی انصاری

مرزا غالب کی جمالیات

''مثنوی چراغِ دیر''
تحیّر کی جمالیات کی ایک مثال

پروفیسر شکیل الرحمٰن

ہندوستانی جمالیات میں تحیّر کی جمالیات کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ اسے ادبھت رس کہا گیا ہے، اسے چمتکار سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ابھینو گپت، بھرت منی، ممٹ سب کے یہاں اس کا ذکر ملتا ہے۔ نٹ شاستر میں بھرت نے تحیر کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ اکیسویں باب میں کہا گیا ہے کہ کسی بھی تجربے کی عظمت کا انحصار تحیر پر ہوتا ہے، تجربہ اس طرح پیش ہو کہ تحیر پیدا ہو۔ ابھینو گپت کے ابھینو بھارتی کے مطابق حالات اور ماحول تحیر پیدا کرنے میں بڑا کردار ادا کرتے ہیں۔ ہندوستان کے اس معروف معلّمِ جمالیات نے کئی ایسے حالات کا ذکر کیا ہے کہ جن کے سبب تحیر پیدا ہو سکتا ہے۔ اچاریہ نارائن بھی ایک معروف معلّم جمالیات گزرے ہیں۔ انھوں نے جمالیات کے موضوع پر جو کام کیا تھا موجود نہیں ہے۔ اس کا ذکر ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آچاریہ نارائن ہی نے تحیر اور تحیر کی جمالیات کو اہم جانا تھا، ادبھت سے زیادہ تحیر کے ''چمتکار'' کی اصطلاح استعمال کرتے تھے، ان کے پوتے وشواناتھ کی دلچسپی بھی جمالیات سے بہت گہری تھی۔ ان کی تحریروں میں آچاریہ نارائن کے خیالات ملتے ہیں۔ یہ علم ہوتا ہے کہ آچاریہ نارائن نے ادبھت رس اور تحیر کے اپنے تصور کی آمیزش کے بعد 'چمتکار' کی اصطلاح سامنے رکھی تھی۔ فنون اور خصوصاً ڈراما اور شاعری میں 'چمتکار' کی قدر و قیمت کا احساس دلایا تھا۔ 'رس گندھار' کے مصنف جگن ناتھ پنڈت نے تحیر اور انبساط پر اچھی گفتگو کی تھی، انھوں نے ادبھت اور 'چمتکار' کی جگہ 'لوکوٹ تارا' (lokottara) کی اصطلاح استعمال کی تھی۔ اس کا مفہوم ہے ایسی تیز چمک کہ جس سے تحیر پیدا ہو۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستانی جمالیات میں تحیر اور تحیر کی جمالیات کی بڑی اہمیت رہی ہے۔ فنون لطیفہ اور خصوصاً شاعری اور ڈراما کے تعلق سے اس رس اور کیفیت کی قدر و قیمت کا ہمیشہ احساس رہا ہے۔ فوق الفطری واقعات سے ان تجربوں تک کہ جو عام زندگی کے تجربوں سے علاحدہ ہوں جن کے اچانک پن اور جن کی تازگی اور اجنبیت سے تحیر پیدا ہو، ہندوستانی جمالیات میں موضوع بنے رہے ہیں۔ سنسکرت ادب فوق الفطری واقعات و کردار سے بھرا پڑا ہے، انہونی باتیں طرح طرح سے تحیر پیدا کر کے چونکا دیتی ہیں۔ بھاسا کالیداس اور بھوابھوتی کے اہم رزمیوں میں

فوق الفطری حالات و کردار موجود ہیں، ان سے تحیر پیدا کیا گیا ہے۔ کالیداس کی عظمت کی ایک بڑی پہچان یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ وہ پرانی ایپک سے فوق الفطری کیفیتوں کو حاصل کرتے ہیں اور قاری کو متحیر کرتے رہتے ہیں۔ 'شکنتلا' کے چوتھے، پانچویں، چھٹے اور ساتویں ایکٹ میں پرانی ایپک سے تحیر کرنے والے واقعات ملتے ہیں۔ اروشی کا کردار بھی حیرت انگیز ہے۔ اس طرح نارائن جب مہابلی کے آشیرواد سے بونے سے دیویکل پیکر بن جاتے ہیں تو ادبھت رس کی پہچان ہوتی ہے۔

غالب تحیر کی جمالیات کے ایک بڑے شاعر ہیں۔ وہ ادبھت تجربوں کے لیے کسی رزمیہ یا ایپک کے پاس نہیں جاتے بلکہ اپنی سائیکی کی مدد سے چمتکار کرتے رہتے ہیں۔ اردو اور فارسی کی غزلوں میں تحیر پیدا کرتے رہنے کا ایسا سلسلہ ہے کہ چمتکار اور اس کے جلوؤں کی گنتی نہیں کی جا سکتی۔ حیرت اور تحیر اور طلسمی کیفیتوں نے کلام غالب کو بڑی عظمت بخش دی ہے۔ کثرت انشائے مضمون تحیر سے'' جہاں اردو اور فارسی بوطیقا کو ایک انوکھا طرز احساس ملا ہے، وہاں گنجینۂ معنی کے طلسم کی ایک دنیا بھی حاصل ہوئی ہے۔ محبوب کے عکس سے آئینے میں آگ لگ جاتی ہے، آبلوں میں آنکھیں پیدا ہو جاتی ہیں، محبوب کی خوب صورت کلائیوں کو دیکھ کر شاخ گل جلنے لگتی ہے، حلقۂ زنجیر میں نگاہیں پیدا ہو جاتی ہیں، شیریں کی سیاہ زلف کو سانپ کہہ دینا کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن جادوگری یہ ہے کہ اس کا مادر ادفن ہو جاتا ہے تو پورا پہاڑ سبزے کی شدت سے سبز ہو جاتا ہے اور زمرد کا مزار بن جاتا ہے۔ لہو کے قطرے دامن پر گرتے ہیں تو پھول بن جاتے ہیں، چاند آفتاب کے ہاتھ میں کاسۂ گدائی نظر آتا ہے۔ مہندی سے رنگے ہاتھ دیکھ کر گل، پروانے کی طرح رقص کرنے لگتے ہیں۔ محبوب کے ذکر سے اس کے خوب صورت لب شراب کے پیالے پر ابھر آتے ہیں۔

تحیر کے حسن و جمال کی یہ خوب صورت مثالیں ہیں۔

''مثنوی چراغ دیر'' تحیر کی جمالیات کا ایک خوب صورت نمونہ ہے۔ یہ ایک بڑے حسن پسند فن کار کی تخلیق ہے جو ادب کی دنیا میں گریٹ ونڈر (great wonder) کا ایک بڑا فن کار ہے۔ ''مثنوی چراغ دیر'' پر اپنی تازگی اور اجنبیت کے ساتھ تخلیقی فن کا ایک شاہکار بن گئی ہے۔ تازگی اور اجنبیت ہی بڑے تخلیقی آرٹ کا جوہر ہے۔ تحیر کی جمالیات کی یہ دونوں بنیادی خصوصیتیں اس مثنوی میں توجہ طلب بن جاتی ہیں۔ 'رسوں' اور خصوصاً 'شرنگار رس' کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے اس بات کا احساس بڑی شدت سے ہوا کہ تحیر رسوں کا نقطۂ عروج ہے، تحیر کی جمالیات کے بغیر کسی بھی اعلیٰ فن کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ تخلیقی آرٹ میں تحیر کی جمالیات قاری کے ذہن میں کشادگی پیدا کر کے اسے ایک افضل سطح پر لے جاتی ہے۔ یہ وہ سطح ہے جو زندگی کے جلال و جمال کو صرف حد درجہ متوی ہی نہیں بناتی بلکہ زندگی کے حسن کو دیکھنے کے لیے ایک وژن بھی عطا کر دیتی ہے۔ تحیر کی جمالیات کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ حسن کا سحر قاری کو فن کار کے تخیلی اور وجدانی تجربوں کی گہرائیوں میں اس قدر اُتار دیتا ہے

کہ خود قاری کی فکر ونظر میں تبدیلی پیدا ہونے لگتی ہے، اس حد تک کہ اسے خود اپنی شخصیت تبدیل ہوتی محسوس ہونے لگتی ہے، وہ فن کار کے تحیر آمیز تجربوں میں جذب ہو جاتا ہے۔ "مثنوی چراغ دیر" تحیر کی جمالیات کا ایسا نمونہ ہے کہ جس کا حسن قاری کی فکر ونظر کو اس طرح گرفت میں لے لیتا ہے کہ زندگی کے نقش ہائے رنگ رنگ کی تصویریں دیگر نظر آنے لگتی ہیں۔

غالب کی مثنویوں کا ذکر آیا کہ مثنوی "ابر گہر بار" کی مناجات کے جوش طوفاں اور اس مثنوی کے خوب صورت تجربوں سے ذہن وابستہ ہو جاتا ہے۔ مثنوی "ابر گہر بار" یقیناً ایک اچھی مثنوی ہے اور سرمہ بینش" "درد وداغ" "باد مخالف" "رنگ وبو" وغیرہ کی تخلیقی سطح سے بلند ہے لیکن "مثنوی چراغ دیر" کو غالب کی جمالیات میں جو اہمیت حاصل ہے وہ کسی دوسری مثنوی کو نصیب نہیں ہے، اس لیے کہ اس مثنوی کے دوسرے حصے میں کاشی یا بنارس کی تصویر کشی میں ان کا جمالیاتی شعور ایک مرکز پر سمٹ آیا ہے بلکہ اس لیے کہ یہ مکمل تخلیقی کارنامہ ہے، تحیر کی جمالیات کا ایک خوبصورت نمونہ۔

غالب اپریل ۱۸۲۷ء میں دہلی سے کلکتے کے لیے روانہ ہوئے اور تین چار ماہ بنارس میں رہے، سرائے تورنگ میں قیام کیا، اس وقت ان کی عمر انتیس برس تین ماہ تھی، "مثنوی چراغ دیر" کا خالق انتیس تیس برس کا فن کار ہے، حد درجہ حساس اور باطنی طور پر بیدار! ہند مغل جمالیات کی آمیزش اور آویزش سے قریب تر اس مثنوی کی تکنیک اور اس کے تخلیقی سانچے میں اس جمالیات کا وہ جلیل وجمیل پہلو بھی موجود ہے جس میں خوب صورت اور دلکش، حسین اور دل فریب عناصر کی کثرت تو ہے لیکن جمالیاتی وحدت بھی ہے۔ مختلف اور متضاد بکھرے ہوئے جمالیاتی پیکر اور عناصر اپنے باطنی رشتے کا احساس لاتے ہیں اور اس طرح جلیل اور جمیل عناصر کی وحدت پیدا ہو جاتی ہے۔

مغل جمالیات اور خصوصاً مغل مصوری میں خیال کے تنوع سے مختلف عناصر کی صورتیں جنم لیتی ہیں لیکن ذہن ان کی ترتیب اور وحدت کو پا لیتا ہے۔ اس نظم کی وحدت بہ ظاہر نظر نہیں آتی لیکن گہرے مطالعے سے محسوس ہو جاتی ہے۔ ذہن تین مختلف صورتوں کی وحدت اور اس وحدت کے حسن کو پالتا ہے بہ ظاہر تین بے ربط تصویروں میں جو باطنی رشتہ ہے وہی جمالیاتی وحدت کا احساس دیتا ہے۔ غالب اس مثنوی میں ایک بڑے تشبیہ کار، کنایہ ساز اور علامت نگار نظر آتے ہیں۔ مغل جمالیات میں تشبیہ، کنایہ اور علامت کی جو اہمیت ہے اس کا انہیں علم ہے۔ یہی جمالیاتی تجربوں کے اظہار کے عمدہ ذرائع ہیں، ان تینوں کی تخلیقی صورت مجرد ہو جاتی ہے تو جمالیاتی انبساط حاصل ہوتا ہے۔ اس مثنوی کی تکنیک کا حسن بھی یہی ہے۔

غالب کی دوسری مثنویوں کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ چراغ دیر کا تخلیقی سانچہ مختلف ہے۔ زمانے کے دستور کے مطابق یہ مثنوی مناجات اور حمد یا شکر خدا سے شروع نہیں ہوتی، تجربوں کے مزاج کے مطابق غالب

نے ابتدائیہ کی صورت ہی بدل دی ہے۔ وہ چاہتے تو حمد یا مناجات میں ایک نیا انداز پیدا کر سکتے تھے۔ جس طرح انھوں نے ''مثنوی ابر گہر بار'' میں کیا ہے۔ ''مثنوی ابر گہر بار'' کے گیارہ سو اشعار میں حمد، مناجات، نعت (جس میں معراج کا خصوصی ذکر بھی شامل ہے) منقبت وغیرہ سب ہیں۔ ''مثنوی رنگ و بو'' کی طرح ''چراغِ دیر'' میں کوئی تمثیل پیش نہیں ہوئی ہے۔ مثنوی 'درد و داغ' کی طرح اس میں کوئی کہانی نہیں ملتی، مثنوی 'سرمہ بینش' کی طرح اس میں کسی بادشاہ کی مدح نہیں ہے اور حسن و عشق کے بیان کو تصوف کا رنگ نہیں دیا ہے۔ مثنوی 'بادِ مخالف' کا انداز بھی نہیں ہے۔ غالبیات میں ''چراغِ دیر'' کا تخلیقی سانچہ مختلف نوعیت کا ہے۔ غالب کی کسی مثنوی کا کینوس ایسا نہیں ہے کہ جس پر تین مختلف رنگوں سے ایسی تصویریں بنی ہوں اور ان کا باطنی طلسمی رشتہ بھی ہو۔ بلاشبہ اس مثنوی میں ایک اجنبیت ہے اور اجنبیت کی تازگی ہے جو تحیر کی جمالیات کی سطح بلند کر دیتی ہے۔ ''مثنوی چراغِ دیر'' مرزا غالب کی ایک نمائندہ تخلیق ہے، جو جلال و جمال کا ایک عمدہ معیار قائم کرتی ہے۔ جلال کا پہلو اس طرح اُبھرتا ہے:

رگِ سنگم شرارے می نویسم کفِ خاکم غبارے می نویسم

تو جمال کا پہلو اس طرح:

ز رنگیں جلوہ ہا غارت گرِ ہوش بہار بستر و نوروز آغوش!

'مثنوی چراغِ دیر' کی تکنیک بھی تحیر کے حسن سے آشنا کرتی ہے۔ غور فرمایئے اس نظم کے کینوس میں تین واضح رنگ ہیں جو بظاہر ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد ہیں لیکن مجموعی طور پر جو جمالیاتی وحدت پیدا کرتے ہیں اس سے حیرت انگیز مسرت حاصل ہوتی ہے۔ آیئے ہم ان تینوں رنگوں کو اس طرح سمجھنے کی کوشش کریں۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے پہلا رنگ سرخ ہے یعنی جبلت کا رنگ، دوسرا آسمانی یا نیلا ہے جو آسمان کا رنگ بھی ہے اور روح اور باطن کا رنگ بھی اور تیسرا اس سرخ اور نیلے کے امتزاج سے بنا ہوا بنفشئی (violet) جسے نفسیات کے بعض علما نے صوفیانہ تخیل اور صوفیانہ فکر کا رنگ کہا ہے۔ جمالیاتی نقطۂ نظر سے یہ تینوں رنگ اس نظم میں اہمیت رکھتے ہیں۔

درد و غم، باطنی اضطراب، تپش اور بے چینی اور جبلتوں کے اظہار میں پہلا رنگ یعنی سرخ مثنوی کے پہلے حصے میں موجود ہے۔ محسوس ہوتا ہے جیسے 'کینوس' پر پہلے جبلت اور احساس اور جذبے کی گرمی اور شدت کا سرخ رنگ اچانک پھیلتا ہے۔

نفس با صور دمساز ست امروز خموشی محشر راز ست امروز
رگِ سنگم شرارے می نویسم کفِ خاکم غبارے می نویسم

جذبات میں حد درجہ گرمی ہے، رگِ سنگ سے لہو ٹپکنے والا ہے، بے چینی ہے، اضطراب ہے، غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے، شوق اور خواہشوں کا دم گھٹنے لگا ہے۔ اپنے وجود میں ''خونِ صد برق'' کا شدید احساس ہے۔ داستان غم سنانے کے لیے ہونٹ کانپ رہے ہیں، فغاں ایسی ہے کہ باہر نکلے تو جگر کے ٹکڑے ہو جائیں، تنہائی کا احساس

کاٹے جارہا ہے، یہ احساس شدید ہے کہ سمندر کی لہروں نے باہر پھینک دیا ہے، رگ سنگ بن کر چنگاریوں سے لکھنے کی خواہش ہے تا کہ سانس، جو صور محشر کی ہم نوا ہے اور خاموشی جو اسرار محشر ہے اپنی تپش، گرمی اور آواز کے ساتھ سامنے آجائے، قیامت بپا ہو جائے۔

ذات کا آتشیں پیکر ہے، جلیل وجلیل تر تجربوں کی شدت ہے، جمالیاتی تناؤ توجہ طلب ہے۔ یہ پہلا رنگ یعنی سرخ، حد درجہ باطنی ہے۔ اس رنگ کے ساتھ جو تصویریں ابھرتی ہیں وہ باطن کے درد وغم، اضطراب اور بے چینی اور بہت حد تک فن کار کی چیخ کو پیش کرتی ہیں۔ ان کے پس منظر میں زندگی کی شکست و ریخت اور انفرادی محرومی کا شدید تر احساس موجود ہے۔

صحرا نوردی کے تجربوں سے لاشعور اچانک بیدار ہو جاتا ہے اور یہ احساس عطا کرتا ہے کہ تم اپنے دل میں پھولوں کی ایک ایسی زمین رکھتے ہو جس کا آئین بہار ہے اور جس کا ماحول دل نشیں ہے:

بخاطر دام ایک گل زمینی　　　　بہار آئیں سواد دل نشینی

اور آہستہ آہستہ یہ احساس باطن کے نگار خانے میں آتا رہتا ہے۔ گہرائیوں میں لے جاتا ہے۔ اچانک دوسری رنگین موج تیزی سے آجاتی ہے، دوسرا رنگ 'نیلا' اسی شدت سے 'کینوس' پر پھیل جاتا ہے۔ بہ ظاہر اس حصے کے تجربے حد درجہ خارجی نظر آتے ہیں لیکن یہ اتنے ہی باطنی بھی ہیں۔ سرخ رنگ پر آسمانی یا نیلا رنگ چھا جاتا ہے۔ اچانک آہنگ تبدیل ہو جاتا ہے۔ بحر وہی ہے لیکن شخصیت کا آہنگ چونکہ مختلف ہو جاتا ہے اس لیے تجربوں کا آہنگ بھی بدل جاتا ہے۔ خوب صورت اور کومل اور نازک الفاظ سامنے آتے ہیں، عمدہ کنایے اور تشبیہیں اور بصیرت افروز تراکیب، غم کی لہروں کو حسرت اور تحیر کی لہریں جذب کر لیتی ہیں، عام قاری کے دل کو بنارس کے جلوے شعری تجربوں میں چھوتے ہیں لیکن سچائی یہ بھی ہے سرخ پر آسمانی یا نیلے رنگ کی لہریں فن کار کی روح کی گہرائیوں کے جلوؤں کو پیش کرنے لگتا ہے:

بنارس را کسے گفتا کہ چیں ست　　　　ہنوز از گنگ چینش بر جبین ست

تناسخ مشرباں چوں لب کشایند　　　　بہ کیش خویش کاشی را ستایند

کہ ہر کس کاندراں گلشن بمیرد　　　　دگر پیوند جسمانی نگیرد

چمن سرمایۂ امید گردد　　　　بہ مردن زندۂ جاوید گردد

زہے آسودگی بخش روانہا　　　　کہ داغ چشم می شوید ز جانہا

شگفتے نیست از آب و ہوایش　　　　کہ تنہا جاں شود اندر فضایش

بیا اے غافل از کیفیت ناز　　　　نگاہے بر پری زادانش انداز

ہمہ جانہائے بے تن کن تماشا　　　　ندارد آب و خاک ایں جلوہ حاشا

نہادشاں چو بوئے گل گراں نیست　　ہمہ جانند جسمے درمیاں نیست
دریں دیرینہ دیرستانِ نیرنگ　　بہارش ایمن ست از گردشِ رنگ

شہر بنارس، بہشت و فردوس کی صورت سامنے ہے۔ اس دیر کے سامنے عقیدت سے سر جھک جاتا ہے۔ حسن بنارس سرمستی اور وجدانی کیفیت کا باعث بنتا ہے اور آہستہ آہستہ اس کے جلوے باطن کے جلوے بن جاتے ہیں۔ اپنے وجود کے حسن، اپنے باطن کے جمال اور اپنی روح کی روشنی کا احساس غیر شعوری طور پر بڑھتا ہے۔ شہر کا جلوہ باطن کا جلوہ ہے اور باطن کا جلوہ شہر کا جلوہ نظر آنے لگتا ہے۔ جمیل تر احساسات شعری تجربے بن جاتے ہیں۔ 'پُر دلکشی' کا یہ عمل اپنی پراسراریت اور طلسمی کیفیتوں سے متاثر کراتا ہے۔ مثنوی کے اس حصے میں تحیر کی جمالیات کے جانے کتنے نقش ابھرتے ہیں۔ پراسراریت، طلسمی کیفیت، تجربے کی اجنبیت اور اس کی تازگی خود شاعر کو اس کا علم نہیں رہتا کہ کس لمحے وہ 'خارج' میں ہے اور کس لمحے باطن میں۔ شہر آرزو کی تصویر بھی سامنے آتی ہے۔ باطن کے جلوے بھی نمایاں ہوتے ہیں اور بنارس کا حسن بھی ظاہر ہوتا ہے۔ شاعر اس شہر کو اپنے وجود کی بہشت کا آئینہ بنالیتا ہے۔ جلوہ تمثال ذات میں گم ہو جاتا ہے اور اس کی آواز گہرائیوں سے سنائی دیتی ہے۔

بنارس کی تعریف میں وہ اجنبیت (strangeness) ہے جو تحیر کے حسن کا بنیادی جوہر ہے۔ بنارس کی تعریف محبوب کی تعریف ہے۔ حسن کے شدید احساس سے ایسے تجربے سامنے آئے ہیں جن میں 'شہر' محبوب بن گیا ہے اور ایک محبوب کا جلوہ جانے کتنے محبوبوں میں نظر آنے لگا ہے۔ سرمستی پیدا ہوتی ہے تو بنارس کی آب و ہوا میں صرف روح ہی روح نظر آتی ہے:

شگفتے نیست از آب و ہوایش　　کہ تنہا جاں شود اندر فضایش

غالبؔ کے سومناتِ خیال میں خوب صورتوں اور پیاری پیاری پری زادوں کی ایک دنیا آباد ہے۔ ان پیاری خوب صورت پری زادوں اور صورتوں کو اپنے نگار خانے میں سجاتے ہیں۔ اسی طرح کہ جس طرح آزر اپنے بتوں کو سجاتا تھا۔ ان دلکش حسین پیکروں کے تحرک اور رقص سے اسی طرح لطف اندوز ہوتے ہیں کہ جس طرح آزر اپنے بتوں کے تحرک سے لطف اندوز ہوتا تھا:

بیا اے غافل از کیفیتِ ناز　　نگاہے بر پری زادانش انداز

کلام میں تحیر کا حسن ان لمحوں میں زیادہ متاثر کرتا ہے جب ہم جسم سے بے نیاز روحوں کا نظارہ کرتے ہیں۔ آب و خاک سے بنے ہوئے ایسے پیکروں کا حسن کبھی ایسا نہیں ہوتا۔ لگتا ہے یہ وہ چہرے اور وہ وجود ہیں کہ جن کا آب و خاک سے کوئی تعلق نہیں ہے:

ہمہ جانہائے بے تن کن تماشا　　ندارد آب و خاک ایں جلوہ حاشا

تحیر کا جمال اپنی تازگی لیے اس طرح سامنے آیا ہے کہ ان کی فطرت ایسی ہلکی پھلکی ہے جس طرح

پھول کی خوشبو ہوتی ہے۔ شعلۂ طور جلوہ تھا، ان بتوں کا بدن جلوۂ طور سے خلق ہوا ہے، جس پیکر کو دیکھیے سر سے پاؤں تلک خدا کا نور ہے۔ جلوے میں ایسی دمک ہے کہ شعلہ سا اٹھنے لگتا ہے۔ ان کے وجود کی تابنا کی کی تابش سے آرزو میں تڑپ پیدا ہو جاتی ہے۔ آتشِ شوق بھڑک اٹھتی ہے، یہ خوب رو بت، بت پرست برہمنوں کو بھی جلا ڈالتے ہیں۔ غالب کی حسن پسندی نے حیرت انگیز پیکر سجائے ہیں، مثلاً کہتے ہیں ان کے چہرے گلستاں کی مانند شگفتہ ہیں اور چہروں کی روشنی سے گنگا کے کنارے چراغاں کی سی کیفیت ہے:

بساماں دو عالم گلستاں رنگ زتاب رخ چراغاں لب گنگ

تحیر کی جمالیات کی پہچان وہاں بھی ہوتی ہے جب حسینوں کی مستی دیکھ کر موجوں کی مستی خاموش ہو جاتی ہے، پانی مجسم ہو جاتا ہے، پانی کو جسم مل جاتا ہے اور گنگا اپنی تمنا کے اظہار کے لیے بے تاب اور مضطرب نظر آتی ہے۔ موج کی صورت آغوشیں کھولے ہوئے ہے۔ سیپ کے اندر موتی بے قرار محسوس ہوتا ہے، پانی پانی ہو جاتا ہے۔ بتانِ آزر کی مانند متحرک، سحر انگیز بت سجے ہوئے ہیں۔ تحیر کے حسن کو اس طرح پیش کرنے کے عمل کو ہندوستانی جمالیات میں "چمتکار" بھی کہا گیا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ تجربے معجزہ اور فوق الفطری فضا سے قریب ہونے کے باوجود تحیر کا اپنا حسن رکھتے ہوں۔ بنارس کے اسٹیج پر حسینوں کے جلوؤں کا ایک ڈراما اسٹیج ہوتا ہے، جو 'چمتکار' کے جادو کو لیے متحرک پیکروں کی حیرت انگیز کیفیتوں کو ذہن پر نقش کر دیتا ہے۔

اس مثنوی کی تیسری اور آخری تصویر یہ ہے کہ شاعر جلوۂ تمثالِ ذات کے شدید تر احساس کے ساتھ "جنوں" کو حاصلِ سفر سمجھتا ہے اور اسی لمحہ اسی جنوں میں سرمستی اور اس سرمستی میں توازن پیدا کرنے کے لیے اپنی "سائیکی" کو متحرک کرتا ہے اور اجتماعی لاشعور سے "بزرگ دانش مند" کا حسی پیکر ابھرتا ہے جو خود اس کی اپنی پرچھائیں اور اس کے اپنے وجود کا روشن حصہ ہے۔ یہ "پیکرِ روشن بیاں" اور آسمان کی گردش کے راز داں کی صورت جلوہ گر ہوتا ہے۔ 'روشن بیاں' بنارس کی جانب جو اشارہ کرتا ہے وہ فن کار کے باطن کا اشارہ بن جاتا ہے۔ یہ باطن کے بھی جلوے ہیں جو نظر آرہے ہیں۔ اس کا ہر اشارہ معنی خیز ہے اور فن کار کی باطنی کیفیتوں کی غمازی کر رہا ہے:

سوئے کاشی بانداز اشارت تبسم کرد و گفتا ایں عمارت

کہ حقا نیست صانع را گوارا کہ از ہم ریزد ایں رنگیں بنارا

بلند افتادہ تمکین بنارس بود بر اوج او اندیشہ نارس

پہلے حصے میں غم و درد کی تیز لہروں کے ساتھ ٹوٹ کر گر جانے، زمانے کی شکست و ریخت سے وجود کے بکھر جانے کا جو لاشعوری خوف ہے اسے اپنی ذات کی عظمت کا احساس سہارا دیتا ہے:

بخاطر دارم اینک گل زمینے بہار آئیں سواد دل نشینے

اور اس کے بعد "روشن بیاں" باطن کی اس روشنی کی تصدیق کر دیتا ہے جو بنارس کے خوب صورت

پیکروں کے احساس سے باطن میں نظر آتی ہے اور اس لاشعوری خوف کو اس طرح دور کرتا ہے کہ خدا نہیں چاہتا کہ یہ عمارت ٹوٹ جائے۔ یہ عمارت رنگین ہے، بلند ہے، پُر وقار ہے۔ آخر میں یہ آواز گونجتی ہے، ہوس کو فنا کردے اور اپنے نفس کو دل کی آگ سے بے قرار رکھ، عقل و دانش سے کام نہیں نکلتا تو جنوں سے کام لے، جب تک سانس کی ڈور نہیں ٹوٹتی راستہ طے کرنا نہ چھوڑ، شرارے کی مانند فنا ہونے کے لیے اُٹھ اور دامن جھٹک کر آزاد ہو جا، 'لا' کو تسلیم کر کے الا کا نعرہ بلند کر، اللہ کا ورد کر اور ماسوا اللہ کو پھونک ڈال۔

اس مثنوی کا حسن بنیادی طور پر وہی ہے جو کسی بھی اچھی مغل تصویر کا ہے۔ تصویریں بہ ظاہر بکھری ہوئی ہیں لیکن ان میں ایک معنوی ربط ہوتا ہے۔ یہاں بھی تین تصویریں ہیں، تین حصے ہیں، تینوں اپنا رس اور اپنا جلوہ رکھتے ہیں۔ بہ ظاہر تینوں تصویریں اپنی علاحدہ حیثیت رکھتی ہیں لیکن ان میں معنوی ربط موجود ہے۔ جلال و جمال کے تحیر کو جس طرح اُبھارا گیا ہے وہ ایک بڑے تخلیقی فن کار ہی کا کارنامہ ہو سکتا ہے۔ یہ تین پہلو یا یہ تین تصویریں زندگی کو سمیٹ لیتی ہیں۔ فرد، ذات یا اس کا وجود، اس کی باطنی کیفیات، درد و کرب، اضطراب، ایک تصویر اس طرح ابھرتی ہے، دوسری تصویر جلالِ فرد کے برعکس جمالِ زندگی کی ہے، بنارس کے حسن کا تحیر جمالِ زندگی کی علامت ہے، جلالِ فرد کے تحیر سے جمالِ زندگی کے تحیر تک غالبؔ نے تحیر کی جمالیات کی تازگی اور اجنبیت کو انتہائی فن کارانہ طور پر احساس سے قریب تر کر دیا ہے۔ آخر میں یعنی تیسری تصویر میں تحیر کا حسن اس طرح نمایاں ہوتا ہے کہ ایک بزرگ دانش مند، روشن بیاں کا پیکر ابھرتا ہے، وجد کے جلال اور زندگی کے جمال سے آشنا، انتہائی تجربہ کار، یہ تصویر بھی سحر انگیز ہے، یہ روشن بیاں جو وجود ہی کے باطن کا پیکر ہے، جنوں کی تعلیم دیتا ہے، کہتا ہے شرارے کی مانند فنا ہونے کے لیے اُٹھ اور دامن جھٹک کر آزاد ہو جا، اس آخری حصے میں زندگی کے جمال اور اس کے تحیر کی ایک اور ہی انوکھی تصویر سامنے آتی ہے۔ بلاشبہ مثنوی 'چراغِ دیر' مرزا غالبؔ کا ایک غیر معمولی کارنامہ ہے۔

☆☆☆

اقبال اور شیومت

ڈاکٹر لطف الرحمٰن

اقبالؔ کی فکر میں قرآنی تعلیمات کو مرکزیت حاصل ہے مگر انھوں نے مختلف مکاتب فکر سے استفادے کیے ہیں۔ مغربی مکاتب فکر سے قطع نظر ہندوستانی فلسفے کے اثرات ان کے یہاں نمایاں ہیں، کہتے ہیں:

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی   برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

ضرب کلیم کی نظم "ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام" میں کہتے ہیں:

میں اصل کا خاص سومناتی
آبا مرے لاتی و مناتی
تو سید ہاشمی کی اولاد
میری کفِ خاک برہمن زاد
ہے فلسفہ میرے آب و گل میں
پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں
اقبالؔ اگرچہ بے ہنر ہے
اس کی رگ رگ سے باخبر ہے

بعض نقادوں نے اقبال کے یہاں تفصیل کے ساتھ ویدانتی فلسفے کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ اقبال نے ویدانتی فلسفے کو تنقیدی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اسے من وعن قبول نہیں کیا۔ خصوصاً تصوف کے حوالے سے انھوں نے ویدانتی فلسفے کے منفی اثرات پر تنقیدی گرفت کی ہے۔ اقبال سنسکرت سے براہ راست استفادے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ انھوں نے ہندی فلسفے کے سلسلے میں جب خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بلا واسطہ اور براہ راست ہیں۔ عطیہ بیگم فیضی کے ایک مکتوب سے اس کی شہادت ملتی ہے:

"میں نے انھیں (اقبال) بہت ہی فاضل شخص پایا۔ عربی، فارسی، سنسکرت بخوبی جانتے ہیں۔"

(شعر اقبال۔ سید عابد علی عابد۔ ص: ۳۳۵)

ویدانتی فلسفے میں قبل ویدی تہذیب کے اثرات بھی نفوذ کر گئے تھے۔ اسلام سے قبل ہندوستانی فلسفے کے متعدد ارتقائی مرحلے سامنے آتے ہیں۔ اگر ماقبل ویدی اثرات سے صرف نظر کریں تو ویدی تہذیب اس کی پہلی منزل ہے۔ دوسری منزل ''اپنشد''، تیسری منزل ''بودھی تہذیب''، چوتھی ''پورانک'' یعنی ہندو مذہب کی تجدید نو۔ اس مرحلے پر بودھ مذہب کے اثرات کو ختم کرنے کے لیے شیو اور وشنو کی پرستش کو ہندو عقیدے کا لازمی جزو بنا دیا گیا۔

شیو اور وشنو آریائی دیوتا نہیں ہیں بلکہ ہندوستان کے قدیم باشندوں کے دیوتا ہیں۔ بعض ارباب فکر کے مطابق یہ دراوڑیوں کے دیوتا تھے۔ دراوڑیوں کی تہذیب کے دھندلے خاکے موہن جوداڑو اور ہڑپا جیسے آثار قدیمہ سے متعلق ہیں جن کی یادگار بعض محققین کے مطابق مختلف آدی باسی قبائل ہیں۔ آریوں نے قدیم باشندوں کے دیوتا رُدر اور سوریہ کو وشنو اور شیو کی صورت میں ہندومت کے دیوتاؤں میں شامل کر لیا۔

ہندومت میں عقیدہ وحدت کی بنیاد تثلیث ربّی یا تری مورتی پر ہے۔ برہمہ کائنات کی روح رواں ہے لیکن اس کے تین مظاہر ہیں۔ برہما کی حیثیت سے وہ خالق کائنات ہے۔ وشنو کی حیثیت سے پروردگار اور شیو کی حیثیت میں فنا کی قوت ہے۔ لیکن یہ تینوں ایک ہی ذات کے اوصاف ہیں۔ اس لیے برہما، وشنو اور شیو کی پرستش حقیقتاً برہما کی عبادت ہے۔

ہندو مذہب میں وشنو کے اوتار رام چندر، شری کرشن اور بدھ ہیں۔ بودھوں کے مہایان مسلک میں بدھ کو شری کرشن کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ سارے عقیدے بھگتی کے اصول وضوابط سے تعلق رکھتے ہیں سب سے پہلے جن کی ترتیب و تنظیم گیتا کے ذریعے ہوئی۔

اقبال پر وشنومت اور شیومت دونوں کے اثرات ہیں۔ ''بانگ درا'' میں ان کی نظم ''رام'' ان پر وشنو مت کے اثرات کی نشاندہی کرتی ہے۔ کہتے ہیں:

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند
اعجاز اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی
روشن تر از سحر ہے زمانے میں شامِ ہند
تلوار کا دھنی تھا، شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں، جوشِ مروّت میں فرد تھا

وشنومت سے ان کی قربت کا دوسرا ثبوت ''جاوید نامہ'' کے فصل ہشتم میں ''طاسین گوتم'' ہے۔ اقبال

رومی کی رہبری میں فلک قمر سے رخصت ہو کر وادی ''یرغمید'' کہ ملائکہ اور وادی طواسین کی نامند'' کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ پیر رومی فرماتے ہیں:

کندہ بر دیوار از رنگ قمر   چار طاسین نبوت را نگر

ان میں پہلا طاسین گوتم ہے جس میں گوتم کے نظام اخلاق یا وعظ کی تشریح کی گئی ہے جس کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں۔ اقبال وشنومت کے مقابلے میں شیومت سے زیادہ متاثر ہیں۔

شیومت کا تعلق سناتن دھرم سے ہے۔ سناتن کے معنی ہیں ابدی۔ غیر فانی۔ Permanent۔ جس کا کوئی آغاز ہے نہ انجام۔ سناتن دھرم وید پر مبنی ہے۔ وید کے معنی عقل (Wisdom) کے ہیں۔ ویدانت کا مطلب ہے اب وید کا انت ہو گیا۔ یعنی عقل مکمل ہو گئی، اس کے باوجود کچھ ایسی حقیقتیں تھیں جو چاروں وید کے بعد بھی سامنے آئیں اور انسان کے لیے ضروری قرار دی گئیں۔ اس فکر کے پس پردہ یہ منطق کام کر رہی تھی کہ کچھ ہے جو آدمی کے لیے ہمیشہ ضروری ہے۔ چنانچہ ویدانت کے بعد جن علوم کو انسانی زندگی کے لیے ضروری قرار دیا گیا ان کو ''ویدانگ'' یعنی (وید+ انگ) وید کا حصہ قرار دیا گیا، جیسے آیوروید، واتسائن کا کام ستر، علم نجوم وعلم فلکیات وغیرہ۔ وقت کی تبدیلی کے ساتھ ہی عقل (Wisdom) کو بھی وسعت حاصل ہوتی جاتی ہے، کچھ چیزیں اس میں شامل کی جاتی ہیں۔ وقت کے تحول وتغیر کے ساتھ ہی ان میں تبدیلی لازمی سمجھی گئی۔

سناتن دھرم میں برہما ایک ہی ہے جس کا یہ برہم کانڈ (کائنات) ہے۔ اس کائنات میں انسان تین بنیادی حقیقتوں کا مشاہدہ کرتا ہے: (۱) وہی (برہم) پیدا کر رہا ہے، (۲) وہی پرورش کر رہا ہے، (۳) وہی فنا کر رہا ہے۔ ویدک بنیاد پر مذہب کو عملی حیثیت دینے کے لیے اور عام لوگوں کی تفہیم کے لیے کام کی تقسیم کا فلسفہ پیش کیا گیا جو تثلیث ربی (تین مورتی) پر مبنی ہے۔

وشنو کے نام پر وشنومت اور شیو کے نام پر شیومت قائم ہوا۔ شیو کے معنی ہیں فلاح (Welfare) کلیان۔ شیومت بنیادی طور پر شکتی یا طاقت کی علامت ہے۔ اسی سے شاکت مت بھی نکلا۔ جو صرف شکتی کے پجاری ہو گئے وہ شاکت کہلائے۔ اس کے ماننے والے پانچوں بھوگ کرتے ہیں یعنی شراب، گوشت، جنس اور موہ اور مایا بھی ان کے ساتھ مخصوص ہے۔

شیومت مرد اساس (پرش آدھارت) ہے اور شاکت مت عورت اساس (ناری آدھارت) ہے یعنی یہ تانیثیت پر مبنی ہے۔ شاکت مت کی نمائندہ درگا، کالی اور بھوانی ہیں۔ سناتن دھرم نے شیو اور شکتی دونوں کی پرستش کا اہتمام کر دیا۔ اس لیے کہ دونوں ضروری ہیں۔

شیومت کشمیر اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں زیادہ مقبول ہوا۔ وہیں امرناتھ ہے۔ کیلاش پربت اس کا مرکز ہے۔ وشنومت اتر بھارت میں اور شاکت مت پورب دکھن میں زیادہ مقبول ہوا۔ بنگال میں

شاکت مت ہے۔ بنگال کی درگا پوجا مشہور ہے۔ کالی کا سب سے بڑا مندر بھی وہیں ہے جہاں بھینسوں کا بلیدان دیا جاتا ہے۔

چونکہ شیومت شکتی کے عقیدے پر مبنی ہے اس لیے شکتی کو شیو کی رفیقۂ حیات قرار دیا گیا ہے۔ شیومت کی تشریح کرتے ہوئے گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''شکتی پوجا کا رواج قوت تولید کی دیوی کی حیثیت سے ہندوستان میں قبل ویدی یعنی وادی سندھ کے زمانے سے چلا آتا ہے۔ چونکہ جنسی تولید ہی زندگی اور موت کا نقطۂ آغاز ہے۔ اس کے لیے شکتی کی دو شاخیں تسلیم کی گئیں۔ پاروتی، اما اور گوری کے نام سے یہ شفیق ماں کے تصورات کی حامل ہے اور درگا، بھوانی اور کالی دیوی کے نام سے یہ تباہی و تخریب کی مظہر ہے۔''

(ہندوستانی تہذیب کا ارتقا۔ ص:۴۹)

اقبال شیومت کے زیر اثر رہے ہیں۔ اس کا ایک روشن ثبوت یہ ہے کہ ''جاوید نامہ'' میں فلک قمر پر وہ رومی کی رہبری میں شیوجی سے ملتے ہیں۔ جس کی تفصیل رومی کے مکالمے، اقبال سے شیوجی کے سوال و جواب اور شیوجی کے بیان کردہ نو فلسفیانہ نکات ہیں۔ اقبال شیوجی سے ملاقات کے ذکر کے تحت یہ عنوان مقرر کرتے ہیں:

''عارف ہندی بہ یکے از غارہائے قمر خلوت گرفتہ و اہل ہند اورا ''جہان دوست'' می گویند۔''

جب اقبال رومی کے ساتھ فلک قمر کے ایک غار میں جاتے ہیں شیوجی سے اپنی ملاقات کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

زیر نخلے عارف ہندی نژاد
دیدہ ہا از سرمہ اش روشن سواد
موئے بر سربستہ و عریاں بدن
گرد او مارے سفیدے حلقہ زن
وقت او را گردش ایام نے
کار او را چرخ نیلی فام نے
گفت با رومی کہ ہم راہ تو کیست؟
در نگاہش آرزوئے زندگیست!

عارف ہندی نے رومی سے پوچھا کہ آپ کے ساتھ حیات جاوداں کا آرزومند یہ کون شخص ہے۔

رومی نے اقبال کا تعارف کرایا۔ تعارف نامہ آٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔ جس کا لب لباب یہ ہے کہ اقبال شہید اسرار ازل ہیں، تب جہان دوست رومی سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

عالم از رنگ است و بے رنگی است حق　　چیست عالم؟ چیست آدم؟ چیست حق؟

رومی پانچ اشعار میں عارف ہندی کا جواب دیتے ہیں۔ پھر عارف ہندی نے مشرقی اقوام کے مستقبل پر مثبت تبصرہ کرتے ہوئے اقبال سے مختلف سوالات کیے جن کے جوابات اقبال نے دیئے۔ یہ حصہ درج ذیل ہے:

پیر ہندی اند کے دم در کشید
باز در من دید و بیتابانہ دید
گفت مرگ عقل؟ گفتم ترک فکر
گفت مرگ قلب؟ گفتم ترک ذکر
گفت تن؟ گفتم کہ زاد از گرد راہ
گفت آدم؟ گفت از اسرار اوست
گفت عالم؟ گفتم او خود رو بروست
گفت ایں علم و ہنر؟ گفتم کہ پوست
گفت حجت چیست؟ گفتم روئے دوست
گفت دین عامیاں؟ گفتم شنید
گفت دین عارفاں؟ گفتم کہ دید

اقبال کے جوابات سے خوش ہو کر عارف ہندی نے اقبال کو کئی علمی نکات سے آگاہ کیا۔ ان میں ذات حق، تسخیر زمان و مکان، حیات ابدی کا حصول، زمان کی حقیقت، معرفت حق اور جہاد نفس، دل بیدار کی اہمیت، پاکیزگی باطن، مسئلہ سرشت اور الوہی صفت کے حصول کی راہ وغیرہ ہیں۔ دراصل یہ تمام رموز و نکات تو اقبال کے فکر و تصوف کے اظہار کی مختلف شکلیں ہیں لیکن اقبال نے ان کو وشومتر کی طرف منسوب کر کے دراصل ان کی عظمتِ روحانی کا اعتراف بھی کیا ہے اور ان کے فلسفہ و فکر کے اثرات کا اعتراف بھی۔

یہاں پر ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ ہندو دیو مالا میں ایک تو وشومتر گزرے ہیں جو شیو جی ہیں۔ اور ایک وشوامتر گزرے ہیں۔ دونوں میں ایک فرق یہ ہے کہ وشوامتر میں "وشو" کے بعد الف کا اضافہ ہے۔ اس لیے "وشوا" اور شیو جی کے لیے "وشو" آتا ہے اور یہی شیو جی جہان دوست یا وشومتر ہیں۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی

نے ''جاوید نامہ'' میں عارف ہندی کی تشریح کرتے ہوئے شیو جی کی شخصیت کو وشوامتر سے خلط ملط کر دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''واضح ہو کہ 'جہان دوست' سے 'وشوامتر' مراد ہے جو دراصل ایک چھتری راجہ تھا۔ (چھتری یا کشتری ہندوؤں میں برہمنوں کے بعد دوسری اونچی ذات ہے) کان کج برہمن اپنے آپ کو اسی کی اولاد بتاتے ہیں۔ اس کا دارالحکومت قنوج تھا۔ چونکہ بہت علم دوست اور محب حکمت تھا اس نے بڑے بڑے پنڈتوں سے علم حاصل کیا اور مناظرے میں مہارت تامہ بہم پہنچائی۔ چنانچہ اس نے اپنے زمانے کے مشہور برہمن عالم وشیشٹ (جس نے یوگ فلسفہ پر ایک کتاب لکھی ہے) سے مناظرہ کیا تھا۔ اگرچہ وہ چھتری تھا مگر اس نے ''تپسیا'' (ریاضت) کی بدولت برہمن کا مقام حاصل کر لیا۔''
(شرح 'جاوید نامہ' حصہ اول، ص: ۳۳۱)

ہندو صنمیات میں یہ وشوامتر جن کا ذکر یوسف سلیم چشتی نے کیا ہے وہ شیو جی نہیں ہیں۔ ان کی اصلیت مختلف ہے۔ یہ درست ہے کہ وہ قنوج کا راجہ تھا جس نے اپنی ریاضت وعبادت کی بدولت دیوتاؤں کی عظمت حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ وہ اپنے لیے برہمن رشی یا راج رشی کے منصب کا دعویدار ہوا۔ لیکن راجپوت ہونے کی وجہ سے اس کو اس منصب کا حق دار نہیں سمجھا گیا۔ اس نے دھمکی دی کہ اگر دیوتاؤں نے اس کی بات نہیں مانی تو وہ دوسری سرشٹی یعنی تخلیقات کا سلسلہ شروع کر دے گا۔ اس نے ایسا کیا بھی۔ جانوروں میں بھینس، پھولوں میں چمپا اور پھلوں میں کٹہل اسی کی مخلوقات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پوجا میں بھینس کا دودھ اور چمپا کا پھول نہیں چڑھایا جاتا۔ ان کے علاوہ جتنے راکشش ہیں سب اسی کی مخلوقات ہیں۔ مثال کے طور پر مہیسا سور اور دیوا سور وغیرہ۔

اس کے برعکس شیو جی برہما کے اوتار ہیں۔ ان کے ۱۰۴ نام ہیں۔ نیل کنٹھ، امرناتھ، شنکر، شمبھو، بھولا، نٹ راج، بشوناتھ، بیجناتھ، کاماتھ، کیدارناتھ، بھوت ناتھ، ناگ ناتھ، مہاکالیشور، باکی ناتھ، آسوتوش، تنتر ناتھ وغیرہ۔

شیو جی کیلاش پربت سے بہت کم اترتے ہیں۔ جب کسی ظالم یا راکشش کا خاتمہ کرنا ہوتا ہے جبھی وہ کیلاش سے نیچے آتے ہیں۔ وہ بہت جلد خفا ہو جاتے ہیں لیکن بہت جلد مان بھی جاتے ہیں۔ شیو جی تانترک مت کے سب سے بڑے دیوتا ہیں اس لیے ان کو تنتر ناتھ بھی کہتے ہیں۔

فلک قمر پر اقبال کی ملاقات جس وشومتر سے ہوئی ہے وہ ہندو دھرم کے مطابق یہی شیو ہیں جو اوتار ہیں اور کلیان کاری ہیں اور فلاح کے ذمہ دار ہیں۔ یہ وضاحت اس لیے ضروری تھی کہ رومی نے اقبال کی ملاقات برہما کے اوتار سے کرائی تھی جس میں مرد مومن کی خصوصیات موجود تھیں۔

یوں تو دنیائے ادب میں مرد مومن کے چالیس سے زیادہ مکاتب فکر ملتے ہیں جن میں ابراہیم الجیلی،

نطشے، رومی، اربندوگھوش، کرکے گارڈ وغیرہ سے اقبال زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ اقبال نے مغرب کے تمام ایسے مکاتب فکر کو تنقیدی نگاہوں سے پرکھا ہے۔ نطشے خدا کے وجود کا منکر ہے، اس نے خدا کی موت کا اعلان کیا تھا (The God is dead) اقبال نے نطشے کے حوالے سے کہا ہے:

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں تو اقبال اس کو بتلاتا مقام کبریا کیا ہے

مغرب کے دوسرے فلسفیوں میں اقبال کرکے گارڈ کے تصور مومن (Knight of Faith) سے متاثر ہیں۔ اقبال کے تصور مومن میں اسلامی فکر کو مرکزیت حاصل ہے۔ مگر اس کے افہام وتفہیم میں انھوں نے دوسرے مکاتب فکر سے بھی استفادہ کیا ہے۔ جن میں شیومت ان کی خصوصی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ گرچہ وشنومت کی تعلیمات سے بھی وہ بیگانہ نہیں رہے ہیں۔ جس کا ذکر رام چندر جی اور مہاتما بدھ کے حوالے سے آچکا ہے۔ یہاں مناسب ہے کہ وشنومت اور شیومت کے بنیادی فرق کو بھی سامنے رکھا جائے۔

وید میں 'نگم' کا فلسفہ ملتا ہے یعنی نزول آگہی کا۔ وید کے مطابق عرفان اور آگہی نازل ہوتی ہے۔ روحانیت اور نور الٰہی کی تنزیل ہوتی ہے۔ اسی نظریے کو وشنومت میں دیوتاؤں کے اوتار سے تعبیر کیا جاتا ہے، جس کے پس پردہ یہ تصور کارفرما ہے کہ خدا انسان کی شکل میں اوتار لیتا ہے۔ رام اور کرشن ایسے ہی اوتار ہیں۔ بریں بنا وشنومت میں سادھنا، عبادت وریاضت اور رسم وروایت پر زور دیا جاتا ہے۔ وشنومت میں نزاکت ونسائیت ملتی ہے۔ یہاں خودی کو مٹا کر ہی خدا کا وصال ممکن ہے۔ ویدک فلسفے میں خودی کی نفی لازمی ہے۔ اس کے بغیر وصال حق ممکن نہیں۔ جب تک اندر کی آگ نہیں بجھتی، اپنی ذات کا شعور اور خودی کا احساس ختم نہیں ہوتا، عرفان خدا ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وشنومت کے ماننے والے دریا کے کنارے مندر بناتے ہیں۔ آگ اور پانی کا ایک دوسرے سے بیر ہے اور یہاں اندر کی آگ کو بجھانا ہے۔ فارسی اور اردو شاعری ویدک فلسفے سے گہرے طور پر متاثر ہے۔ اسی سے وحدت الوجود کا تصور بھی ابھرتا ہے۔

وشنومت کے برعکس شیومت میں "اگم" کا فلسفہ ملتا ہے جس کے معنی ہیں اوپر اٹھنے، آگے بڑھنے، یعنی خودی یا انا کو معراج بلندی سے ہم کنار کرنا ہی عرفان خدا سے عبارت ہے۔ انا یا خودی ہی خدا ہے۔ شیو جی کو علامتی حیثیت حاصل ہے۔ وہ مرد کامل ہیں، Superman ہیں، وہی Ideal ہیں، قابل تقلید ہیں۔ خودی کی تہذیب وتربیت سے آدمی شیو کا مرتبہ حاصل کرتا ہے۔ شیو آدمی کے اندر توانائی کی صورت میں پوشیدہ ہے۔ اسی پوشیدہ توانائی کا عرفان حاصل کرنا ہے۔ یہی عرفان رب ہے، یہی نجات ہے، اسی سے وجود کے تمام دکھ درد مٹ سکتے ہیں۔

شیومت خدا کی آگہی کے نزول کا انتظار نہیں کرتا بلکہ ارتقائی عمل کے ذریعے اپنی خودی کی معراج سے الوہی رفعت وعظمت حاصل کرتا ہے جو شانتی اور امن کی منزل ہے۔ یہیں سے قوت ارادی کا تصور پیدا ہوتا ہے

جس کے پس پردہ طاقت کا فلسفہ پوشیدہ ہے۔ اسی وجہ سے شیو کے ساتھ شکتی کی پوجا بھی ہونے لگی اور شاکت مت بھی عام ہوا۔

کشمیر میں شیومت (Shauism) زیادہ مقبول ہوا۔ اس کی مقبولیت کا دائرہ کشمیر سے لے کر تاشقند و سمرقند تک ہے۔ ابھی حال کی کھدائی میں ان علاقوں سے شیو کی مورتیں برآمد ہوئی ہیں۔ اس موضوع پر ازبکستان میں ایک سیمینار بھی ہوا تھا جس کے مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ شیو سادھوؤں کے لیے پہاڑوں اور جنگلوں کا ماحول ہی بہترین ہوتا ہے کہ اس میں طاقت اور توانائی کا اظہار ہے۔ شیومت میں سختی اور مضبوطی کی ضرورت ہے تاکہ مردانہ پن کا اظہار ہو سکے۔ اس کو آگہی کی روشنی جلانی ہے۔ اپنی خودی کے شعلے کو بلند رکھنا ہے۔ اس لیے شیو مت وشنومت کے برعکس خشک ماحول کو پسند کرتا ہے۔

شیو جی کی ساری خصوصیات غیر آریائی ہیں۔ آریائی دیوتاؤں کے کرداروں میں نفاست و نزاکت اور تہذیبی و ثقافتی قدریں ملتی ہیں۔ برعکس شیو جی کے یہاں ان قدروں کا فقدان ہے۔ نزاکت و نفاست سے بے تعلقی ہے، وہ شیر کی کھال پہنتے ہیں، شیر کی کھال پر بیٹھتے ہیں۔ جنگلوں اور پہاڑوں میں رہتے ہیں جہاں غیر آریائی (Aborigines) رہتے تھے۔ بھانگ دھتورا کھاتے ہیں۔ ان کا سارا معمول زندگی جنگلیوں جیسا ہے جس سے ثابت ہے کہ یہ غیر آریائی اور شاید دراوڑی دیوتا تھے جن کو بعد میں آریاؤں نے بھی تسلیم کر لیا۔

شیو جی شیر کی کھال پہنتے ہیں اس لیے ان کو باگھامبر بھی کہا جاتا ہے۔ شیو کا قیام کیلاش پربت ہے جہاں برف ہی برف ہے۔ شیر کی کھال میں گرمی زیادہ ہوتی ہے۔ یہ برفیلے مقام کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ شیو جی کی سواری بیل ہے، یہ ان کی بے نیازی کی علامت ہے۔ ان کے گلے میں سانپ لپٹا رہتا ہے۔ سانپ موت کی علامت ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ موت ان کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

شیو جی کے ہاتھ میں ترشول ہے۔ شول کے معنی تکلیف، مصیبت یا عذاب کے ہیں۔ آدمی کی زندگی میں عموماً جو مصائب و آلام آتے ہیں ان کی تین جہتیں ہوتی ہیں: (۱) جسمانی (Physical)، (۲) مادی (Material)، (۳) روحانی (Spiritual)۔ شیو جی کے ترشول کا یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ مذکورہ تینوں قسم کے دکھوں کا مداوا شیو جی کے پاس ہے۔

شیو جی کے ترشول کی ایک دوسری علامتی حیثیت بھی ہے۔ ہندومت کے اعتبار سے کائنات کی بنیاد فطرت ہے۔ فطرت تین عناصر سے مل کر بنی ہے۔

(۱) ستو...... جس سے روشنی، تقدس، پاکیزگی، سچائی اور خوشی و مسرت وابستہ ہے۔

(۲) رجس...... جس سے عمل و حرکت، حرارت، بلندی، عظمت اور شان و شوکت متعلق ہے۔

(۳) تمس...... جس سے تیرگی، تاریکی، پستی، ذلت، دکھ، درد اور گناہ و عذاب کا رشتہ ہے۔

شیو جی ان تینوں عناصر فطرت کو ترشول کی علامت کی شکل میں کنٹرول کرتے ہیں لیکن خود تینوں سے بے نیاز ہیں۔ مرد کامل فطرت و کائنات کو مسخر کرتا ہے لیکن خود ان سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ یہ تصور ترشول سے وابستہ ہے۔

شیو جی کی پیشانی پر چاند ہے۔ چاند عرفان نظر کی علامت ہے۔ جب یہ آنکھ کھل جاتی ہے تو حقیقت کا عرفان حاصل ہو جاتا ہے۔ آدمی کی تیسری آنکھ بند ہے۔ اس لیے وہ حقیقت کی آگہی سے محروم ہے۔ لیکن جیسے ہی دل کی آنکھ روشن ہو جاتی ہے انسان ماضی، حال، مستقبل تینوں کالوں (زمانوں) پر حاوی ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ زمانے کو مسخر کر لیتا ہے۔ اقبال کے یہاں بھی مرد کامل کی یہ خاص صفت ہے۔ اقبال نے اس کو بصیرت دل سے تعبیر کیا ہے۔

شیو جی کے ماتھے سے گنگا بہتی ہے۔ گنگا پاکیزگی، تقدس اور نجات کی علامت ہے۔ یہ ابدیت ہے۔ اقبال کے یہاں بھی ابدیت کو گہری معنویت حاصل ہے۔ جنت میں بھی کوثر و تسنیم کی نہریں ہیں۔ جس طرح کوئی تھکا ماندہ، پریشان نڈھال آدمی دریا میں غوطہ لگانے کے بعد آسودگی، ٹھنڈک، طمانیت اور سکون کا احساس کرتا ہے، اسی طرح زندگی کا تھکا ہارا اور نڈھال مسافر عبدیت کے دریا میں غوطہ لگانے کے بعد سکون و طمانیت محسوس کرتا ہے۔ گنگا منزل نجات ہے۔ لیکن یہ نجات ساکن اور ٹھہری ہوئی شے نہیں بلکہ متحرک اور عامل ہے۔ اس میں ہر پل نیا تجربہ و احساس ہوتا ہے جیسے ندی میں ہر پل نئے پانی کی موجیں آتی ہیں۔ اسی کو ابدیت کہتے ہیں۔ اقبال کے یہاں بھی ابدیت کا متحرک تصور ہے۔ بیدل بھی یہی نقطۂ نظر رکھتے ہیں، کہتے ہیں:

گویند بہشت است ہمہ راحت جاوید　　جائیکہ بداغت نہ تپد دل چہ مقام است

ابدیت ہر لمحہ نیا ہونے کا نام ہے۔ اس میں یکسانیت، سکون، قرار اور بوریت نہیں بلکہ ۔ لمحہ بہ لمحہ تازگی، شادابی، آسودگی اور طمانیت سے عبارت ہے۔ ابدیت کا ہر لمحہ نئے شعور کا غماز ہوتا ہے۔ اقبال نے شیو جی کے گہرے اثرات قبول کیے ہیں۔ "جاوید نامہ" میں شیو جی کی مدح میں کہتے ہیں:

وادی ہر سنگ او زنار بند
دیوسار از نخل ہائے سر بلند
از سرشت آب و خاک است ایں مقام
یا خیالم نقش بندد در منام
در ہوائے او چومے ذوق و سرور
سایہ از تقبیل خاکش عین نور

نے زمینش را سپہر لاجورد
نے کنارش از شفق ہا سرخ و زرد
نور در بند ظلام آنجا نبود
دود گرد صبح و شام آنجا نبود
زیر نخلے عارف ہندی نژاد
دیدہ ہا از سرمہ اش روشن سواد
موئے بر سر بستہ و عریاں بدن
گرد او مارے سفیدے حلقہ زن
آدمے از آب و گل بالا ترے
عالم از دیر خیالش پیکرے
وقت او از گردش ایام نے
کار او با چرخ نیلی فام نے
گفت با رومی کہ ہم راہ تو کیست؟
در نگاہش آرزوئے زندگیست!

ان اشعار سے واضح ہے کہ اقبال ہندو فلسفے میں ویدک نظریات سے زیادہ شیومت سے قریب ہیں۔
اقبال بھی پہاڑوں اور جنگلوں میں طاقت و توانائی کے حصول کو مردِ کامل کے لیے ناگزیر قرار دیتے ہیں:

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں
گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کے لیے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی

شاہین ایک علامتی پرندہ ہے جس میں مردِ مومن کی صفات پائی جاتی ہیں۔ اپنی نظم "شاہین" میں اقبال کہتے ہیں:

کیا میں نے اس خاک داں سے کنارا
جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ

بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھ کو
ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ
نہ بادِ بہاری، نہ گلچیں، نہ بلبل
نہ بیماری نغمۂ آشیانہ
خیابانیوں سے ہے پرہیز لازم
ادائیں ہیں ان کی بہت دلبرانہ
ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری
جواں مرد کی ضربت غازیانہ
حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں
کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ
جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ
یہ پورب یہ پچھم چکوروں کی دنیا
مرا نیلگوں آسماں بیکرانہ
پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

اور ایک قطعے میں کہتے ہیں:

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں مری بات
یا وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل
یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہب مردان خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہب ملاّ و جمادات و نباتات

شیو جی شیر کی کھال پہنتے ہیں۔ ایک طرف تو یہ جرأت وجسارت کی علامت ہے، دوسرا پہلو یہ ہے کہ کیلاش پربت جہاں برف ہی برف ہے، اس کے خارجی اثرات سے بھی محفوظ رکھتی ہے۔ باہر کا کوئی موسم اثر انداز

نہیں ہوتا۔ بہ الفاظ دگر بوالہوسی، عیش کوشی، لہو و لعب، حرص و آز اور ہوا و ہوس سے محفوظ رکھتی ہے جو خارجی زندگی کا ایک پر فریب اور ساحرانہ طرز عمل ہے۔ اقبال نے بھی خودی کی تہذیب و تربیت کے لیے بوالہوسی اور عیش کوشی سے بچنے کی خاص تلقین کی ہے اور فقر کے حصول پر زور دیا ہے۔ فقر کے متعلق فرماتے ہیں:

''فقر سے میری مراد افلاس اور تنگ دستی نہیں بلکہ استغنا اور دولت سے لاپرواہی ہے۔''

(ملفوظات، اقبال۔ ص:۳۲۹)

فقر اقبال کے نزدیک غنائے نفس کا دوسرا نام ہے:

اقبال قبا پوشد در کار جہاں کوشد
دریاب کہ درویشی با دلق و کلاہے نیست
در قبائے خسروی درویش زی
دیدہ بیدار و خدا اندیش زی

اقبال نے اپنی شاعری میں فقر کی وضاحت کے لیے چار علامتیں استعمال کی ہیں: فقر، قلندری، درویشی و رندی۔ مختلف اشعار میں ان چار علامتوں کے ذریعہ اقبال نے اپنے تصور فقر کی وضاحت کی ہے:

دل بے نیازے کہ در سینہ دارم
گدا را دہد شیوۂ پادشاہے
راہ دشوار است، ساماں کم بگیر
در جہاں آزاد زی آزاد میر
فقر چوں عریاں شود زیر سپہر
از نہیب او بلرزد ماہ و مہر

اقبال کا تصور فقر حجازی ہے۔ وہ اس فقر سے گریز کرتے ہیں جو ضعف خودی کا سبب ہوسکتا ہے۔ کہتے ہیں:

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری
اک فقر سے کھلتے ہیں اسرار جہاں گیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری
اک فقر سے مٹی میں خاصیت اکسیری
ایک فقر ہے شبیری اک فقر میں ہے میری
میراث مسلمانی، سرمایۂ شبیری

اور ایک شعر میں کہتے ہیں:

فقرِ مومن چیست؟ تسخیرِ حیات
بندہ از تاثیر او مولا صفات

ہندی فلسفے کے مطابق شیو جی تسخیر کائنات کے مرحلوں سے گزر چکے ہیں۔ اقبال نے بھی "جاوید نامہ" کے اشعار میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

وقت او را گردشِ ایام نے
کار او با چرخِ نیلی فام نے

شیو جی کے شیر کی کھال کی ایک علامتی معنویت یہ بھی ہے کہ جسم سے پیدا ہونے والی برقی رو جو عبادت وریاضت کا نتیجہ ہے، زمین میں جذب ہونے سے محفوظ رہے اس لیے کہ وہ شیر کی کھال پر بیٹھتے ہیں جو غیر موصل (Non-Conductor) ہے۔ یہ ارضی زندگی سے بے تعلقی کا اشارہ ہے۔ اقبال نے مردِ مومن کے تصور میں شاہین کی خصوصیات کا مشاہدہ بھی کیا ہے۔ شاہین جب زمین پر اترتا ہے تو عام پرندوں کے برعکس اپنے پنجوں میں شاخ کا کوئی ٹکڑا ضرور رکھتا ہے۔ یہ تصور زمینی زندگی سے کم ربطگی کا ہے جس کو اقبال نے مردِ مومن کے لیے ناگزیر قرار دیا ہے:

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں
تو بے بصر ہو تو یہ مانعِ نگاہ بھی ہے
وگرنہ آگ ہے مومن، جہاں خس و خاشاک
وہی جہاں ہے تیرا جس کو تو کرے پیدا
یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے
کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحب ہوش
اک جہاں اور بھی ہے جس میں نہ فردا ہے نہ دوش

شیو جی کے گلے میں سانپ لپٹا رہتا ہے۔ ہندو فلسفے میں سانپ وقت کی علامت ہے۔ مراد یہ ہے کہ شیو جی وقت یا زمان سے بلند ہو چکے ہیں۔ زمانہ ان کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اقبالؔ کے مردِ مومن کے نظریے میں مردِ مومن زمانے پر حکمراں ہوتا ہے۔ کہتے ہیں:

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں، راکب ہے قلندر
کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق
اصل وقت از گردش خورشید نیست
وقت جاوید است و خور جاوید نیست
وقت ما کو اوّل و آخر ندید
از خیابان ضمیر ما دمید
خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری
نہ ہے زمان و مکاں لا الٰہ الا اللہ

اسی بنیاد پر انھوں نے مردِ مومن کا تعارف اس طرح پیش کیا ہے:

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان، نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
قدرت کے مقاصد کا معیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان

شیو جی اپنے جسم پر بھبھوت ملے رہتے ہیں جس سے مراد یہ ہے کہ جسم میں عبادت و ریاضت سے پیدا ہونے والی برقی شعاعوں کو عام نگاہوں سے چھپایا جائے۔ بہ الفاظ دیگر یہ عبادت میں خلوت کی مذہبی معنویت

ہے۔خلوت کی اہمیت پر ہر مذہب نے زور دیا ہے۔ حضرت عیسیٰ نے Worship secret کی تلقین کی ہے۔
اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں اقبالؔ نے بھی خلوت کی عبادت کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ کہتے ہیں:

اگر ہو شوق تو خلوت میں پڑھ زبورِ عجم
فغان نیم شبی، بے نوائے راز نہیں
نگہ الجھی ہوئی ہے رنگ و بو میں
خرد کھو گئی ہے چار سو میں
نہ چھوڑ اے دل فغانِ صبح گاہی
اماں شاید ملے اللہ ھو میں
مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو خلوت
کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

غرض یہ کہ اقبالؔ اپنے تصورِ مردِ مومن میں شیوجی کے افکار سے بھی متاثر رہے ہیں، لیکن ان افکار کو اسلامی تعلیمات سے بہرہ ور کیا ہے۔

☆☆☆

تھا خواب میں خیال

شکیلہ رحمٰن

یہ دیکھا کہ میں جا رہی ہوں کہیں۔ حد نظر تک ہرا بھرا سبزہ زار ہے۔ عجیب مگر دل فریب میدان۔ کیا ہے باغ جنت کا نمونہ ہے۔ روشنی ایسی کہ گویا سورج طلوع ہونے والا ہے۔ مناسب فاصلے پر بنے ہوئے پُرشکوہ مکانات ہیں۔ درختوں کے اقسام منفرد ہیں جہاں انار انگور ہیں وہیں سیب و آم بھی اخروٹ بھی ہرے بھرے میدانوں میں پیدل چلنے کے لیے تیار ہیں۔ گاڑیوں کی سڑکیں نہیں۔ مصفّی پانی کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی ہے۔ پانی کی آواز سے پیاس کا احساس ہوا۔ ابھی کسی منتظم کی تلاش میں نظریں اٹھائی ہی تھیں کہ ایک نوعمر صاحب زادے چمکتے ہوئے گلاس میں پانی بدست حاضر۔ پانی لطیف اور معطر عقل حیران۔ یا اللہ یہ کیا اسرار ہے۔ خیر جناب چلتی گئی۔

کافی دور کسی مجمع کا سا احساس ہوا۔ قدم بے ساختہ اسی طرف بڑھتے گئے۔ ذرا قریب جا کر انوکھا سماں نظر آیا۔ وسیع عریض تخت، ان پر مزین تخت پوش چاروں طرف گاؤ تکیے، نہ کرسیاں نہ فرشی نشست، تختوں کے درمیان مناسب فاصلہ کہ گر چلنا چاہیں تو دقت نہ ہو نہ اتنا زیادہ کہ آواز سنائی نہ دے کچھ کسی کے استقبال کا سا انداز ہے۔ پرچم نما جھنڈیوں پر تحریر ہے "چشمِ ما روشن دلِ ماشاد۔" میں حیران ہو کر اِدھر اُدھر دیکھتی ہوں۔ کچھ دیکھے ہوئے چہرے نظر آ رہے ہیں۔ مگر بصورتِ تصویر گویا نگار خانہ مانی و بہزاد میں جانے بوجھے حضرات متمکن ہیں۔ خندہ زیرِ لب کے ساتھ تبادلۂ خیال بھی جاری ہے۔ اقبالؔ، مجازؔ، منٹو اپنی تصاویر سے اور فیضؔ صاحب اپنی ذات سے پہچانے گئے۔ ایک تخت پر کچھ خواتین بھی فروکش ہیں مگر ماسوائے چند خواتین کے میں اور کسی کو پہچان نہ سکی۔ ایک اور وسیع و عریض تخت پر تشریف فرما حضرات کے لباس ان کی بزرگی کا احوال سناتے ہیں۔ جو صرف کتابوں میں پڑھا پہنے ہوئے نہ دیکھا۔ ارے یہ تو خدائے سخن میر تقی میرؔ اور

خواجہ میر دردؔ، واہ یہاں تو کلاہ پاپاخ کو زیب سر کرنے والے کہ جن کے نام نامی سے دنیائے اردو کی پوری صدی عبارت ہے۔ یا اللہ یہ میں کہاں آ گئی۔

اچانک ایک جانب سے مدھم سی چاپ سنائی دی۔ سب اہل محفل کی نظریں اس طرف ہوئیں۔ قریب آنے پر دیکھا یہ تو مشفق خواجہ صاحب ہیں۔ اہلِ مجلس کے چہروں پر آسودگی اور مسرت نظر آئی جو کہ انتظار کے کٹھن لمحات کے بعد دکھائی دیتی ہے۔ ایک طرف سے آواز آئی، ''بڑی دیر کی مہرباں......'' خواجہ صاحب اس تخت کی طرف بڑھے جس پر شاعرِ مشرق تشریف فرما تھے اور ان کے قریب بیٹھے ہوئے ایک صاحب کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ ان صاحب نے کمر پر ہاتھ رکھا پھر سر اور چہرے پر اور آنکھ سے ہلکا سا اشارہ کیا۔ اب موصوف اس طرف متوجہ ہوئے جن کے چہرے تو جانے بوجھے تھے۔ لیکن لباس اجنبی سا تھا۔ یہاں الفاظ نہیں میرا احساس رہنمائی کر رہا تھا۔ غالباً خواجہ میر دردؔ نے ہلکی سی جنبش کی تخت پر فروکش حضرات اشارہ پا کر سمٹے اور نشست کی جگہ نکل آئی۔

ایک طرف سے آواز آئی کہ یہاں وقت کا وہ پیمانہ تو نہیں جو زمین پر ہے، مگر پھر بھی ہمارے آپ کے درمیان یہ فاصلہ کیوں کر ہوا۔ مشفق صاحب۔ بجا فرمایا آپ نے یوں تو ہم سب جانتے ہیں کہ فیصلہ قادرِ مطلق کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن میں آسمانوں کی سیر میں ایسا منہمک ہوا کہ آپ حضرات آگے نکل گئے اور غالباً بلکہ یقیناً قضا قدر کے فیصلہ میں یہ حکمت بھی پوشیدہ ہوگی کہ آپ لوگوں کی فکر اور سوچ کے ساتھ جدید دنیا کو دیکھوں جو آپ حضرات کے تصورات سے بھی کہیں آگے ہے اور پھر اسی فکر اور انداز کے ساتھ روز و شب بسر کروں اور یہاں آ کر اپنا حالِ دل آپ جیسے اساتذہ کرام کی خدمت میں پیش کروں جن کی کاوشوں سے دنیائے ادب شاداب ہے۔ کیونکہ میں نئی دنیا سے آیا ہوں۔ جہاں پرانی اقدار جاں بلب ہیں۔ اگر کوئی بات خلاف خاطر ہو تو معافی کا طلب گار ہوں۔

یوں ڈھونڈتا ہوں نقشِ قدم ہائے رفتگاں
پیچھے بچھڑ گیا ہوں کسی کارواں سے میں

آج کی اس محفل میں اپنی تحریر کا ذکر نہ کروں گا گو کہ وہ حصہ نظم سے کہیں زیادہ ہے۔

لیکن اس دنیائے آب وگل میں اپنی ذات اور محسوسات کے اظہار کے لیے مجھے نظمیہ اظہار زیادہ محفوظ نظر آیا۔ گو کہ باریک بین نظروں کے لیے تو ع قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا۔

میں گوشہ نشیں رہ کر خدمت ادب میں مصروف رہنا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس مجلس میں شامل رہ کر بھی تب وتاب مجلس سے دور رہا اور میں نے اس شعر کو اپنی زندگی کا ماخذ مان لیا ۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

سوملاحظہ کیجئے کتاب ''ابیات'' کا دیباچہ ۔

یہی غزل مری محرومیوں کا نوحۂ غم
یہی غزل مرا آئینۂ جمال بھی ہے

جو پا سکا نہ تجھے میں تو کھو دیا خود کو
یہ میرا عجز بھی ہے یہ مرا کمال بھی ہے

ابھی یہ قطعہ ختم ہی ہوا تھا کہ ایک طرف سے ایک صاحب آتے نظر آئے۔ چہرے بشرے سے نوعمر تو نہ تھے لیکن استادانِ فن میں بھی شمار نہ تھا۔ چہرہ مسرت سے کھلا ہوا تھا۔ بغل گیر ہونے کا تو موقع نہ تھا کہ آداب محفل کے خلاف تھا۔ لیکن حاضرین محفل اشارہ پا گئے۔ ان کے لیے نشست کی جگہ نکالی گئی۔ نو وارد غالباً سعید صاحب ہیں جن کی اچانک عدم آباد روانگی پر خواجہ صاحب کا دل دو نیم ہو گیا تھا۔ مگر صبر وضبط اور بلند حوصلگی سے ان تمام مراحل کا انتظام کیا جو ان کے جسد خاکی کو بھاولپور ان کے آخری مسکن بھیجنے کے لیے ضروری تھا۔ بلکہ ان کی والدہ سے تعزیت کے لیے بھی تشریف لے گئے۔

جی تو صاحبان عالی مقام میں آپ کی توجہ ان ابیات کی طرف دلانا چاہتا ہوں جن میں اپنے احساسات کو میں نے خود محدود کر لیا تھا۔ ان حالات میں جب اقدار کا توڑنا ہی اقدار بن

جائے۔ اپنی ذات میں تنہا ہو جانا آپ اپنا منصف بن جانا مجھے زیادہ پرسکون محسوس ہوا۔ چالیس سے زیادہ کتابوں پر دیباچے لکھے۔ مگر اپنی کتاب کا دیباچہ آپ ہی لکھ لیا۔ کتابوں سے عشق میں ان کی تعداد بڑھتی گئی سو رہائش مختصر کرتا گیا۔ خود کو محدود رکھنے کا ایک جگہ اعتراف بھی کی ہے۔

پہلے ہی تازہ ہوا آتی تھی کم
گھر کی دیواروں کو ہم نے اور اونچا کر لیا

داخلی در کے سامنے ہی لکھ لیا تھا خود کو انتباہ کرنے کے لیے

اس سرا میں نہیں قیام بہت
زندگی مختصر ہے کام بہت

اجتماعی اور قومی زندگی کے مسائل تو آپ کے ادوار میں بھی کم نہ تھے۔ مگر روشنی کی کرن نظر نہ آتی تھی۔ افراتفری اور بدحالی برسہا برس مسلط رہی۔ بارے کچھ نئی سوچ اور فکر کی راہیں نظر آئیں جو ہیں تو ابتدائے آفرینش سے مگر نظروں سے اوجھل تھیں۔ سو آپ کے ہی زمرے کئی ایک عالی مقام اٹھے اور زندگی میں آب و تاب کی لہر دوڑانے کی کوشش کی لیکن۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

تو اس بے حسی اور بے نوائی کے عالم میں اور کیا کہنا سوائے اس کے

رہ گزر دل کی نہ پل بھر کو بھی سنسان ہوئی
قافلے غم کے گزرتے رہے اکثر کیا کیا

اور یہ کہ

ہر گزرتے ہوئے لمحے سے یہی خوف رہا
حسرتوں سے مرے دامن کو یہ بھر جائے گا

ملاحظہ فرمائیے:

شدتِ غم سے ملا زیست کو مفہوم نیا
ہم سمجھتے تھے کہ دل جینے سے بھر جائے گا

گزر رہی ہے غنیمت ہے زندگی مانا
مگر یہ ایک ہی انداز سے گزرنا کیا

یہ ایک مختلف جذبے کا اظہار ہے۔

وفا کے باب میں اس سے تو کچھ کمی نہ ہوئی
میں آپ اپنی خوشی سے یہ بازی ہار گیا

صاحبانِ ذی وقار

میری شاعری عصر حاضر کی انسانی واماندگی کا اظہار ہے۔ جہاں سب کچھ ہے بھی اور نہیں۔ میرا محبوب انسانی صفات سے متصف ہے مگر پا بجولاں ادھر میں اپنی ذات کے طلسم میں اسیر۔

اس دشتِ بلا میں کہ جہاں ہے گزر اپنا
جز سایۂ غم کوئی نہیں ہم سفر اپنا

ساتھ کچھ دور چلا دولتِ دنیا کی طرح
پھر مجھے چھوڑ گیا نقشِ کفِ پا کی طرح

خواب آنکھوں میں ہیں بن برسی گھٹائیں جیسے
اور آنکھیں کسی تپتے ہوئے صحرا کی طرح

محفل پر خاموشی طاری تھی سوائے سحر انگیز سکوت کے۔ استادانِ فن نظروں سے ہی داد تحسین دے رہے تھے۔ ایک دل نشین آواز کی ہلکی سی گونج تھی اور اہالیانِ محفل سراپا گوش۔

کبھی پیغامِ سکوں تیری نظر نے نہ دیا
زندگی چھین لی اس طرح کہ مرنے نہ دیا

اب امیدیں دلِ تنہا میں نہیں
سائے کا نام بھی صحرا میں نہیں

اے خدا تجھ سے نہیں شکوہ کوئی
میں ہی شاید تری دنیا میں نہیں

توجہ چاہتا ہوں

یہ بجلی کیا ہے خداوند آسمان زمین
ہر ایک سمت ہے تو اور میں کہیں بھی نہیں

شاعرِ مشرق کی ستائش بھری نظریں اٹھیں۔ مشفق صاحب گویا ہوئے

اسی لیے نہ کیا تلخیٔ جہاں کا گلہ
ترا خیال پسِ پردہ مسکراتا تھا

وہ کون تھا جو گیا ہے اداس کر کے مجھے
وہ کون ہے جو مجھ میں اداس رہتا ہے

ملاحظہ فرمایئے

عاشقی کشمکشِ مرگِ مسلسل ہی سہی
زیست کرنے کا سلیقہ تو سکھا دیتی ہے

اور یہی مضمون پھر اس طرح باندھا

تم سے نہیں کوئی شکایت مگر یہ بات
تم نے بڑھا دیئے ہیں خیالوں کے حوصلے

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں

نہ ملا کچھ بھی سکوں بزمِ تصور میں ہمیں
طالبِ سجدہ یہاں بھی ہے خدا ایک نہ ایک

اپنی نارسائی کا اظہار

جس کی باتوں کی مہک میری غزل میں آئی
جب وہ آیا تو کوئی شعر سنایا نہ گیا

اے تلخیٔ ہجراں کے سموئے ہوئے لمحوں
کیا کوئی بھرے شہر میں غم خوار نہیں ہے

صحرا میں تو دیوار ہوتی ہی نہیں مگر میں تو آبادی میں بھی تنہا رہا۔
اس خرابات میں وقت گزارنے کی روداد سنیے:

حیات مرگِ مسلسل کا نام ہے شاید
وگرنہ کس میں یہ ہمت ترے بغیر جئے

خیر میں تو اسی قابل تھا مگر یہ تو بتا
زندگی! کیا تو کسی کو کبھی راس بھی آئی؟

میں تو اپنی مسکراہٹ سے بھی ڈرتا رہا

مسکراتا ہوں بات بات پر میں
یہ کسی غم کی ابتدا تو نہیں

ادھر صورت حال یہ بھی تھی

ہم نے چاہا تھا کہ دنیا سے کنارہ کر لیں
ہم نے دیکھا تو ہم ہی رونقِ دنیا نکلے

کیا سناؤں آپ کو سوزِ دروں کی داستاں

ہم کو اک عمر نہ جینے کا سلیقہ آیا
ہم نے اک عمر تمناؤں کے دھوکے کھائے

آپ جیسے سطور اور بین السطور دیدہ ہیں کے سامنے کیا عرض کروں اگر نیرنگئ زمانہ کی داد ستد نثر میں رقم کرتا تو ناگفتہ بہ مسائل کا شکار ہو جاتا۔ اشعار اپنے حال احوال لیے مناسب نظر آئے سو تسلیم کی خو ڈال لی۔

ایک اچٹتی ہوئی نظر ابن انشا کی طرف ڈالی اور کہا آپ جیسے نکتہ رس مزاح نگار کو کہنا پڑا۔

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

دیارِ غیر میں مکان کا کرایہ بند۔ ہسپتال کا بل ندارد۔ اب اگر میں یہ نہ کہتا تو کیا کرتا۔ میں خوف زدہ تو نہ تھا لیکن صحیح نتائج کی توقع ہوتی تو حوصلے کی کمی نہ تھی۔

ہم گدایانِ رہِ شوق سراپا دل تھے
دیکھنے والے نے افسوس کہ سمجھا نہ ہمیں

یا

شہرِ طرب کے ساکنو! مجھ سے کنارہ کش ہو کیوں
میری نگاہ میں تو اب کوئی سوال بھی نہیں

نگہِ لطف کرم فرمایئے گا

ناز فرما تھے ہم ارزانیِ دل پر کیا کیا
نگہ لطف خریدار نے پوچھا نہ ہمیں

نظریں اٹھا کر دیکھا پھر پڑھا

دل کا لہو آنکھ سے بہا ہے
کاغذ پہ جو حرف بولتا ہے

میں نے عرض کیا تھا کہ پرانی اقدار اب جاں بلب ہیں۔ مشاعرے جو تہذیب اور ادب سکھانے کا ذریعہ تھے اب محفل رنگ وطرب ہیں۔ شائستگی کا مظاہرہ بھی کم کم ہے۔ میں نے اپنا کہا خود ہی پڑھا مشاعرے کا منت کش نہ ہوا۔ ہاں طبع ضرور کرا دیا کہ اوراقِ پارینہ کی طرح ضائع نہ ہو۔

صاحبانِ ذی جاہ میری ذات احساسات کا پرتو میرے اشعار ہیں۔ مگر پھر وہی بات آ گئی کہ اظہار کیوں؟ کس کے لیے؟ اپنے اندر کے شاعر کو نثر کی طرف متوجہ کر لیا۔ اور جو بھی خدمت ادب بن پڑی کرتا رہا۔ اب یہ نذر عالی مقام ہے۔ کرم کی امید اس ذات بے ہمتا سے ہے۔

فقیر گوشہ نشیں اپنی ذات میں گم ہے
اب ایک اور ہی عالم نظر میں رہتا ہے

آواز کی گونج تھی اور زیاں ہی زیاں تھا

کیا کہوں حالِ درد پنہانی
وقت کوتاہ قصہ طولانی

☆☆☆

خصوصی مطالعہ

''زوال سے پہلے'' کا نقطۂ عروج

خواجہ منظر حسن منظر

شمیم منظر ایک اچھے افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ''تنہائی کا ایک دن'' طبع ہو کر خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔ ان کا حالیہ ناول ''زوال سے پہلے'' اپنے موضوع کے لحاظ سے ایک منفرد ناول ہے۔ میرا ناول کا مطالعہ کچھ زیادہ وسیع نہیں لیکن جو بھی ہے اس کا تاثر مختلف رہا ہے۔ میرے ذہن میں ناول کا ہر فرد ایک منفرد کردار ہوتا ہے۔ ہر ایک کی پسند ناپسند الگ، بول چال، بود و باش، طرزِ گفتگو، طرزِ آمیزش الگ، گویا ہر کردار ایک جیتا جاگتا انسان ہے جو اپنے مخصوص انداز میں تمام دوسرے کرداروں کے ساتھ مل کر ایک ماحول، ایک ارتباط، ایک بود و باش کے ساتھ مختلف کہانیوں کو جنم دیتا ہے جو ایک دوسرے سے مربوط ہوتی ہیں اور یہ کہانیاں جب اپنے نقطۂ عروج پر پہنچتی ہیں تو ایک ناول کی شکل اختیار کر کے اختتام پذیر ہوتی ہیں۔ ناول میں ہر کردار کا ایک علاحدہ وجود ہوتا ہے۔ وہ ایک گوشت پوست کا انسان دکھائی دیتا ہے اپنی اپنی نفسیات کے ساتھ۔ لیکن اس ناول میں کردار صرف ایک ہے۔ ایک بسترِ مرگ پر پڑا فرد جس کی تمام قوتیں تقریباً سلب ہو چکی ہیں، صرف احساس باقی ہے، جس کے متعلق معالج کا خیال ہے کہ ''مصیبتیں جن کے ہونے سے ایک طرف زندہ رہنے کا احساس تو دوسری طرف زندہ رہنے کا دکھ ہو تو ان سے چھٹکارا پانے کے لیے احساس کا مر جانا ہی بہتر ہے۔'' وہ ایک ایسا فرد ہے جو صرف اپنے ماضی میں زندہ ہے جو اپنی سوچ سے بے حس و حرکت کرداروں کو جنم دیتا ہے، جن کی اپنی کوئی انفرادیت نہیں ہوتی۔ ماضی میں جن لوگوں سے اس کا واسطہ رہا ہے انھیں سامنے لاتا ہے۔ ان کے خوب و زشت، ان کے حسن و قبح اور ان کے مثبت و منفی پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے اور اپنے فکر و عمل کی روشنی میں انھیں پرکھتا ہے، خواہ وہ حامد ہو، صائمہ ہو، برائن ہو، اُرسلا ہو یا کوئی اور۔ وہ حامد نہیں ہوتا، صائمہ نہیں ہوتی، بلکہ ان کا ہیولا ہوتا ہے جو اس کے خیالات میں ہلچل پیدا کرتا رہتا ہے۔ شمیم منظر اس تصنیف کو ناول کہتے ہیں۔ شاید صحیح ہو۔ میں اسے طویل افسانہ کہنا زیادہ مناسب سمجھتا ہوں جس میں انھوں نے مارکسزم کا پول کھولا ہے۔ اس تحریر کے کئی پہلو ہیں۔ ایک تو وہ افراد ہیں جو اس کے خیالات میں بسے ہوئے ہیں اور سوچ کے ساتھ ساتھ سامنے آتے ہیں۔ دوسرا اس کا زندگی کے بارے میں اپنا ایک تصور ہے۔ مذہب سے بیزاری، اپنے گرد و پیش سے بے اطمینانی اور معاشرے کی ناہمواری سے بغاوت۔ اگر اس کو اطمینان ملتا ہے تو مارکسزم کے افکار سے، دنیا کو سرخ دیکھنے کے تصور سے۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ مارکسزم اپنی جائے مولود میں کس قدر کامیاب ہے۔ اس نے وہاں کس حد تک افراد میں مساوات پیدا کی

ہے۔ کس حد تک معاشرے کی ناہمواری دور کی ہے اور کتنی دودھ اور شہد کی ندیاں بہائی ہیں جن کا اس کے تصور میں وجود ہے۔ وہ جب مشرقی جرمنی جاتا ہے تو حقیقت اس کے سامنے آتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ ''مشرقی جرمنی میں نظریاتی حکومت ہے۔ پرولتاری نظام اس دھرتی پر بسے لوگوں کا موقف ہے ۔۔۔۔ اگر پرولتاری نظام کامیاب ہے تو بورڈر پر اتنی سختی کیوں ہے ۔لوگ وہاں سے بھاگ کر مغربی جرمنی کیوں آجاتے ہیں ۔۔۔۔ مغربی جرمنی نے مشرقی جرمنی سے زیادہ ترقی کی ہے۔ کیوں؟ مشرقی جرمنی میں سوشلزم کے باوجود آزادیٔ اظہار نہیں۔ کیوں؟'' مغربی جرمنی جانے سے قبل اسے صائمہ کی یہ بات کہ ''ایک طرف تو فلسطین کی بات کرتے ہو، یہودیوں کو گالیاں دیتے ہو اور پھر یہودی نظریہ کو خدائی احکام سمجھتے ہو'' اسے قائل نہیں کر پاتی۔ وہ صائمہ کو ایک سرمایہ دار کی بیٹی کا طعنہ دیتا ہے اور اپنے ملک میں ایک سوشلسٹ حکومت کے قیام کے پس منظر میں وہ کہتی ہے: ''ہاں ہوں اور میرا باپ تمہارے ہیرو کو پوجتا ہے کیونکہ تو میائی بہانے والی ملوں کے لیے باہر سے مشینیں منگانے کا ٹینڈر حاصل کر کے وہ اور امیر بننا چاہتا ہے۔ تمہارے ہیرو کے ارد گرد تمہارے جیسے نظریاتی لوگ نہیں ہیں بلکہ انسانیت کو کچلنے والے بھیڑیے ہیں'' اپنے وطن میں صائمہ نے اور مغربی جرمنی میں ہیلگے نے اسے آئینہ دکھایا:

''تم ایک بھولے انسان ہو جو خواب کو سچ سمجھ کر اس کے پیچھے بھاگتا ہے۔ ایک انسان جو سوشلزم کو صحیح سمجھ کر روس کو اپنا کعبہ سمجھتا ہے۔ ایک اندھا جو دیکھ نہیں سکتا ہے ایک احمق ، جو حقیقت سے بہت دور خوابوں کے جزیرے میں رہتا ہے۔ یہ ہو تم۔''

اس ناول کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ شاہد اپنی فکر، اپنے نظریہ سے مخلص رہتے ہوئے اپنی گھریلو ذمہ داریوں سے پہلوتہی نہیں کرتا اور کمٹمنٹ (پابندی) کے ساتھ ان ذمہ داریوں کو نبھاتے ہوئے اپنی صحت کی بھی پروا نہیں کرتا، مغربی جرمنی میں کئی شفٹوں میں کام کرتا ہے۔ بہنوں کی شادیاں جن کے لیے قیمتی جہیز کی فراہمی ضروری ہے، فراہم کرتا ہے۔ بہنوں کی شادیاں ہو جاتی ہیں۔ وہ مغربی جرمنی جاتا ہے مزید تعلیم کے لئے لیکن تعلیم مکمل نہیں کر پاتا۔ اسے والدین نے جو ذمہ داری سونپی ہے اسے پورا کرتا ہے اور اس کوشش میں وہ ملک واپس آ کر ہسپتال پہنچ جاتا ہے اور موت کی آغوش میں جانے کے دن گنتا ہے۔

اس ناول کا مقصد مارکسزم کا پول کھولنا ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ سوشلزم اپنے بلند بانگ دعووں کے باوجود ناکام ہے۔ سرمایہ داری اور آمریت اپنے دوسرے انداز میں کمیونسٹ معاشرے میں موجود ہے، اس حد تک کہ سوچ پر بھی پابندی ہے۔ یہی اس ناول کا نقطۂ عروج ہے۔ بقول اے خیام: ''شمیم منظر نے مارکسی نظام کے کھوکھلے پن کو اجاگر کیا ہے۔''

میں شمیم منظر کو ایک اچھوتے انداز میں کمیونزم کا پول کھولنے پر مبارکباد دیتا ہوں اور ان کے ناول ''زوال سے پہلے'' کا خیر مقدم کرتا ہوں۔

☆☆☆

ریاض لطیف کی شاعری

(معروضیت سے سرّیت کی طرف)۔ ایک مرتکز جائزہ

عبدالاحد ساز

ریاض لطیف کا اوّلین شعری مجموعہ ''ہندسہ بے خواب راتوں کا'' خاصی تاخیر سے منظرِ عام پر آیا ہے۔ اردو شاعری بھی انھوں نے دیر ہی سے شروع کی۔ شاید اس لیے بھی کہ ان کی مادری زبان گجراتی ہے اور ان کا ذریعۂ تعلیم انگریزی رہا۔ اردو زبان و ادب کا اکتساب ان کے شوق و رغبت اور وابستگی و ریاضت کا ثمرہ ہے۔ اس ضمن میں قابلِ قدر امر یہ ہے کہ گو کہ بطور شاعر وہ دیر سے سامنے آئے مگر ان کی شاعری ابتدا مخصوص شعری نشستوں اور خال خال رسائل میں اشاعت کے ساتھ ہی اہلِ نظر قارئین و ناقدین کو اپنی جانب متوجہ کرنے لگی تھی۔

ایک بات جو پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے اور جسے عام مروج فروعی معنوں میں نہ لیا جانا چاہیے وہ یہ کہ یہ شاعری ایک بالکل مختلف پیرائے کی ہے۔ ریاض لطیف پیشے کے اعتبار سے معمار و مہندس اور دل و نگاہ سے شاعر ہیں۔ اشیاء اور منظر کی ماہیت اور تکوین کو مہندس کے خارجی علم و منطق کے حوالے سے اخذ کر کے، اسے شاعر کے باطنی فکر و وجدان سے گزارتے ہوئے جہانِ معنی کی سیر کو نکل جانا ان کا شعری وطیرہ ہے۔ پوری شاعری معروضیت سے رمزیت کی طرف ایک تخلیقی سفر ہے۔ اس سفر کے زمینی مراحل میں جہاں علم و دانش اور تاریخی و تہذیبی شعور زادِ راہ بنتے ہیں وہاں پرواز کے مرحلے میں سرّیت، ایمائیت اور داخلی محسوسات رختِ سفر ہوتے ہیں۔ اس عمل کو ان کی بہتیری نظموں اور غزلوں میں دیکھا جاسکتا ہے، مثلاً تاریخ و عمرانیات کی قطعیت میں وقت کے ایمائی پس منظر کی شمولیت کو ان کی نظم ''گردش'' کے اس حصے میں بہ خوبی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے:

بہت آگے......

رو پہلے پانیوں میں گنگناتے اوم سے آگے

کبھی ویدوں میں بیٹھے آسمانی رنگ سے آگے

حسیں اہرام کے دل پر منقش

بے خبر تحریر سے آگے

وہ پلیٹو کی زباں مثلِ صبا

یونان کے ہر اک ستوں

ہر دیوتا کو بے کراں کرتی ہوئی......

ارے وہ ارقیمتس کے ساز کے جادو سے آگے

اجڑتی ختم ہوتی، پھر سنورتی

لاکھوں تہذیبوں سے آگے

فنا کے راز کے محرم مرے اجداد سے آگے

سوالوں کی ہر اک بنیاد سے آگے......

یہ دنیا گھومتی ہے کیوں کسی انجان محور پر؟

فلک کا رنگ نیلا کیوں؟

اگر ایٹم کی ہو تقسیم تو آفاق مل جائیں؟

جہت کس نے بنائی ہے؟

یہ لمحے کس لیے بہتے نہیں اُلٹے؟

محبت کس لیے مایوس کرتی ہے؟

اُداسی دور کر سکتا ہے کمپیوٹر؟

یہ تنہا کس لیے ہوتے ہیں سب اتنے؟

یہ سفر ظاہر ہے طویل تو ہے ہی، اس کی بساط بھی عریض اور پُر پیچ ہے اور اس کا آکاش بھی پرت پرت ہے۔ عمرانیات اور وجودیت اس سفر کے دو اہم نشیب و فراز ہیں جن سے قاری کو جا بہ جا سابقہ پڑتا ہے۔ غزلوں کے ان متفرق اشعار پر غور کیجیے جن میں وجود کے استفہامیے بھی ہیں، موروثیت کے کنائے بھی اور ارتقا کے رمزیے بھی:

رگوں کی اندھی گپھا سے آیا، عجیب رنگوں کو ساتھ لایا | قدیم روحوں کا ایک جذبہ یہاں تک آ کر پلٹ گیا ہے

خون میں دنیا تسلسل کی بسا دیتا ہے کون | بانٹتے جنموں تمھیں سرمایہ دیتا ہے کون

اب اس جنم میں اور کرنا ہے کیا؟ | نفی کے نئے استعارے تراش

کئی مسمار دنیاؤں کا مجھ میں گھر تھا لیکن | میں اپنے سانس کی دھرتی پہ یتیم ہونہ پایا

سنگ در سنگ نمودار ہوئے سناٹے | ہم ترے نام کی دیوار سے ٹکرائے تھے

اپنی رموز و اسرار سے پُر مفاہیم کو تاریخی جمال کے پس منظر میں ابھارتی ہوئی اس مجموعے کی ایک اہم نظم ''بنارس'' کا ابتدائی حصہ بھی قابلِ غور ہے:

بھٹکتی ہوئی وقت کی آتما میں

ترے گھاٹ کے پتھروں کی زباں سے
یگوں کی صداؤں کی صورت اُبھر کر
گھلی جارہی ہے تجھے پانیوں میں
تری سانس کی شاہراہوں پہ پھوٹی
وہی تنگ گلیاں، وہ گلیوں میں گلیاں
کہ جیسے رگوں کا بُنے جال کوئی
جہاں لاکھ بھٹکو، نہ کوئی سفر ہو
سفر فاصلہ ہے، سفر مرحلہ ہے
یہیں پر بقا ہے، یہیں پر فنا ہے

زمان ومکاں کے ابعاد میں عصرِ حاضر کے ارتکاز کو سمجھنے کی ایک کوشش کو جس میں سیاسی ومعاشرتی فہم بھی پورے کرب کے ساتھ جذب ہورہی ہے، ایک بلیغ وجمیل فنی اظہار ہے" ایک نیوکلیئر نظم" کی شکل میں ملاحظہ کیجیے:

جہاں کو پھر بتائیں گے
سمندر بھاپ بن کر کس طرح اڑتے ہیں آنکھوں سے
بدن شق ہوتے ہوتے کس طرح پاتال بنتے ہیں
نفس کے شہر کیسے ریزہ ریزہ خاک ہوتے ہیں
مساموں سے اُبل کر آسماں کیسے سلگتے ہیں
عدم مشروم بن کر کیسے خلیوں سے ابھرتا ہے
کہ اکھڑی ارتقا کی بوند میں سرشار یہ پتلے
ہمارے دو جہانوں کا مقدر سوچنے والے
انھیں بونوں کی خاطر لائے ہیں اب ہم سکوت اپنا
کہ ہم خاموش بیٹھے ہیں
کہ لرزاں ارتقا کے رُخ پہ پردہ ڈالتے ہیں ہم
کہ اب بھی روح سے ہیروشیما کھنگالتے ہیں ہم

ایسا بھی نہیں کہ ریاض لطیف کی شاعری وجودیت کے گہرے شیڈس کی وجہ سے منفیت (Nihilism) سے منسوب ہو کر رہ گئی ہو۔ سرّیت کے دھندلکوں میں کئی روشنی کے دھبے ہیں جن سے اثبات کی شعاعیں چھنتی دکھائی دیتی ہیں۔ اسے ہم عقیدے یا نظریے سے جوڑ کر نہ دیکھیں۔ شاعر کی تحیر وتجسس، تلاش و

انکشاف اور سہو سراغ سے گزرتی ہوئی داخلی فکر ہی کی رسائیاں ہیں۔ اس رو سے غزلوں کے بعض اشعار کو بہ نگاہِ توجہ دیکھا جانا چاہیے:

نہ میں ہوا ہوں، نہ ہو سکوں گا محیط خود پر — مری نفی خود کرے گی مرا پتہ نمایاں

جو ہم میں مسمار ہو چکا ہے، اسی سے تعمیر ہے ہماری — عدم کے پتھر تراش کر ہی ابد کی محراب ہم ہوئے ہیں

جو چھو کے دیکھو تو گردش کی تہہ میں گردش ہے — دھروں جو کان تو محور سنائی دیتا ہے

اور اس نظم کو بھی مدِ نظر رکھنا چاہیے جس کا عنوان ''تو'' ہے، جو اس مجموعۂ کلام کی پہلی ہی نظم ہے اور جو ایک بالکل مختلف زاویے سے حمد کا سا پیرایہ لیے ہوئے:

ہر طرف
رنگِ رواں
سرخ، نیلا
زرد، کالا
بحر
آمیزش
خلا!
اتنا کچھ ہوتے ہوئے بھی
کچھ نہ ہونے کی ادا
بے کراں......!

ریاض لطیف کی پوری شاعری میں کئی الفاظ جا بہ جا اور متوازی نظر آتے ہیں۔ محراب، دیوار، مسمار، حصار، تعمیر، تمدن، گنبد، گپھائیں، گلیاں، وجود، کھنڈر، دوام، ابد، سفر، سمندر، کنارا، بھنور، خلا، گونج، سیارے، بدن، دراڑ وغیرہ۔ ترسیلی ترجیحات کے مختلف رنگوں اور لہریوں میں چمکتے ہوئے ان نقطوں کو قاری اگر اپنے اندازِ تفہیم کی لکیروں سے جوڑ کر ایک کولاج مرتب کرلے تو ایک خاکہ سا بننے لگتا ہے اور ایک معنوی اکائی بھی ابھرنے لگتی ہے۔ پھر یہ شاعری جو ابتدائی قراءتوں میں کچھ پیچیدہ و ژولیدہ سی معلوم ہوتی ہے مبہم نہیں رہ جاتی۔ شاعر کے ادراک سے اظہار تک پہنچنے والی خمیدہ پگڈنڈیاں ایک دوسرے سے مربوط ہو کر اصل رہ گزر کا پتہ دینے لگتی ہیں۔

ریاض لطیف کی اس شعری تصنیف ''ہندسہ بے خواب راتوں کا'' کو وہ قارئین ادب یقیناً بے حد پسند کریں گے جو زندگی کے سائنسی حقائق اور تاریخی شواہد کو انسان کی مابعد الطبیعاتی فکر اور داخلی احساس سے آمیز اور انگیز کر کے قبول کرنے کی ترجیحات رکھتے ہیں۔

☆☆☆

اقبال مجید کا افسانہ "پیٹ کا کیچوا"

طارق چھتاری

یہ حقیقت ہے کہ ترقی پسند تحریک کے بعد جدید رجحان نے اردو افسانے پر گہرے اثرات مرتب کیے، لیکن اگر ہم اردو میں کی گئی جدیدیت کی تعریف اور جدید ناقدین کے فیصلوں کو نظر انداز کر کے جدید افسانے کے متن پر غور کریں تو ہمیں یہ نتیجہ اخذ کرنے میں دشواری نہیں ہوگی کہ جدیدیت دراصل ترقی پسند تحریک کی توسیع یا جدید شکل ہے۔ اس لیے کہ جدید افسانہ نگاروں نے ہیئت اور تکنیک کے تجربے تو ترقی پسندوں کے مقابلے میں زیادہ کیے مگر ان کے نظریات میں کوئی واضح اور بڑی تبدیلی نہیں ہوئی۔ مثلاً بلراج مین را ہوں یا انور سجاد اور سریندر پرکاش ہوں، ان کی بیشتر تخلیقات میں انسان کے دکھ درد کا بیان، سماج سے اس کا رشتہ یا ظلم و استحصال کے خلاف ردِ عمل موجود ہے۔ کیا کوئی ادیب، وہ ترقی پسند ہو یا جدید Anti human یا Anti social ہو سکتا ہے؟ جہاں تک نئی تکنیک کے استعمال اور ہیئت کے تجربوں کا تعلق ہے تو جدیدیت کے آغاز سے بہت پہلے کرشن چندر Form کے مختلف تجربے کر چکے تھے۔ بلکہ ترقی پسند تحریک کی ابتدا ہی ہیئت کے تجربوں سے ہوئی تھی۔ شعور کی رو، آزاد تلازمۂ خیال، پلاٹ کی روایتی تشکیل سے انحراف، حقیقت نگاری کے سطحی تصور سے گریز اور کرداروں کی خارجی تصویر کے بجائے داخلی صورتِ حال کی عکاسی جیسے عناصر کا تعارف سجاد ظہیر اور احمد علی نے سب سے پہلے کرایا۔ یہ الگ بات ہے کہ چند ترقی پسند ناقدین مذکورہ بالا عناصر کو جدید افسانے کے مخصوص عناصر تلاش کرتے رہے اور شاید اب بھی کرتے ہیں مگر نئے ترقی پسند افسانہ نگار کبھی اپنی تو کبھی دوسرے کرداروں کی ذات کے حوالے سے انسان کے داخلی گوشوں کو تلاش کرتے ہیں اور انسانی ذات کی گہرائی میں ڈوب کر اندرونی مسائل پر افسانے لکھتے ہیں۔ انھیں جدید افسانہ نگاروں کی طرح The other یعنی دوسری ہستی سے گہری دلچسپی ہوتی ہے اور کبھی کبھی تو "کردار سے کہیں زیادہ اس کی پرچھائیں Haunt کرنے لگتی ہے اور وہ خود سے سوال کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ یہ پرچھائیں کون ہے؟ اس کا کردار سے کیا رشتہ ہے اور کہیں ایسا تو نہیں کہ اصل کردار یہی پرچھائیں ہو؟" (وزیر آغا)

اقبال مجید کا افسانہ "پیٹ کا کیچوا" بھی ایک ایسا ہی افسانہ ہے جس میں روایتی بیانیہ اسلوب کی بجائے اپنی ذات کو دو حصوں میں تقسیم کر کے داخل و خارج کے تصادم کو پیش کرنے کی خاطر تمثیلی اسلوب اختیار کر

گیا ہے۔ اقبال مجید کے اس ایک افسانے میں ذات کا کرب، مادیت اور روحانیت کا تضاد، فرد اور سماج کا رشتہ اور تنہائی کا مسئلہ جیسے کئی موضوعات یکجا ہو گئے ہیں۔ اگر ہم جدید نقطۂ نظر سے اس افسانے کا مطالعہ کریں تو اس کی تکنیک خاص توجہ کا مرکز بنے گی۔ افسانے کا راوی واحد متکلم ہے مگر اقبال مجید نے Split personality کی تکنیک کا سہارا لے کر واحد متکلم کے monologue کی جگہ دو کرداروں ''وہ'' اور ''میں'' کے Dialogue کے ذریعہ داخلی کشمکش کو ظاہر کیا ہے۔ یہ دونوں کردار مرکزی کردار کی ذات کے دو پہلو ہیں۔ ایک وہ خود، جو لمحۂ موجود میں جی رہا ہے اور ایک نظریے کے تحت زندگی کا واضح تصور رکھتا ہے، دوسرا اس کی ذات کا وہ حصہ ہے جو روایتی سماج، مذہبی رسوم اور ماضی سے اپنا رشتہ منقطع نہیں کر سکا ہے اور ہر قدم پر مرکزی کردار کے سامنے ایک سوال بن کر کھڑا نظر آتا ہے۔ مرکزی کردار، جس کا افسانہ نگار کوئی نام نہیں رکھتا، مذہبی عقائد، قدیم رسم و رواج اور سماجی پابندیوں کا منکر ہے مگر اس کے بیٹے کی موت کا واقعہ اس کی ذات کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے اور وہ بیٹے کی تجہیز و تکفین جیسے Sensitive مگر خارجی مسئلے سے الجھتے ہوئے داخلی کرب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

افسانے کا آغاز یوں ہوا ہے:

''کفن کے کپڑے میں کتنا خرچ ہوگا؟''

''بیس پچیس روپے!''

''غسل وغیرہ میں؟''

''دس پندرہ روپے۔''

''قبر کے لیے؟''

''اگر خرید کی جگہ لی گئی تو تیس بتیس روپے۔''

''اور دفن کے واسطے؟''

''پندرہ بیس روپے اوپر سے رکھ لو۔''

''تو سو روپے کے اندر کام ہو جائے گا نا؟'' اس نے سیدھے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہو جائے گا۔'' میں نے جواب دیا۔

''تو تمھارے پاس کیا کچھ بھی نقدی نہیں؟''

''ہے کیوں نہیں۔''

''کتنا ہے؟''

''دو سو روپیہ۔'' میں نے اندر ہی اندر کھولتے ہوئے جواب دیا۔

''میرے پاس دو سو روپیہ موجود ہے۔'' میں نے جملہ پھر دہرایا۔ ایک ایک لفظ پر زور دیا۔

''تو پھر؟''

''تو پھر کیا؟'' جیسے اب تک وہ میرے سامنے ریوالور تانے کھڑا تھا اور اب اس نے ٹریگر پر انگلی رکھ

دی ہو۔

"اب تمھیں کس بات کا انتظار ہے۔ یہ لاش اب تک یونہی کیوں پڑی ہے؟" اس نے گولی چلا دی۔ جیسے میری شہ رگ پر نوکیلی کیل رکھ کر ٹھونک دی گئی ہو۔

اب قاری کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں مسئلہ پریم چند کے "کفن" کی طرح روپیوں کا نہیں ہے بلکہ کچھ اور معاملہ ہے جو بیٹے کی تکفین و تدفین میں رکاوٹ ڈال رہا ہے۔ دراصل افسانے کا مرکزی کردار سنّی فرقے کے ایک خاندان کا ایسا فرد ہے جو کسی مذہبی عقیدے کو نہیں مانتا، جبکہ اس کی بیوی شیعہ عقیدے کی گھریلو عورت ہے۔ وہ اپنی بیوی سے صاف صاف کہہ دیتا ہے کہ "میں خدا کو نہیں مانتا۔ میں مذہب کو ایک غیر ضروری چیز سمجھتا ہوں...... میں نے تم سے شادی کی ہے، تمھارے عقیدے سے نہیں۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں، مجھے اپنے ماں باپ کے مذہب سے بھی کوئی لگاؤ نہیں۔" لیکن جب ان کے بیٹے کا انتقال ہوتا ہے تو بات یہاں الجھ جاتی ہے کہ آخری رسوم کس عقیدے کے مطابق ادا کی جائیں۔ اس کی بیوی اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہتی ہے: "دیکھو تم نے ہمیشہ من مانی کی ہے مگر اب میری بات مان لو۔ یہ راجہ کی نہیں میری لاش ہے۔ اسے یہ سمجھ کر دفنا دو جیسے مجھے دفنا رہے ہو۔" اور پھر وہ اس سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔ وہ بھی رو پڑتا ہے اور بیوی کی خاطر مسئلے کا حل تلاش کرنے گھر سے نکل پڑتا ہے مگر دیر تک ادھر اُدھر بھٹکنے کے بعد بے بس اور ناکام شخص کی طرح واپس گھر لوٹ آتا ہے۔

اس واقعے کا بیان افسانے کا راوی واحد متکلم کے صیغے میں اس طرح کرتا ہے کہ خارجی واقعات کے ساتھ ساتھ اس کی داخلی کیفیت بھی قارئین پر عیاں ہو جاتی ہے۔ اقتباس:

> "میں قسمت کو نہیں مانتا، لیکن اتفاق کو مانتا ہوں۔ پوری بستی میں تین شیعہ گھر تھے جن سے میں مدد لے سکتا تھا جو راجہ کو اسی عقیدے کے مطابق دفن کر سکتے تھے جیسا کہ میری بیوی چاہتی تھی۔ میں بستی میں اجنبی ضرور تھا لیکن میں ان تینوں گھروں میں گیا ان سے بتانے کہ میرا لڑکا مر گیا ہے۔ اس کی تجہیز و تکفین میں میری مدد کیجئے۔ میرا ارادہ تھا کہ میں ان لوگوں کو اپنے گھر بلا کر لاش کو دفن کراؤں گا۔ ان میں سے کسی بڑے کے ہاتھ میں دو سو روپے رکھ دوں گا اور وہ سارا انتظام کر دیں گے، لیکن جب میں ایک گھنٹے کی تلاش کے بعد گھر واپس لوٹا تو میرا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ ایک ایسی پسپائی تھی، ایک تھکن تھی جس کی شکایت میں کسی سے نہیں کر سکتا تھا۔ روح کے کچھ تجربے ہمارے اپنے ہو جاتے ہیں، ان کا ساجھے دار کوئی نہیں ہو سکتا۔ سوچا تھا یہ بات بانو سے کہہ دوں گا۔ گھر پہنچا تو پاس پڑوس کی عورتیں بانو کے پاس بیٹھی تھیں۔"

اب اس کی تنہائی کا اندھیرا اور گہرا ہونے لگتا ہے اور وہ اپنے پیٹ کے بچھوے یعنی اپنی ذات کے باطنی جزء سے الجھ پڑتا ہے۔ وہ جواب تک ایک مخصوص نظریے کے مطابق معاشی آسودگی کو بڑی حد تک ہر مسئلے کا حل تسلیم کرتا تھا اور مذہبی عقائد، فرسودہ رسوم و اقدار اور روحانیت پر Rationalism کو ترجیح دیتا تھا، اب اپنے پیٹ میں موجود بچھوے کے سوالوں سے پسپا ہونے لگتا ہے۔ پیٹ کا بچھوا کہتا ہے:

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ زندگی ہو یا موت، پیسے کے علاوہ بھی کچھ ہونا چاہیے...... تمھارے پاس دو سو روپے موجود ہیں لیکن پھر بھی تم بے بس ہو، لوگوں کے گھروں کی کنڈیاں کھٹکھٹاتے پھر رہے ہو.... کیا کوئی ایسا آدمی ملا جو بانو کے عقیدے کے مطابق بچے کی تجہیز و تکفین کرے؟''

''نہیں اتفاق سے تینوں گھر کے مرد بستی میں موجود نہیں، ایک ہے لیکن وہ بیمار ہے۔''

''اچھا بانو اگر ہندو ہوتی اور وہ اپنے بچے کی آخری رسوم اس شکل میں دیکھنا چاہتی جس میں اس کے گھر کے دوسرے مردے اٹھے تھے تو تم کیا کرتے؟''

''میں رابعہ کو......''

''تم رابعہ کو جلا دیتے نا؟'' اس نے بیچ میں میری بات چھین لی۔

''شکلوں کا معاملہ ہی کچھ ایسا ہے۔ پارسی اپنے مُردوں کو Tower of silence میں رکھ آتے ہیں، انگریز دوسری طرح سے دفن کرتے ہیں۔ اس کرۂ ارض پر انسان نے نہ جانے کتنی رسوم میں، کتنی شکلوں میں اپنی زندگی، موت، شادی بیاہ اور زندگی کرنے کا اظہار کیا ہے۔''

''تم کوئی اور بات نہیں کر سکتے۔ یا کچھ دیر خاموش نہیں رہ سکتے۔''

''لیکن وہ نہیں مانا۔ تب اس نے مجھے بتایا کہ سمندر کے سفر میں جہاں زمین نہیں ہوتی خواہ کسی رسم کا ماننے والا ہو، لاش کو سمندر کے سپرد کرنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے، اور مچھلیاں اسے کھا جاتی ہیں۔ لیکن زمین پر......''

اور تب ہی اس نے یہ پوچھا تھا۔

''لیکن مان لو بانو تمھارے ہی خاندان کی ایک لڑکی ہوتی، تمھاری ہی طرح وہ بھی کسی خدا اور کسی جہنم پر یقین نہ رکھتی، تم عدالت کے سامنے اس سے شادی کا اقرار کرتے، فرض کرو اس بانو کا رابعہ آج یوں مرا پڑا ہوتا تو تم کیا کرتے؟''

میں کچھ نہیں بولا۔

لیکن وہ میرے پیچھے پڑ گیا تھا۔ پیٹ میں پڑے ہوئے کیچوؤں کی طرح۔

''کیا تم رابعہ کو جلا دیتے؟''

''ممکن ہے تم وقت کی مروجہ شکلوں میں ایک نئی شکل کا اضافہ کرتے۔ یعنی تم کوئی نئی بات سوچتے۔ تم رابعہ کی لاش کو محض گھورے پر پھینک کر ہی مطمئن ہو جاتے۔''

''بکواس بند کرو۔'' میں تلخی سے بولا۔

''قصہ یہ ہے کہ خداؤں سے انکار کر دینا بڑا آسان ہے لیکن رابعہ کو، امن کی حالت میں (اس لیے کہ جنگ میں سب ممکن ہے) گھورے پر پھینک دینا بڑا مشکل ہے۔''

نظریاتی اور فلسفیانہ موشگافیاں اب مرکزی کردار کے ذہن پر اثر انداز ہونے لگی ہیں اور اسے احساس

ہو جاتا ہے کہ کسی ایسے نظریے پر قائم رہ پانا، جسے سماج نے تسلیم نہ کیا ہو، مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ یعنی مذہبی عقائد، قدیم روایات اور سماجی رسم و رواج سے پوری طرح انحراف اور بغاوت ممکن نہیں۔ یہ سچ ہے کہ افسانے کے اس مرحلے پر ایک ترقی پسند ادیب سماج کو فرد پر فوقیت دیتا نظر آتا ہے مگر پرانے ترقی پسندوں کا ایک طبقہ جن نظریات اور عقائد کی تبلیغ کے لیے بہت Rigid تھا، ان نظریات و عقائد پر اقبال مجید نے سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔ اسی لیے آخر میں پھر اس کے باطن سے آواز ابھرتی ہے اور کیچوا سوال کرتا ہے:

''ایک بات بتاؤ۔ کیا تم تازیے کی بے حرمتی کر سکتے ہو، سب کے سامنے، چوراہے پر۔''

''کیا بکتے ہو ذلیل۔'' میں نے دانت کٹکٹاتے ہوئے اس کے جملے کاٹ دیے۔

''تو پھر تم مجھے صاف صاف بتا دو کہ اگر تمھارے بچے کو جلایا جاتا تو تمھیں کیسا لگتا؟''

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ آنسو میری شکست کا اظہار تھے۔ لیکن تب بھی میں نے اس سے یہ نہیں کہا کہ رابعہ کی لاش اگر جلائی جاتی تو مجھے بے حد افسوس ہوتا۔

وہ مجھے روہانسا دیکھ کر بولا، ''شاید تمھاری صحت ٹھیک نہیں۔''

یہ سوال کہ ماحول، روایات، مذہب اور اپنے ماضی سے مکمل طور پر آزادی حاصل کر کے کوئی شخص کسی مخصوص نظریے پر کتنے دن قائم رہ سکتا ہے؟ بظاہر ترقی پسند رویے کے خلاف ہے اور مذہب کی آغوش میں پناہ لینے کی وکالت کرتا معلوم ہوتا ہے لیکن اگر ہم افسانے کے مرکزی خیال پر غور کریں تو اس کا موضوع ''فرد پر سماج کی فوقیت'' ہی قرار پائے گا، جو ایک ترقی پسند موضوع ہے۔

افسانے کے آخری یہ دو جملے کہ ''میں ایک صحت مند انسان کب ہوں؟ جس کے پیٹ میں تمھارے قد کا کیچوا موجود ہو، وہ صحت مند رہ بھی کیسے سکتا ہے؟'' ایسے فرد پر طنز کی شکل میں رونما ہوئے ہیں جو تذبذب کا شکار ہے اور پوری طرح کسی ایک نظریے سے وابستگی نہیں رکھتا اور اس نے اپنے پیٹ میں ایک کیچوا پال رکھا ہے۔ ظاہر ہے وہ صحت مند کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو محض ترقی پسند افسانے کے لیے مخصوص نہیں بلکہ جدید فنکار بھی اپنی تخلیقات میں اس جیسے مسائل سے دوچار ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں اس افسانے کی تعمیر میں جس تکنیک کا استعمال ہوا ہے، وہ بھی جدید اور ترقی پسند افسانے کی مشترک تکنیک ہو سکتی ہے۔

لہٰذا content کے نقطہ نظر سے ذات کا کرب، ذہنی کشمکش، اجنبیت اور تنہائی کا احساس، Form کے لحاظ سے personality کو split کر کے پلاٹ کی تشکیل اور اسلوب کی سطح پر علامت، استعارے اور تمثیل جیسے عناصر کا استعمال نقاد کو مشکل میں ڈال دیتا ہے کہ وہ اسے جدید افسانہ کہے یا ترقی پسند؟ یا پھر ترقی پسند افسانے کی توسیع یا جدید شکل؟

دراصل یہ ایک کامیاب افسانہ ہے، اسے کس زمرے میں رکھا جائے، میری ناقص رائے میں یہ فیصلہ ضروری نہیں۔

نجم الحسن رضوی کی کتاب ''معذرت کے ساتھ''

نکہت بریلوی

''معذرت کے ساتھ'' ہلکے طنز و مزاح یعنی کھٹ مٹھے کالموں کا مجموعہ ہے، لیکن یہ اخباری کالم نہیں ہیں۔ البتہ اخباری خبروں کی بنیاد پر حالات حاضرہ کے تناظر میں لکھے گئے ہیں۔ یہ نیوز چینل اے آر وائی ون ورلڈ کے ایک ہفت روزہ پروگرام کے لیے مشہور ادیب نجم الحسن رضوی سے لکھوائے اور انھیں کی زبانی ٹی وی پر دکھائے اور سنائے گئے ہیں۔ نجم الحسن رضوی اردو کے جدید افسانہ نگاروں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ اب تک ان کے افسانوں کے بالترتیب چار مجموعے ''چشم تماشا'' (۱۹۸۲ء)، ''ہاتھ بیچنے والے'' (۱۹۹۳ء)، ''پرے کا موسم'' (۱۹۹۷ء) اور ''انٹرنیٹ کیفے'' (۲۰۰۳ء) شائع ہو چکے ہیں۔

اس سے قبل طنز و مزاح پرمبنی مضامین اور انشائیہ وغیرہ کا ایک مجموعہ ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے کے سارے مضامین اور انشائیے وغیرہ اردو کے مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ یہ مجموعہ ''ہمارے بدمعاشی نظام'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس کے بارے میں معروف ادیب محمد خالد اختر نے فلیپ کی صورت میں نہایت اچھی رائے تحریر کی ہے۔ اس تحریر کا ایک اقتباس یہاں بے جا نہ ہوگا:

''اچھا مزاح (جسے پھکڑ بازی اور لطیفہ گوئی سے کوئی نسبت نہیں) اردو ادب میں کمیاب ہے اور جب ہم اس کی جگمگاہٹ کسی تحریر میں پاتے ہیں تو ہمارے دل کے کنول کھل جاتے ہیں۔ سنجیدہ، خوش اسلوب کہانیاں لکھنے والے نجم الحسن رضوی کو سب جانتے ہیں مگر ان کے ایک عمدہ مزاح نگار ہونے کا علم شاید کم پڑھنے والوں کو ہو۔''

محمد خالد اختر (مرحوم) کے خیال کی تائید ''معذرت کے ساتھ'' میں شامل کالموں سے بخوبی ہوتی ہے۔ مجموعے میں کل ستر (۷۰) کالم دیے گئے ہیں جبکہ پروگرام تین سال سے چل رہا ہے اور اپنی مقبولیت کی بنا پر چوتھے سال میں داخل ہو چکا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ مجموعہ کالموں کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ کتاب کو نو ابواب میں ذیلی عنوانات کے تحت مرتب کیا گیا ہے۔ یہ عنوانات بجائے خود گدگدی سی پیدا کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

چاند میری زمیں۔ پھول میرا وطن۔ سیاست سرائے۔ جمہوریت بجمہوریت۔

ان عنوانات کے تحت جو کالم لکھے گئے ہیں ان کی شوخی و شگفتگی کا صحیح اندازہ کتاب کے مطالعہ سے ہی ہوگا۔ نجم احسن رضوی کے یہاں حسِ مزاح کچھ تو قدرت کا عطیہ ہے اور کچھ والد گرامی سید سجاد حسین سے ورثے میں ملی ہے۔ مرحوم بڑے چہکتے مہکتے بذلہ سنج، نہایت شگفتہ کلام ہنسنے ہنسانے والے بزرگ تھے۔ ادارہ بازیافت نے اپنی روایت کے مطابق عمدہ کاغذ، صاف ستھری کتابت، روشن طباعت اور دیدہ زیب بامعنی ٹائٹل سے مزین اعلیٰ درجہ کی کتاب شائع کی ہے۔ اس کے باوجود ۲۶۲ صفحات کی کتاب کی قیمت صرف دو سو روپے ہے۔

☆☆☆

بشیر موجد سے میرا تعارف بحیثیت ایک فنکار اور طابع میرے فاضل دوست گروپ کیپٹن (ریٹائرڈ) پیر محمد احسن ممبر پبلک سروس کمیشن پنجاب کی معرفت ہوا۔ انھوں نے ایک چھوٹا کتابچہ میرے حوالے کیا جس میں موجد کے فن پر عظیم المرتبت ادبا و فضلا کے تاثرات درج تھے۔ مذکورہ عظیم المرتبت شخصیت فنِ لطیف کے مسلمہ پارکھ اور نکتہ رس تھے۔ میں ایک نامحرمِ فن اور مبتدی کی حیثیت میں مذکورہ آراء میں اضافہ یا کمی کا خود کو اہل نہیں پاتا جو موجد کی فن کارانہ خلاقی اور قابلیت سے تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن جہاں تک موجد صاحب کی ذات کا تعلق ہے تو ان کی ذات ان کی مستور فنکارانہ قابلیتوں کا ہی پرتو ہے جس کا ذریعہ اظہار صفحہ قرطاس اور کینوس ہے۔ وہ ان تمام صفات کا مجموعہ ہیں جو ایک بے داغ کردار، لاریب دیانت اور ایک شفیق قلب کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

موجد نہ صرف ایک تخلیقی فنکار ہیں بلکہ مجسم و متحرک فن کار ہیں۔ ان کا اندازِ گفتگو اور پیرایۂ گفتگو دوسروں سے ان کا طرزِ سلوک ان کی شرافت و نجابت کا آئینہ دار ہے۔ عمر بھر میں مجھے صرف دو اصحاب ایسے ملے جو انسانیت نوازی اور شرافتِ طبع کا اعلیٰ نمونہ کہے جا سکتے ہیں۔ موجد صاحب ان میں سے ایک ہیں۔

—— منظور حسین عارضی

(۱۵ / مارچ ۱۹۸۷ء)

شعلہ و شبنم

خودکش دہشت گرد کی فریاد

فضا اعظمی

مری تاریخ کے ابواب تم مجھ کو نہ دکھلاؤ
یہ سارے میں نے دیکھے ہیں
یہ خوابوں کی کتابیں ہیں
خدارا بند کردو ان کتابوں کو
کئی صدیاں میں آوارہ پھرا ہوں ان سرابوں میں
خدارا بند کردو ان سرابوں کو
مری مجبوریوں، محرومیوں کا قرض ہے ان پر
مری ذلت، مری رسوائی کا مرہم نہیں ان میں
مداوائے غم کاری نہیں ان میں

اگر تم میرے ہمدم ہو، اگر تم میرے رہبر ہو
تو مجھ کو یہ بتاؤ تم
میں اپنی بے بسی، رسوائیوں کا کیسے بدلہ لوں
میں کیسے سرنگوں کردوں کلیسا کے مناروں کو
میں کیسے منہدم کردوں شوالوں کے دواروں کو
میں کیسے بھسم کردوں بستیاں اہلِ کنیسہ کی
مجھے بندوق دو، بارود دو، تیزاب دو، تیز ہ دو، خنجر دو
اگر تم میرے ہمدم ہو، اگر تم میرے حامی ہو
تو مجھ کو یہ سکھاؤ تم

مرے یارِ شکستہ دل
میں ہمدم ہوں تمھارا اور میں حامی ہوں
تمھارے کرب [illegible] ی سے واقف ہوں
تمھارے واسطے پہلا سبق یہ ہے
یہ خوں آلود خنجر پھینک دو تم اپنے ہاتھوں سے
اُٹھالو یہ قلم جو فرش پر ٹوٹا پڑا ہے ایک مدت سے
یہ بچہ تک رہا ہے، جو تمھاری سمت حسرت سے
تم اس بچے کے ہاتھوں میں کتابِ عہدِ نو دے دو
تم اس کے ہاتھ میں بازیچۂ شمس و قمر دے دو
تم اس کے ذہن میں سرمایۂ ذوقِ ہنر بھر دو
تم اس کو علمِ نو کی روشنی سے بہرہ ور کردو
تمھارے سارے بدلے یہ چکادے گا
زمانے کو بتادے گا
کہ جو تاریخ میں لکھا ہے وہ سچ ہے

☆☆

ماں کے لیے ایک نظم

نذیر فتح پوری

مری ماں کے جانے سے کچھ بھی نہ بدلا
وہی صبح ہوتی ہے پہلے کے جیسی
وہی دوپہر ہے سلگتی تڑپتی
وہی شام ہے، خوشنمائی وہی ہے
وہی رات ہے، دلربائی وہی ہے
وہی لوریاں ہیں، وہی نیند، سپنے
وہی صبح صادق کی برکت وہی ہے
وہی آسماں، اس کی رحمت وہی ہے
وہی مسجدوں میں اذاں ہو رہی ہے
دعا ہو رہی ہے، فغاں ہو رہی ہے
مری ماں کے جانے سے کچھ بھی نہ بدلا
وہی چاند سورج، وہی ہیں ستارے
وہی دلکش و دلربا ہیں نظارے
وہی سردی گرمی کے موسم ہیں سارے
جہاں جو بھی شے تھی وہیں کی وہیں ہے
نہیں ہے تو بس میری اماں نہیں ہے
مری ماں کے جانے سے کچھ بھی نہ بدلا
وہی میرے بیٹے، وہی میرے پوتے
وہی گھر کے آنگن میں خوشیوں کے ڈیرے
وہی رشتوں ناتوں کی باریکیاں ہیں
وہی شیرنی ہے، وہی تلخیاں ہیں
وہی قہقہے ہیں، وہی سسکیاں ہیں
وہی اشک ہیں اور تبسم وہی ہے
وہی گیت ہیں اور سرگم وہی ہے
مری ماں کے جانے سے کچھ بھی نہ بدلا
مری ماں گئی تو بس اتنا ہوا ہے
مرے سر سے ممتا کا آنچل گیا ہے
محبت کا لہراتا بادل گیا ہے
دعاؤں کے سب سائباں ڈھہ گئے ہیں
پناہوں کے سب آسماں ڈھہ گئے ہیں
میں اب پیاسے جنگل کی صورت پڑا ہوں
میں سایہ ہوں، دھوپ میں جل رہا ہوں
مری ماں کے جانے سے میں مرگیا ہوں
مری ماں کے جانے سے میں مرگیا ہوں

☆☆

(۲۳/اکتوبر ۲۰۰۷ء بروز منگل ماں آخری سفر پر روانہ ہوئی تھیں)

اجارہ

جلیل عالی

تمھاری سرزمیں پر
ہمارے ٹینک جب یلغار کرتے ہیں
انھیں نفرت سے پتھر مارتے ہو تم
یہ دہشت گردیاں بربادیوں کا پیش خیمہ ہیں
ہماری قدرت وقوت کا اندازہ نہیں تم کو
قیامت بانٹتے ہیں، امن کے بیوپار کرتے ہیں
گرادیتے ہیں ہر چھوٹی بڑی دیوار
اپنا راستہ ہموار کرتے ہیں
تمھاری حیثیت کیا ہے
یہی ہوگا کہ آخر کو
اسی قیمت پہ عافیت خریدو گے
جو ہم چاہیں گے، مانگیں گے

☆

مارکیٹ اکانومی

جلیل عالی

میں ہی میں سر بسر
مجھ سے کس کو مفر
مجھ سے بڑھ کر زمیں پر ہے کس کا اثر
کون حیلہ مرے سامنے کارگر
میری نظریں غضب
میرے اپنے ہی ڈھب
جانتی ہوں میں سب
کتنے داموں بکاؤ ہے کس کی زباں
کس کا آدرش، کس کا قلم، کس کا فن
کس کا نام ونسب
کس کا دیں، کس کا رب

☆☆

نظمیں

شمی فاروقی

شامِ تنہائی

سورج نے پھر دن کا سفر تمام کیا
پھر شاخوں پر
شام کے سائے بھیگ چلے
تاریکی پر کھول رہی ہے
اپنے اپنے سفر سے پنچھی لوٹ رہے ہیں
میں اپنی تنہائی سمیٹے
دور خلا میں دیکھ رہا ہوں
جانے کیا کیا سوچ رہا ہوں

انتظار

میں نے سب دروازے کھول دیے ہیں
کھلے دریچوں پر جو پردے پڑے ہوئے تھے
ہٹا دیے ہیں
گھر کے سب فانوس ہیں روشن
لیکن یہ برسات کا موسم
جب بھی دونا کر دیتا ہے
تنہائی کا غم
میرے اندر کی ویرانی
دیواروں پر آویزاں ہو جاتی ہے
میں وہیں
دہلیز پہ اپنی آنکھیں رکھ آتا ہوں

ناتا

میں ساگر تم دھرتی ہو
ملنے سے کیوں ڈرتی ہو
ساگر دھرتی کا حصہ ہے
ساگر دھرتی پہ بہتا ہے
ساگر سے دھرتی کا ناتا
بہت پرانا ہے

آدھا سفر

میں جانتا ہوں
کہ وقت کافی گزر چکا ہے
محبتوں کا چمکتا سورج
دکھوں کے گہرے سمندروں میں
اُتر چکا ہے
مگر!
ابھی زندگی کا آدھا سفر ہے باقی
تمھیں میں آدھے سفر سے
ہرگز نہ جانے دوں گا
میں روک لوں گا
کہ جو سفر رہ گیا ہے باقی
میں اُس سفر میں
کبھی بھی تنہا نہ جی سکوں گا
نہ مر سکوں گا

☆☆

اکیلاپن

(TENURE STATION اسکردو سے جمیلہ کی واپسی پر)

شہزاد اختر

تمھاری یہ بات کتنی سچ ہے
کہ آدمی بھی ہے اک پرندہ
ابھی ذرا دیر پہلے ہم تم
بڑی خوشی پاس پاس بیٹھے
گئے دنوں کی کتاب کھولے
ورق ورق پر پرانی یادوں کو پڑھ رہے تھے
پرانی یادوں کا ایک جنگل ہرا بھرا لہلہا رہا تھا
یہ سارا جنگل مسرتوں کی ہواؤں میں سرسرا رہا تھا
مگر انہی میں کہیں کہیں آنسوؤں کے چشمے بھی
پھوٹتے تھے
وہ آنسو جو میری بے رخی نے تمھاری آنکھوں میں
بھر دیئے تھے
تمھاری آنکھیں ہمارے ہیرے
تمھارے آنسو ہمارے موتی
مجھے تب اس کا پتہ نہیں تھا

....

ہرا بھرا سایہ دار، پھل دار ایک اونچا شجر کھڑا ہے
جسے شب و روز سینچنے میں لگے ہوئے ہیں
نہ جانے کب سے
تمھارے آنسو تمھاری آنکھیں
اسے نمو کے لیے جو حدت کی ہے ضرورت
تمھارے ہونٹوں کی مسکراہٹ سے مل رہی ہے
تمھیں پتہ ہے مجھے پتہ ہے
شجر یہ میری حیات کا ہے
جو تم نہ ہوتیں تو اس شجر کا
کہیں بھی کوئی پتہ نہ ہوتا
مری دعا ہے
خدا تمھیں شادماں رکھے
اور اپنے زیرِ اماں رکھے

....

ابھی ذرا دیر پہلے ہم تم
بڑی خوشی پاس پاس بیٹھے
سنہرے خوابوں کے تانے بانے بنا رہے تھے
مسرتوں کے محل سہانے سجا رہے تھے
یہ وقت دریا گزر رہا ہے
گزرتے جانا ہے کام اس کا
مہینے اور سال اس کے دھارے

چمکتے دن اور سیاہ راتیں ہیں اس کی سوچیں
یہ ماہ و سال اور رات اور دن
گزر گزر کر
مری تمھاری جدائیوں کو گھٹا رہے ہیں
مجھے تمھیں رفتہ رفتہ نزدیک لا رہے ہیں
پھر ایک دن وہ بھی آئے گا جب
زمانۂ یاس ختم ہوگا
اور اپنا بن باس ختم ہوگا

....

ابھی ابھی اک بہت بڑا آہنی پرندہ
پہاڑ کے دامنوں سے اُڑ کر
بلندیوں پر رواں ہوا ہے
زمیں پر میں کھڑا ہوا اس کو دیکھتا ہوں
مرا پرندہ بھی اس پرندے کے ساتھ ہی دور جا رہا ہے
یہ چند لمحوں میں ایک نقطہ سا بن گیا ہے
میں دیر تک اس کو دیکھتے رہنا چاہتا ہوں
مگر نم آلود ایک پردہ مری نگاہوں پہ تن گیا ہے

....

یہ میرا دل جو تمھارا دل ہے
تمھارے پیچھے چلا گیا ہے
نہ آگے کچھ ہے نہ پیچھے کچھ ہے
نہ کچھ ہے اوپر نہ نیچے کچھ ہے
یہ گھر جو ہے میرا گھر نہیں ہے
ہے قید خانہ مرے بدن کا
اک آسماں سا اداسیوں کا مرے خیالوں پہ تن گیا ہے
مرا مقدر اکیلا پن پھر سے بن گیا ہے ☆☆

ہڈسن اور کورنگ

حسن عباس رضا

ہڈسن اور کورنگ کے بیچ
اک لمبی دوری......
جانے کتنے دریا،
کتنے صحرا اور سمندر
ان دونوں کی راہ میں حائل ہیں......
......دونوں میں پانی کا بہاؤ
اک جیسا ہے
دونوں ایک ہی رخ بہتے ہیں
پھر بھی کسی دوآبے
کسی بھی موڑ پہ آ کر مل نہیں پاتے......
اور یہی تو دکھ ہے اپنا
......جب تک دونوں
کسی بھی موڑ پہ
نہیں ملیں گے
ہجر کے گھاؤ،
زخمِ فراق کے نہیں سلیں گے
وصل کے غنچے
نہیں کھلیں گے...... !!

☆☆

ہڈسن: نیویارک کا دریا
کورنگ: اسلام آباد کے مضافات میں بہنے والا چھوٹا سا دریا

گمان

میر ظفر حسن

ہر پھول کائنات ہے
ہر رنگ میں ہزاروں
ستارے چھپے ہوئے
ہر ذرہ داستاں ہے
چاروں طرف دھواں
شامِ سفر سے پہلے یہ سورج نکلتا ہے
یہ شام ہے، سحر ہے
کہ بس اک گمان ہے
اک رنگ رنگ یاد
کبھی تاروں کی روشنی
اب پھول کھول دے گا
کسی پنکھڑی کا حال
اور رات کے اندھیرے میں جلتے ہوئے یوں ہی
محرابِ شب میں نور
بکھیرے گا اک چراغ
اور اک صدا ہمیں بھی
پکارے گی بس ابھی!

☆

سایہ

میر ظفر حسن

جب کبھی درد سوا ہوتا ہے
سارے الفاظ ہی کھو جاتے ہیں
خوش نما پھول بھی بے رنگ نظر آتے ہیں
ایک بے نام اُداسی میں بدن جلتا ہے
اُس گھڑی تیرے بدن کی خوشبو
تیرے انفاس کی گرمی مجھے یاد آتی ہے
وہ ترا پیکر سیمیں مرا سایہ بن کر
میرے ہر درد پہ چھا جاتا ہے

☆☆

زندگی کے نام

پرویز مظفر

انسان سوچتا کیا ہے
ہو کیا جاتا ہے
وہ زندہ رہنا چاہتا ہے
لیکن مر جاتا ہے
جن کو زندگی بوجھ لگتی ہے
مرنا چاہتے ہیں
مر نہیں پاتے ہیں
ابھی کل سی کی بات ہے
Caraline نے نوکری چھوڑی تھی
یہ کہتے ہوئے
کہ وہ سکون کی زندگی گزارنا چاہتی ہے
اور آج خبر آئی
کہ
ایک حادثہ میں
اس کی موت ہو گئی

☆☆

لمبی مسافتوں کا قصہ

ارمان نجمی

چلتے پھرتے ہوئے عکس
دو ایک پل کے لیے
راستوں کے بدلتے ہوئے
رنگ سے آشنا ہو کے
نا آشنا ہو گئے
کوئی پہچان لمبی مسافت کا قصہ نہیں

☆☆

اقرار

شعیب رضا فاطمی

وہی شناسا
جو ایک مدت
امین تھا میری دھڑکنوں کا
کہ جس کی زلفوں کے مست سائے
دراز ہوتے ہی رات ہوتی تھی
جس کی انگڑائیوں کے بل پر
طلوع ہوتا تھا دن کا سورج
جو مسکراتا تھا جب کبھی بھی
تو ایسا لگتا تھا زندگی مسکرا رہی ہے
بدن کی اس کے تپش
حرارت تھی اس قلم کی
وہ جب نکلتا تھا ساتھ میرے
تو ذرہ ذرہ پکارتا تھا
خدائے واحد سدا سلامت رہے یہ جوڑی

تھکن تمام دن کی
گھٹن اپنے تمام پیچیدہ مرحلوں کی
جو شام ہوتے ہی اس سے ملتا
تو خود کو پاتا
میں چاق و چوبند ہلکا پھلکا
مگر نہ جانے یہ کیا ہوا پھر
تھکن گھٹن ہو گیا مقدر
وہ رہ گزر جس پہ اس کے شامل کبھی چلا تھا
پکار کر مجھ سے پوچھتی ہیں
کہ کیوں اکیلے ہو
کیا ہوا وہ تمھارا ساتھی
وہ ماہ رو گل بدن کہاں ہے
کہ جس کی خوشبو تمھارے دامن سے آرہی ہے
میں کیا بتاؤں اسے
کہ اب تو
ہماری حالت یہ ہو گئی ہے
کہ یک بیک
حادثے کی صورت
کہیں سر راہ مل گیا تو
ملا نہ پاؤں گا اس سے نظریں

☆☆

بیادِ مشتاق شبنم

تعزیتی رباعیات

حسیر نوری

دریائے وفا کا تھا کنارا شبنم
احباب کی آنکھوں کا تھا تارا شبنم
ڈھونڈوگے کہاں اس کو زمانے بھر میں
اب ہم میں نہیں ہے وہ ہمارا شبنم

☆

زنجیرِ روایات تھا مرنے والا
تنویرِ خیالات تھا مرنے والا
ہر شخص سے ملتا تھا بڑے پیار کے ساتھ
تصویرِ عنایات تھا مرنے والا

☆

رشتے کے ہر اک تار کو وہ توڑ گیا
اپنوں سے وہ بیگانوں سے منھ موڑ گیا
اک عمر نبھاتا جو رہا دکھ سکھ میں
احباب کو وہ روتے ہوئے چھوڑ گیا

☆

دل میں کوئی اندیشہ نہیں رکھتے تھے
وہ حسنِ عمل، حسنِ یقیں رکھتے تھے
پختہ تھے بہرحال ارادے ان کے
مشکل میں بھی وہ خندہ جبیں رکھتے تھے

☆☆

کتھا، کہانی

شادی کا دن

مصطفیٰ کریم

پلاؤ، قورمہ، نان، کباب اور پھر رس ملائی۔ اس کے بعد چائے۔ کھانا ختم ہوا۔ رکابیوں سے چھری کانٹے اور چمچوں کے ٹکرانے کی آوازیں بھی رک گئیں۔ مہمان مردوں اور عورتوں کی گفتگو بلند ہوئی۔ جیسے بہت ساری شہد کی مکھیاں شہد سے بوجھل اور خوشی سے مست ہال میں بیتابانہ اڑ رہی ہوں۔ وہ اسٹیج جہاں انگریز دولہا اور اس کی بنگلہ دیشی دلہن بیٹھی تھی، وہاں نغمہ بلند ہوا۔ گانے والی جب اسٹیج کی جانب آ رہی تھی تو خلیل نے اس کی جانب دیکھا بھی نہیں۔ اتنی ساری جوان عورتوں جیسی وہ بھی ایک جوان عورت تھی۔ سرخ اور زرد ریشمی ساری میں ملبوس وہ چلتی ہوئی اسٹیج کی جانب آئی دلہا دلہن پر نگاہ ڈال کر وہ مسکرائی اور پھر گانا شروع کر دیا۔ زریں آنچل میں اس کا سادہ چہرہ سنجیدہ اور پُر وقار تھا۔ گانے کے الفاظ سن کر خلیل چونک پڑا۔ اب تک جو اکتاہٹ اسے ہو رہی تھی وہ اچانک ختم ہو گئی۔ اس کی نگاہیں گانے والی پر جم گئیں۔ لمبا قد اور بھرا بھرا جسم۔ نہ آواز میں جھجک اور نہ چہرے پر گھبراہٹ۔ اسے اپنی آواز کے سحر کا احساس تھا۔ نغمہ کے زیر و بم کے ساتھ کبھی اس کی آنکھیں نیم وا ہو جاتیں اور کبھی بند۔ جب گانے کی اٹھان میں تناؤ آتا تو اس کی گردن کی رگیں تن جاتیں۔ اس کا ایک ہاتھ سرخ میز پوش سے ڈھکی میز پر ٹکا تھا۔ جس کے قریب شفاف گلدان میں سجے سرخ پھول مسکرا رہے تھے۔ اس کی قربت سے اور دولہا دلہن کی موجودگی سے بھی۔ جن کے لبوں پر بھی تبسم تھا۔ شفیق اور والہانہ۔ انگریز دولہا کی نگاہیں بار بار گانے والی پر جاتیں۔ وہ کچھ سمجھنے کی ناکام کوشش کرتا اور پھر دلہن کے کان میں کچھ کہتا اور وہ شرما کر سر جھکا لیتی۔

گانے کے الفاظ اگر بنگلہ ہوتے تو خلیل اسٹیج کی جانب دیکھتا بھی نہیں۔ وہ چھت سے ٹنگے منور چہل چراغوں کو دیکھتا۔ یا سرخ، گلابی اور نیلے پھولوں کے ان بڑے بڑے بوکیٹ سے اپنی نگاہیں تازہ کرتا جو ہال کے بڑے بڑے سبز دروازوں کے پاس رکھے تھے۔ یا پھر اپنے بچپن کے دوست اور خالہ زاد بھائی نثار سے گفتگو کرتا جو پاس ہی بیٹھا تھا۔ گانے کے الفاظ خلیل کے دل میں اداس گنگناہٹ بھر رہے تھے۔ ارد گرد جو بنگلہ دیشی مہمان بیٹھے تھے ان میں سے کچھ اس کے واقف تھے۔ جن سے بات کرتے ہوئے بنگلہ الفاظ اس کی زبان پر آنے سے پہلے رک گئے اور جب انھوں نے اردو میں بات کرنا چاہا تو کوشش کے باوجود بھی نہیں کر سکے۔ ماضی میں ایسی ہی کوشش اجنبیت کی خلیج کو پاٹنے کے لیے کی گئی تھی لیکن وہ سعی رائیگاں ثابت ہوئی۔ تاریخ کے بے رحم پہیے نے اسے کچل دیا

تھا۔ وہ آج بھی ان کے لیے اجنبی تھا اور وہ بھی اس کے لیے انجان افراد تھے۔ تین دہائیوں کے فاصلوں کو طے کرتے ہوئے وہ سانحہ جو اس وقت کے مشرقی پاکستان میں ہوا تھا اسے اس نے بھلانے کی کوشش کی تھی۔ اس نفرت کو بھولنا چاہا تھا جس نے بربریت اور سفاکی کو جنم دیا تھا۔ آج گیت کے الفاظ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے ایسا ہونا ممکن نہیں۔ عورت گا رہی تھی:

کر لیجیے چل کر مری جنت کے نظارے
جنت یہ بنائی ہے محبت کے سہارے

گانا کسی ہندوستانی فلم کا تھا اور جنت، نظارے، محبت، فارسی اور عربی کے الفاظ تھے جو پراکرت کے باغ میں کھل کر اردو بن گئے تھے۔ یہ اس کے تخیل میں کہیں چھپے تھے۔ نگینہ کی طرح دمکتے ہوئے۔ یہ اس کی تاریخ کی بازگشت تھے۔ گم شدہ اور خاموش۔ جن کی بابت وہ سوچتا بھی نہیں تھا۔ عجیب بات تھی۔ گھر کے باغ میں باغبانی کرتے ہوئے، شراب خانوں میں شام اور رات کے ابتدائی لمحات میں بیئر پیتے ہوئے اور بیوی سے لڑائی جھگڑے کے درمیان ان الفاظ کی سوچ بھی نہیں آتی تھی جو اسے سمجھاتی کہ ان ہی الفاظ نے اسے انسان بنایا تھا۔ اور اس وقت اردگرد بیٹھے ہوئے سوٹ اور رنگ برنگی ساڑیوں میں ملبوس جس اجنبی زبان میں باتیں کر رہے تھے، اس نے انھیں بھی انسان بنایا تھا۔ مدت ہوئی ان کے درمیان رہتے ہوئے انسانیت کا رشتہ ان سے کیوں ٹوٹ گیا؟ زندگی کے پُرخار راستوں پر چلتے ہوئے محبت کے جن پھولوں کو اس نے چنا اور گلزار بنانے کی کوشش کی وہ رائگاں کیوں ثابت ہوئی؟ اور پھر وہ بیگانگی کیوں آگئی جس کی وجہ سے کچھ دیر پہلے تک وہ اکتاہٹ محسوس کرتا رہا تھا۔ یہ سارے لوگ جو اردگرد بیٹھے ہیں انھیں ان الفاظ سے دشمنی کیوں نہیں ہو رہی ہے؟ پاس بیٹھا کالا مرد سرمئی سوٹ میں ملبوس کیوں ترنگ میں پیر ہلا رہا ہے؟ اور اس کی شادماں بیوی محویت سے کیوں گانا سن رہی ہے؟ ان سوالوں کے جواب خلیل کے پاس نہیں تھے۔

اسے عجیب سی بے چینی ہوئی جسے مٹانے کے لیے وہ دولہا دلہن کو تکنے لگا۔ انگریز دولہا سفید چمکتی ہوئی شیروانی میں ملبوس۔ شیروانی کی آستین اور گریبان پر مصنوعی زری کا کام بجلی کی روشنی میں دمکتا ہوا۔ گلے میں سرخ پھولوں کا ہار اور متبسم چہرہ مطمئن۔ اس کے ساتھ بیٹھی دھان پان سی سانولی دولہن۔ سر جھکائے ہوئے اور پُر سکون۔ سرخ ساری میں ملبوس۔ ہاتھوں اور گردن میں سونے کے چند زیورات۔ اور اس کی گردن میں بھی سرخ پھولوں کے کئی ہار۔ دلہن نے اب جسے چاہا وہ مل گیا۔ ماں باپ نہال تھے۔ لیکن دو سال پہلے فردوسی بیگم نے جب انھیں کہا کہ وہ جسے چاہتی ہے وہ ایک سیاہ فام افریقن ہے تو ماں باپ آگ بگولا ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر بیٹی اپنی ڈاکٹری لے کر کہیں اور جا کر رہے۔ ان سے رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ فردوسی بیگم نے رو دھو کر صبر کر لیا۔ صوم صلواۃ کے پختی سے

پابند اور مذہب پرفدا ماں باپ نے ٹھیک ہی نصیحت دی تھی اس نے سوچا۔ لیکن دو سال بعد جب انگریز محبوب اسے ملا توسب کچھ درست ہو گیا۔ ماں باپ نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ راز کی باتیں بنگلہ دیشی نور بیگم نے بتائی تھی۔ جو خلیل اور اس کی بیگم دلشاد کی دوست تھیں اور ہمسائی بھی۔ اور اسی لیے ان سے کچھ قربت سی تھی۔ دور ہوتیں تو شاید نور بیگم انھیں جانتی بھی نہیں۔

اور آج فردوسی بیگم کے والد سعادت بہت خوش تھے۔ سعادت سے خلیل کی پرانی واقفیت تھی۔ وہ ہمیشہ اسے دیکھ کر خوش ہو جاتا تھا۔ لیکن مشرقی پاکستان کا بنگلہ دیش بن جانے کے بعد خلیل نے اس کے اور اپنے درمیان ہمیشہ ایک دیوار محسوس کی تھی۔ حالانکہ بنگلہ دیش بنتے وقت اس نے کسی کی جان نہیں لی تھی اور نہ ہی خلیل کی آستین پر کسی بنگالی کا خون تھا۔ اور نہ ہی اس کے جسم پر اس لیس دار کیچڑ کی بدبو تھی جو کسی بنگالی عورت کے ساتھ زنا کرنے کے بعد آجاتی۔ جب بھی سعادت سے ملاقات ہوتی تو اجنبیت کے آہنی کانٹے اسے قریب نہیں ہونے دیتے۔ بعد میں اسے جرم کا احساس ہوتا۔ اپنی کمینگی کا خیال آتا۔ لیکن احساس پر اختیار کسے ہوتا ہے۔ دولہا اور اس کے والدین نے دیگر تمام مہمانوں کے ساتھ تالیاں بجائیں۔

"دولہا مسلمان کیسے ہو گیا؟" دلشاد نے چپکے سے کہا۔

اس کے منھ سے قورمے کی بو آئی۔ خلیل نے بیوی کو جواب نہیں دیا۔ مذہب وہ کتاب ہے جسے انسان پڑھتا ہے، جینے کا کچھ سلیقہ سیکھتا ہے، کچھ روحانی سکون محسوس کرتا ہے اور پھر وہ کتاب اس کی یاد کے کسی محترم طاق پر دھری رہ جاتی ہے۔ بعد میں کبھی زندگی کی ہلچل اور بھاگتی دوڑتی دنیا کے پاگل پن سے تنگ آکر اسی کتاب کو اٹھاتا ہے اور اس کی مدد سے اردگرد کی جادوگری کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسروں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے کبھی توڑ پھوڑ کرتا ہے اور کبھی سوانگ بدلتا ہے۔ لیکن ہلچل میں، زمانے کی بھاگ دوڑ میں کوئی کمی نہیں آتی۔

اسٹیج پر سعادت آگیا۔ وقار سے چلتا ہوا اور چہرے پر مسکراہٹ۔ سرمئی سوٹ اور ہلکے نیلے رنگ کی ٹائی میں اس کا گہرا سانولا رنگ کچھ اور ہی دب گیا تھا۔ بھرے بھرے چہرے پر سفید داڑھی اور اسی رنگ کے سر پر کچھ بال۔ مائیک سے اس کی آواز آنے لگی۔ وہ اپنی زندگی کے ورق الٹنے لگا تھا۔ فردوسی بیگم کی پیدائش اور اس کے بعد کے چند دن۔ جب وہ اسے دیکھ کر اپنے ننھے ہاتھ پاؤں ہلانے لگتی تھی۔ شام کے وقت جب تک اسے دیکھ نہیں لیتی وہ سوتی نہیں اور وہ اکثر اسے گود میں اٹھا کر اپنے فلیٹ کے برآمدے میں اسے سلانے کے لیے ٹہلتا رہتا۔ بیٹی اپنے باپ کی آغوش میں سکون محسوس کرتی، اسے راحت ملتی اور اپنی روح کا تسلسل بھی۔ وہ اپنی ننھی آنکھیں بند کر کے سو جاتی۔ اور یہ سب کچھ کراچی میں ہو رہا تھا۔ ہزاروں میل دور روشنیوں کا شہر، جو اب سعادت کا شہر نہیں تھا اور خلیل کا بھی نہیں۔ وہ جہان جوان کے دلوں میں بسا تھا اسے دوری کی آندھیوں نے ویران کر دیا تھا۔ فردوسی بیگم کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی تھی۔ مہمانوں میں جو بہ پ تھے ان کے چہروں پر بھی ویسی ہی مسکراہٹیں تھیں اور ان

کی بیٹیوں کے چہروں پر بھی۔ ویسی ہی شفیق سی مسکراہٹ۔

سعادت اب اپنے بیٹے نفاست کا ذکر کر رہا تھا جو اسٹیج ڈائرکٹر اور چیخوف کے ڈراموں کا ماہر تھا۔ ان ڈراموں میں انسان کے نہ پورے ہونے والے آدرش اس کی بے ثباتی، پچھتاوے، غم اور کمزوریاں ہیں۔ خلیل جب سعادت سے اس کے گھر ملنے جاتا اور نفاست بھی وہاں ہوتا تو وہ چیخوف کے ڈراموں کی بابت کبھی کبھی ایسی ہی معلومات فراہم کرتا۔ سعادت اس وقت اپنی تاریخ بتانے پر تلا تھا۔ وہ تاریخ جس میں نہ ہندوستان تھا اور نہ پاکستان۔ نہ بنگال کی ندیاں اور نہ ان ندیوں پر بہتی ناؤ اور ان میں بیٹھے ماہی گیر۔ شاید اسی لیے سعادت اور خلیل کے بچوں کے لیے ان کے والدین کی تاریخ ہندوستان کی اس تفریق تکون میں محدود تھی جس میں دہلی، آگرہ اور جے پور شہر تھے۔ اس دنیا کا اب ذکر ہی کیوں ہو جس میں محرومیاں اور ذلتیں تھیں۔ سعادت کی تقریر جاری رہی۔ جب نفاست انگلستان کے شہر گلاسگو میں پیدا ہوا تو گھر میں سعادت کی بیوی کی مدد کے لیے کوئی بھی نہیں تھا۔ پھر وہ بیمار بھی پڑ گئی۔ اس کے بعد ان کی جاننے والی ڈاکٹر نینا ان کی مدد کے لیے آگئیں۔ وہ ہر روز ان کے گھر آتیں۔ کھانا پکا دیتیں اور سعادت کی بیوی کی ہر طرح مدد کرتیں۔ آج مہمانوں میں نینا بھی تھیں۔ سامنے ہی بیٹھی ہوئی۔ پستہ قد اور موٹی سی۔ ان کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ اپنی تعریف سے کون خوش نہیں ہوتا۔ نینا ہندو تھی۔ اس مذہب سے سعادت کو نفرت تھی۔ اس مذہب کے ماننے والوں پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے کبھی کہا تھا۔ یہ اعتبار اس دن گم ہو گیا تھا جب سعادت بنگال کے ایک گاؤں میں کسی چیٹر جی نام کے زمیندار کے گھر میں دعوت پر گیا اور سبھوں سے الگ رواج کے مطابق کیلے کے درخت کے چھلکے پر بھات دال اور مچھلی اسے پیش کی گئی۔ اسے پینے کا پانی دینے والا اوپر سے اس کے مٹی کے گلاس میں اس طرح پانی ڈالنے لگا جیسے پانی کی ایک بوند بھی اس کے گلاس سے نکل کر ادھر اُدھر گری تو وہ جگہ ناپاک ہو جائے گی۔ لیکن وہ بہت پرانی بات تھی۔ پھر بھی سعادت نے خلیل کے سامنے اپنی رائے کبھی نہیں بدلی۔ نینا کی محبت کسی کام نہیں آئی۔ جو زہر سعادت کو دیا گیا وہی زہریلا لعاب بن کر اس کے منھ سے برابر ٹپکتا رہا۔ اور خلیل نے وہ دیوار کھڑی محسوس کی جو اب بھی تھی ان دونوں کے درمیان۔ خلیل اسکی تنگ نظری نہیں قبول کر سکا تھا۔ پھر بھی دونوں کے درمیان دوستی رہی۔ آج اس کی تقریر سن کر اسے سعادت کی سوچ کا تضاد کانٹا بن کر گڑا۔

خلیل نے شدید اکتاہٹ محسوس کی۔ وہ کرسی پر سے اٹھا۔ ''کہاں جا رہے ہیں؟ خلال کی تلاش میں؟'' بیوی نے طنزیہ پوچھا۔

اس کی شوخ آنکھوں کے گرد جھریاں رینگ رہی تھیں۔ سر کے بال خضاب کی وجہ سے سیاہ تھے۔ کھانے کے بعد دانتوں کو خلال سے صاف کرنا خلیل کی عادت تھی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''خلیل! کہاں چلے؟'' نثار نے پوچھا۔

اس کی انگلیاں جس گلابی پھول کی پنکھڑیوں کو سمیٹ رہی تھیں وہ رک گئیں۔ اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ میں ذرا سے تکبر کی جھلک بھی تھی۔ ٹوئیڈ کے کوٹ اور سرمئی پتلون میں اس کا کسرتی بدن کسا تھا۔ اور سفید قمیص بے داغ اور بے شکن تھی جس میں شوخ رنگ کی ٹائی مسکرا رہی تھی۔ گورا چٹا اور بڑی آنکھوں میں وحشیانہ چمک۔ نثار مغل شہزادہ لگتا تھا۔ چند لمحوں پہلے گلابی رنگ کا پھول گلدستہ سے ٹوٹ کر گرا تھا۔ نثار نے جیسے بے خیالی میں اس کی پنکھڑیوں کو توڑا اور پھر انھیں سمیٹنے لگا تھا۔ اس کے ہاتھ رک گئے تھے اور خلیل کے اچانک اٹھ جانے پر اسے حیرت تھی۔ وہ اسی کے ساتھ شادی میں شرکت کے لیے آیا تھا۔ خلیل نے اسے بھی جواب نہیں دیا۔ وہ فوئر میں آ کر بے دلی سے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ پاس کی میز پر سنگترے کے عرق اور کوک کی خالی اور کچھ بھری بوتلیں پڑی تھیں۔ ان کے پاس ہی کاغذی گلاس سفید میز پوش پر زرد اور سرخ داغوں کے درمیان بکھرے تھے۔ نثار بھی ہال سے باہر آ کر اس کے قریب دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"خلیل بھائی! جب بھی کسی دعوت میں جاتا ہوں تو مجھے وہ دعوت یاد آتی ہے جو آپ کے ختنہ پر نانا نے دی تھی۔ آہ! ویسی باقر خانی اور پلاؤ جس پر گھی میں تلے پیاز اور بادام کشمش کا چھڑکاؤ ہوتا تھا پھر کہیں کھانا نصیب نہ ہوا۔ پاکستان کے کسی شہر میں نہیں۔ حالانکہ فوج کی نوکری کے دوران اس ملک کے شہر شہر میں پھرا ہوں۔"

خلیل نے بڑی کوفت محسوس کی۔ یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہوئی اور وہ بھی اب جب کہ ان کی عمر ستر بہتر ہو چکی ہے۔ اس شخص کو ایسی مہمل بات کرنی تھی تو عورتوں کے ختنہ کی بات کرتا جو سوڈان اور مصر میں روا ہے۔ اور جب بھی وہ نثار کی سیاہ فام سوڈانی بیوی کو دیکھتا ہے تو سوچتا ہے کیا اس پر بھی یہ ستم ہو چکا ہے۔ خلیل نے سوچا لیکن کچھ بولا نہیں۔ جب وہ ۱۹۵۱ء میں ہندوستان سے ہجرت کرنے کے بعد مشرقی پاکستان آیا تو کچھ دنوں کے بعد نثار بھی وہاں آ گیا تھا۔ وہ فوج میں کیپٹنڈ افسر بن گیا اور خلیل ڈاکٹری کی تعلیم مکمل کرنے میں مصروف رہا۔ اسے اپنے نانا میر صابر علی یاد آنے لگے۔ کب ملا تھا وہ ان سے؟ اسے یاد آیا۔ جب وہ چار سال کا تھا تو مدھوپور میں والد کے انتقال کے بعد اپنی والدہ کے ساتھ ٹرین سے آرہ اسٹیشن پہنچا تھا۔ تیز دھوپ تھی۔ جب وہ اپنی روتی دھوتی بیوہ ماں کے ساتھ ڈبے سے باہر نکلا تو سامنے نانا ہی تھے۔ گورے چٹے۔ لمبا قد۔ ترکی ٹوپی سر پر پیچھے کی طرف سرکی ہوئی اور زرد شیروانی کے کچھ بٹن کھلے ہوئے۔ خلیل پر جونہی ان کی نگاہ پڑی وہ بے اختیار رو پڑے اور ان کے ساتھ جو دیگر رشتہ دار مرد و عورت کھڑے تھے انھوں نے بھی زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ خلیل کے والد کی وفات دور دراز مدھوپور نام کے شہر میں چند دن پہلے ہوئی تھی اور ان چند دنوں میں وہ مسلسل آہ و زاریاں سنتا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے بھی آنسو نکل آئے اور وہ ڈر کر ماں سے لپٹ گیا۔ اسٹیشن پر جو مسافر تھے وہ بھی اس رقت آمیز سماں کو دیکھنے لگے۔ کسی نے خلیل کو اٹھا کر میر صابر علی کی گود میں دے دیا۔

"اپنے ابا کو کہاں چھوڑ آئے بیٹا؟" میر صابر علی نے روتے ہوئے پوچھا۔

وہ اپنے جوان داماد کی علالت کے دوران اپنی ملازمت کی وجہ سے نہیں جا سکے تھے۔ انھوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ بغیر الوداع کہے اس دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔ خلیل کے پاس نانا کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ بس سسکتا رہا۔

''جس کی کبھی قدر نہیں کی اب اس کے لیے کیوں آنسو بہا رہے ہو؟ جنھیں ہتھکڑیاں پہنائیں اور پھانسی کے راستوں پر دھکیلا ان کے کوسنے کا نتیجہ ہماری معصوم بیٹی نے بھگتا۔ داماد کو ہم منحوسوں کی ضرورت نہیں تھی اس لیے اس نے ہمارا چہرہ بھی نہیں دیکھا مرتے وقت۔'' نانی بیٹی کو سینے سے لگائے اپنے پولیس افسر خاوند سے شکوہ کر رہی تھیں۔

بھولی بسری یاد سے خلیل کے لبوں پر غمناک مسکراہٹ آ گئی۔

''تمھیں دعوت یاد رہ گئی۔ میں تو کچھ بھی نہیں بھولا۔ نانا اب اور بھی شدت سے یاد آتے ہیں۔''

''آپ جب مشرقی پاکستان چلے گئے تو میں کبھی کبھی ان کے پاس جایا کرتا تھا۔ بڑے باتونی ہو گئے تھے۔ جب بولنا شروع کرتے تو دو دو گھنٹے مسلسل بولتے رہتے۔''

''پھر بھی تم ان کے پاس جایا کرتے تھے؟''

''پٹنہ میں کوئی اور بزرگ تو تھا نہیں اس لیے ان کے پاس چلا جاتا تھا۔ عجیب بات ہے انھوں نے کبھی شکایت نہیں کی کہ آپ انھیں چھوڑ کر چلے آئے۔''

''میں کرتا ہوں شکایت۔ وہ بھی اپنے آپ سے۔ جب میں ڈھاکہ چلا گیا تو پیچھے میرا سایہ رہ گیا۔ اسی سے باتیں کرتے ہوں گے۔ وہ تم سے نہیں مجھ سے باتیں کرتے تھے۔ تم میں انھیں خلیل نظر آتا ہوگا۔ رشتہ داری جو ٹھہری۔''

''اس دعوت میں آئے ہوئے کئی مہمانوں سے آپ کی واقفیت تو ہوگی؟'' نثار نے پوچھا۔ لیکن اسے اپنے سوال میں دلچسپی نہیں تھی۔ دروازے کے اوپر لگے خوب صورت پوسٹر پر اس کی نگاہیں تھیں جہاں کسی نے سرخ روشنائی سے بڑے حرفوں میں لکھ دیا تھا:

Happy Marriage Firdousi and Junaid

وئیم فوسٹر اب جنید بن چکا تھا۔

خلیل کی نگاہ بھی ادھر گئی۔ وہ سوچنے لگا ہم کالے، گورا رنگ کیوں اتنا پسند کرتے ہیں؟ کیونکہ ہم پر ہمیشہ گوروں کی حکومت رہی؟ جب انگریز نہیں تھے تو گورے چٹے ترک ہی دلی کے تخت پر تھے۔ حاکم و محکوم کا رشتہ کیا کیا نہیں سوچنے سمجھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

''مہمان جو آئے ہوئے ہیں ان میں سے کئی کو میں پہچانتا ہوں لیکن مخاطب ہونا نہیں چاہتا۔ وہ بھی

شاید ایسا ہی پسند کرتے ہیں۔" خلیل نے بے دلی سے جواب دیا۔

"تو آپ قربت کس سے محسوس کرتے ہیں؟"

"ایرانیوں سے۔" خلیل نے جواب دیا اور ہنس پڑا۔

"ایرانیوں سے کیوں؟"

"میں جس شہر میں رہتا ہوں وہاں ایک ایرانی تھے۔ ان کی بیوی انگریز تھیں۔ فریدوں اور ایلس۔ یہی نام تھے دونوں کے۔ میں سوئمنگ پول کبھی کبھی جاتا ہوں۔ وہیں فریدوں سے ملاقات ہوگئی۔ انھوں نے گھر پر بلایا۔ پھر اکثر جانا ہوا۔ ہر بار ایسا لگا جیسے انھیں میرا انتظار تھا۔ وہ ہر موضوع پر گفتگو کرتے۔ فارسی کے قدیم شاعروں کا کلام مجھے دکھاتے اور ان کا کلام بھی مجھے سناتے جو میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ خیر، جب بھی میں گیا اور کبھی بن بلائے بھی تو ان کی مسکراہٹ میرا استقبال کرتی۔ طہران سے ان کی والدہ سوہن حلوہ انھیں بھیجتی تھیں۔ چونکہ یہ مٹھائی مجھے پسند ہے اس لیے اسے وہ خاص طور پر میرے لیے بچا کر رکھتے تھے۔ اس کے برخلاف میرے پڑوس میں ایک بنگلہ دیشی اور ایک ہندوستانی کنبہ ہے۔ جب بھی ان کے یہاں جانا ہوتا ہے بغیر فون کیے ان کے پاس نہیں جاتا۔ اسی لیے ایرانیوں سے مجھے قربت محسوس ہوتی ہے۔ ایک بار فریدوں نے ملکہ نور جہاں کی تصویر دکھائی جو دیگر ایرانی عورتوں کے ساتھ تھی۔ انھوں نے کہا کہ ایران کی مشہور عورتوں میں وہ بھی شمار ہوتی ہے۔"

نثار کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی تھی۔ خلیل کے نوکیلے چہرے پر سیاہ و سفید داڑھی اسے بڑی بھلی لگی اور اس کی بے چین آنکھوں کی معصومیت میں کشش تھی۔ اس کے سر کے بال اب بھی سیاہ تھے۔ حالانکہ وہ خضاب نہیں لگاتا تھا۔

"مغل بادشاہوں سے کیا آپ کی رشتہ داری بھی تھی؟" نثار نے طنز کیا۔

"نہیں، تمھاری ہے۔ ان ہی سے تمھاری شکل ملتی ہے۔"

اس طرح کی نوک جھونک دونوں میں اکثر ہوتی تھی۔

"گورا رنگ مجھے بھاتا تو میں کالی سوڈانی عورت سے کیوں شادی کرتا۔ ماضی سے آپ کو اتنا پیار ہے میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔"

"انسانی رشتے کی ایک بنیاد ماضی کی روشنیاں بھی ہیں۔ وہاں سب کچھ تاریک نہیں ہوتا۔"

"لیکن پنجاب، کشمیر، سندھ، سرحد اور سندھ کے جو لوگ اس ملک میں ہیں ان سے آپ کو قربت نہیں محسوس ہوتی؟" نثار کے چہرے پر ایک تمسخرانہ مسکراہٹ تھی۔

"ان میں اب مجھے سمجھنے والے نہیں رہے۔"

"خلیل بھائی آپ سنکی ہوگئے ہیں۔ کیا آپ اب بھی ہندوستانی ہیں؟"

"دل میں ایک گوشہ ایسا ضرور ہے جو وہی ہے جسے تم نے ابھی کہا۔"

"یہ کیسے ممکن ہو گیا؟"

"نثار! میرا شعور اسی ملک میں بیدار ہوا۔ اسی کی زمین میں میرے آباؤ اجداد دفن ہیں۔ میں مانتا ہوں کہ وہاں بابری مسجد شہید کر دی گئی اور شاید چند اور مسجدوں کو بھی یہی صدمہ پہنچا ہو۔ فسادات میں مسلمانوں کے جان و مال کا زیاں ہوتا رہتا ہے لیکن وہاں جو آزادیِ تقریر و تحریر ہے، کلاسیکل رقص، اعلیٰ فلم، اسٹیج ڈراموں کا جو معیار ہے، اور فنون کی جو قدر دانی ہے، ان کی وجہ سے دل ہندوستان کی جانب کھنچتا ہے۔ ایک اور حقیقت جس کا اعتراف ضروری ہے۔ دل کے اس گوشے میں اکثر کوئی میخیں ٹھونکتا رہتا ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"جب آنکھوں کے سامنے گجرات کی اس مسلمان حاملہ عورت کا خیال آتا ہے، جس کے پیٹ کو چاک کر کے کوئی ہندو اس کے بچے کو نکال کر عورت کے سامنے اسے ذبح کر رہا تھا۔ گجرات سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اس مقتولہ عورت سے ایک تاریخی رشتہ ہے جو میرے نام کی وجہ سے جڑا ہے۔"

"پاکستان کی پھر اہمیت کیا ہو گی آپ کے دل میں؟"

"وہاں جو آمریت رہی ہے اور مذہب کے نام پر جو جہالت روا ہے، وہ مجھے اس سے دور کر رہے ہیں۔ پھر بھی ایک زنجیر ضرور ہے، جس نے دل کو اس سے جکڑ رکھا ہے۔"

"پھر آپ کیا ہیں؟"

"بہت ساری سوچ، خواہشوں اور آرزوؤں کا مجموعہ۔ افلاطون نے سقراط کی بابت لکھا ہے کہ زہر کھا کر مرنے سے پہلے اس سے اس کے شاگردوں نے پوچھا آپ کی موت کے بعد آپ کو کس طرح دفن کیا جائے؟ اس نے جواب دیا جس طرح تم سب کی خواہش ہو بشرطیکہ میں تمھاری گرفت میں آ سکوں۔ ظاہر ہے اس کے سارے افکار، نظریئے اور تصورات ہی افلاطون تھے ورنہ جسم کی کیا حقیقت تھی۔ کسی حد تک یہ نکتہ ہر انسان کی بابت درست ہے۔ چونکہ بقول گرامچی ہر انسان دانشور ہے، اسی لیے مرنے کے بعد اس کی سوچ کچھ دنوں کے لیے کسی نہ کسی شکل میں زندہ رہ جاتی ہے۔"

"لگتا ہے انگلستان میں آپ نے سب کچھ پا لیا۔ افلاطون اور اٹلی کا دانشور گرامچی بھی آپ کی سوچ میں آ گئے۔" نثار نے کہا۔

خلیل کے چہرے پر کسی گہری سوچ کا سایہ آ گیا۔ اس نے اپنے کوٹ کے کالر پر گرے ان سفید ذروں کو ٹھوکا مار کر جھاڑا جو اس کے سر کی خشک جلد سے گرے تھے۔ اپنے ایک پیر کو آہستہ آہستہ ہلاتے ہوئے وہ بولا، "طبعی رشتوں سے روحانی جڑیں نکل کر ملک کی سرزمین میں پیوست ہو جاتی ہیں۔ انگلستان میں مجھ پر بڑی

مصیبتیں آئیں لیکن اس ملک سے جو کچھ ملا اس سے ہمیشہ اور ہر بار ہمت توانا ہو گئی۔ اسی نے مجھے اب تک زندہ رکھا ہے۔"

"تو آپ انگریز ہو گئے۔" نثار نے طنز کیا اور اپنے سر کی پشت کو دونوں ہتھیلیوں پر ٹکا دیا۔

"ہاں اس ملک کی شہریت حاصل کرنا انگریز بنا دیتا ہے، تو جو تم نے کہا وہ درست ہے۔"

"خلیل بھائی! جو آپ نے کہا وہ بس کسی حد تک ہی صحیح ہے۔"

خلیل نے مایوسانہ آہستہ سے سر ہلایا اور بولا "جو تم نے کہا اس سے انکار نہیں۔ اتنی مدت کے بعد لگتا ہے حاشیے پر بیٹھا ہوں۔"

"پھر آپ مرکز میں کیوں نہیں جاتے؟"

"جب ان کے ساتھ ہوتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ انھیں میری ضرورت نہیں۔ لیکن مجھے ضرورت رہتی ہے۔ ایک ایسے رشتے کی حاجت جس میں وہ بن بلائے میرے یہاں آ جائیں۔ اگر میں کچھ کھا رہا ہوں تو اس میں بلا تکلف شریک ہو جائیں۔ یہ سمجھنا چھوڑ دیں ہم ان پر بار ہو رہے ہیں۔"

"ایسا ہونا ممکن نہیں۔"

"ممکن ہے۔ سنو۔ دولہا اب تقریر کر رہا ہے۔"

(زیرِ تصنیف ناول سے چند صفحات)

☆☆☆

کچھوااور سمندر

نجم الحسن رضوی

کچھوے کو جیسے ہی سمندر کی نیلی چادر پر رکھا گیا، اس نے ذرا سی گردن باہر نکالی، پانی کا ذائقہ چکھا، پھر اپنے ہاتھ پاؤں پھیلائے اور دونوں بازوؤں کو حرکت دیتا تیزی سے آگے کی طرف تیر گیا۔ بچوں نے تالیاں بجائیں ان میں وہ لڑکی بھی تھی جس سے کچھ دن پہلے اس کی دوستی ہوئی تھی۔ وہ جب بھی نظر آتی اس کے ہاتھوں میں کوئی کچھوا ہوتا۔ چھوٹا یا بڑا۔ وہ اسے ریت پر رکھ دیتی اور کچھوا ہولے ہولے اِدھر اُدھر سرکتا رہتا۔ لیکن جیسے ہی اسے چھوا جاتا وہ فوراً اپنے ہاتھ پاؤں سمیٹ کے اپنے سبز یا سیاہی مائل بھورے خول میں چھپ جاتا۔ اسے یہ سب کچھ بہت اچھا لگتا تھا لہٰذا وہ روز روز اِدھر آنے لگا حالانکہ وہ جس گھر میں کام کرتا تھا وہاں اسے صرف اس شرط پر رکھا گیا تھا کہ وہ کبھی اس وقت تک گھر سے باہر قدم نہیں نکالے گا جب تک اسے کسی کام سے باہر نہیں بھیجا جائے گا۔ اس کا اصل کام بوبو کی دیکھ بھال تھا جو ہر وقت اس کے اوپر سوار رہتا۔ لیکن کبھی کبھی وہ بغاوت پر اُتر آتا اور چپکے سے گھر سے باہر نکل آتا کھلی فضا میں سانس لینے کو۔ اس کے مالکوں کا گھر بھی قریب ہی تھا، سمندر کے سامنے۔ لیکن لڑکی جس عمارت میں رہتی تھی وہ ساحل کے اس حصے میں واقع تھا جو بریک واٹر کے قریب تھا۔ بریک واٹر کی وجہ سے اس طرف سمندر تقریباً سویا سویا سا لگتا کیونکہ وہاں اونچی لہروں کا گزر نہیں تھا۔ اس نے پہلی بار اس لڑکی کو اس وقت دیکھا جب کچھوؤں کو سمندر میں چھوڑا جا رہا تھا۔

وہ لڑکی بہت سے لوگوں کے ساتھ جن میں بہت سے بچے بھی تھے، گھٹنوں گھٹنوں تک نیلے پانی میں کھڑی تھی۔ کچھوے ان کے ہاتھوں سے نکل کے تیرتے ہوئے کھلے سمندر کی طرف جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد سب واپس جانے لگے۔ لڑکی ان کے پیچھے پیچھے تھی۔ اس کا چہرہ پانی کی پھوار سے بھیگا ہوا تھا۔

وہ آگے بڑھا اور لڑکی سے پوچھا، ''آپ لوگ کچھوؤں کو سمندر میں کیوں پھینکتے ہیں؟''

لڑکی ٹھٹکی، رکی، پھر اسے غور سے دیکھنے لگی ...... بھیگا نیکر، بھیگا بدن، بھیگے بال ...... سوالوں سے بھری آنکھیں۔ لڑکی نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور مسکرائی، پھر بولی، ''تمھیں نہیں پھینکیں گے۔''

وہ ہنسا۔ ''میں کوئی کچھوا تھوڑا ہی ہوں۔''

لڑکی نے پوچھا، ''پھر کیا ہو؟''

''لڑکا ہوں۔'' وہ بولا، ''قریب ہی رہتا ہوں۔ ایک گھر میں کام کرتا ہوں۔''

''کیا کام؟''

اس نے سوچا کہ بتائے کہ کیا کام مگر پھر اسے اپنا کام بتاتے ہوئے شرم سی آئی۔ اسے خود اس کام سے بڑی گھن آتی تھی لہٰذا اس نے بات بدل دی۔

''میں وہاں کام نہیں کرنا چاہتا۔'' اس نے کہا۔

لڑکی نے پوچھا، ''تمھیں کچھوؤں سے ڈر تو نہیں لگتا، کیا نام ہے تمھارا؟''

اس نے جواب دیا، ''ویسے تو سب لوگ مجھے چھوٹو کہتے ہیں، آپ جو چاہے کہہ لیں۔''

لڑکی نے کہا، ''چھوٹو بھی اچھا ہے مگر تم چھوٹو تو نہیں لگتے، اچھے خاصے بڑے ہو۔''

اس نے کہا، ''جب یہاں آیا تو چھوٹو ہی تھا۔ ایک بار اونٹ سے گر کے زمین پر گھسٹتا چلا گیا تو شاید ٹانگیں لمبی ہو گئیں۔ پھر بھی نام چھوٹو ہی رہا۔''

لڑکی ہنسی، ''میں تمھیں 'کچھوا گھر' میں کام دلا سکتی ہوں۔ میرے پاپا اس کے نگراں ہیں۔ تم کچھوؤں کا خیال رکھنا، وہ تمھارا خیال رکھیں گے۔ مگر دیکھو کل قمیض پہن کے آنا۔''

لڑکی سمندر کے کنارے ذرا اونچائی پر واقع عمارت میں چلی گئی جسے اس نے 'کچھوا گھر' کہا تھا۔

جب وہ چلی گئی تو چھوٹو کو خیال آیا کہ اس نے تو لڑکی کا نام بھی نہیں پوچھا تھا۔ وہ اس سے عمر میں بڑی تھی مگر باتیں ایسے کر رہی تھی جیسے اس کی دوست ہو...... اس کے برابر کی۔

لڑکی سچ مچ اس کی دوست بن گئی۔ وہ اسے چھوٹل کہنے لگی۔

''چھوٹل کیوں؟'' اس نے پوچھا۔

''تم مجھے ٹرٹل ہی لگتے ہو، کچھوے سے، کھوئے ہوئے۔ اگر تمھیں بھی سمندر میں چھوڑ دیا جائے تو شاید سیدھے اپنے گھر تک پہنچ جاؤ۔'' وہ بولی۔

وہ ہنسنے لگا، ''میں تو کشتی میں آیا تھا جی۔ اب تو مجھے یاد نہیں کہاں سے آیا تھا۔ چھوٹا تھا نا...... کچھ دن اونٹوں کے ساتھ رہا۔ ایک بار اونٹ سے گر گیا تو کمر میں بہت چوٹ آئی تب سے اونٹوں سے پیچھا چھوٹ گیا۔ اب ارباب کے گھر میں کام کرتا ہوں۔''

''کیا کام کرتے ہو؟''

''بڑا گندہ کام ہے جی۔'' اس نے کہا، ''جانوروں کی گندگی صاف کرنا، انھیں چارہ دینا، گھوڑے، گدھے، بکریاں اور مرغیاں...... ہر وقت ان ہی کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔''

اس نے جان بوجھ کے بوبو کا ذکر نہیں کیا کیونکہ ایک تو گھر والوں نے اسے منع کر رکھا تھا کہ بوبو کے

بارے میں کسی کو کچھ نہ بتایا جائے۔ دوسرے اس کے خیال ہی سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔

"تو تم وہ کام چھوڑنا چاہتے ہو؟" لڑکی نے ایک کچھوے کے منہ سے نیلی پولی تھین کا ٹکڑا نکالتے ہوئے پوچھا۔

"کیا کچھوے پلاسٹک کھاتے ہیں؟" چھوٹل نے لڑکی کا سوال نظر انداز کر کے اپنا سوال داغ دیا۔

لڑکی نے کہا، "نہیں، بے چارے معصوم کچھوے پلاسٹک نہیں کھاتے، وہ نیلی تھیلی کو جیلی فش سمجھ کے کھانے کی کوشش کرتے ہیں جس سے اس کا دم گھٹ جاتا ہے۔ 'کچھوا گھر' اسی لیے بنایا گیا ہے کہ کچھوؤں کو مرنے سے بچایا جائے۔ یہاں ان کا خیال رکھا جاتا ہے۔ تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟" لڑکی نے پھر پوچھا، "تم یہاں آنا چاہتے ہو چھوٹل؟"

چھوٹل کو اپنا نام اچھا لگا اور اس لڑکی کے منہ سے تو بہت ہی اچھا۔

اس نے پھر اس کا سوال نظر انداز کر کے پوچھا، "میں آپ کو کیا کہوں؟"

لڑکی نے کچھوے کے سبز خول کو کپڑے سے چمکایا اور پھر اسے گھر کے اندر بنے ہوئے بڑے سے تالاب میں تیرنے کے لیے چھوڑ دیا۔

"میرا نام تو ذرا مشکل ہے مگر تم مجھے آپا کہو نا!" وہ مسکرائی۔

"آپا" وہ بولا۔ "میں وہاں نہیں رہنا چاہتا مگر وہ لوگ مجھے آنے نہیں دیں گے۔ کسی دن موقع دیکھ کے میں خود ہی......"

"بھاگ آؤں گا۔" آپا نے ہنس کے فقرہ مکمل کیا...... کسی کچھوے کی طرح۔

اب چھوٹل کو جب بھی موقع ملتا وہ 'کچھوا گھر' پہنچ جاتا۔ 'کچھوا گھر' میں بہت سے کچھوے تھے۔ چھوٹے، بڑے، ہر طرح کے۔ پورا تالاب ان سے بھرا ہوا تھا۔ انڈوں سے باہر آنے کے بعد بڑے ہونے تک کچھوؤں کو تالاب میں رکھا جاتا، پھر انھیں سمندر میں چھوڑ دیا جاتا۔

اسے بھی کچھوے اب اچھے لگنے لگے تھے۔ وہ آپا کے پاس بیٹھ کے ان سے کھیلتا رہتا۔ آپا کچھوے کے گندے خول کو برش سے صاف کر کے چمکا دیتی۔ کبھی کسی کچھوے کی گردن یا اس کے بدن کا کوئی حصہ زخمی ہوتا تو اس پر مرہم لگا دیتی۔ ایک دن اس نے آپا کو ایک بڑے سے کچھوے کی پیٹھ پر کچھ لکھتے دیکھا۔

"یہ آپ کیا لکھ رہی ہیں؟" اس نے پوچھا۔

آپا ہنسی، "کچھوے کی طرف سے دنیا والوں کو محبت کا سندیسہ بھیج رہی ہوں۔ جو کچھ میں نے لکھا ہے اس کا مطلب ہے، مجھے چاہو، مجھے بچاؤ۔ انھیں محبت سے بچایا جا سکتا ہے۔ اگر انھیں چاہا نہ گیا تو یہ مر جائیں گے۔" آپا نے کچھوے کی پیٹھ تھپتھپا کے کہا۔

، کچھوے کو تھوڑی دیر بعد سمندر میں چھوڑ دیا گیا۔ کچھوا اپنی سبز پیٹھ پر سرخ لفظوں سے بنا ہوا پیار کا سفینہ اٹھائے خوشی خوشی پانی میں تیرتا چلا جا رہا تھا۔

آپا نے مسرت سے کہا: "سمندر کے پاس سب دکھوں کا علاج ہے!"

آپا کی طرح چھوٹل بھی کچھوؤں کو صاف کر کے، سنوار کے خوش ہوتا۔ پھر ایک دن جب وہ ایک بڑے کچھوے کو، جس کی پیٹھ کا خول کیچڑ میں لت پت تھا، پانی سے دھو رہا تھا کہ اچانک اسے لگا جیسے کچھوے نے اپنے منہ سے 'غوں غاں' جیسی آواز نکالی، پھر وہ پلٹ گیا۔ اور اس نے دیکھا وہ تو بوبو تھا جس کی دیکھ بھال اس کے ذمے تھی۔ وہ اس وقت بوبو کی گندگی صاف کر رہا تھا۔ بوبو کی عمر تین سال تھی مگر نہ وہ بیٹھ سکتا تھا نہ چل سکتا تھا، بس گھٹنوں کے بل گھسٹ سکتا تھا۔ اس کا سر بڑا مگر منہ چھوٹا سا تھا اور ہونٹوں کی بناوٹ میں پیدائشی نقص کی وجہ سے اس کے دانت باہر رہتے تھے۔ چھوٹل کو اس کی شکل سے ڈر لگتا تھا مگر اس کا کام یہی تھا کہ وہ اس کے ساتھ رہے، اسے کھلائے پلائے اور ساری گندگی صاف کرے اور جب کبھی بوبو غصے میں اپنے دانت اس کے بدن میں گاڑ دے تو چلائے اور روئے بھی نہیں۔ ان دونوں کو گھر کے اندر آنے یا احاطے کے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ بوبو کی ماما کو اس کی شکل دیکھتے ہی دورہ پڑ جاتا تھا لہٰذا اسے پیدائش کے وقت سے ہی اس سے دور رکھا گیا تھا۔

مہینے میں صرف ایک بار ایک ڈاکٹر جانوروں کے احاطے میں آ کے بڑی رازداری سے بوبو کا معائنہ کرتا اور کچھ دوائیں دے کر چلا جاتا۔ مگر اس کا خیال تھا کہ ذہنی اور جسمانی دونوں اعتبار سے بوبو کی معذوری نا قابلِ علاج تھی۔

کبھی کبھی چھوٹل بوبو سے دور بھاگنا چاہتا مگر بھاگ نہیں سکتا تھا۔ احاطے کے اندر کوٹھری میں دونوں کے بستر ساتھ ساتھ تھے۔ جب بوبو سو جاتا تو چھوٹل اپنا گدّا گھسیٹ کے ذرا دور لے جاتا، کھڑکی کے پاس۔ مگر جیسے ہی اس کی آنکھ لگتی وہ دیکھتا کہ بوبو کا بدن اچانک بڑھنا شروع ہو گیا ہے۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں لمبے ہوتے جا رہے ہیں، چہرہ پھول کے اور خوفناک ہو گیا ہے۔ اس کے دانت بھی اسے پہلے سے زیادہ لمبے اور نوکیلے لگتے۔ وہ بھاگنا چاہتا مگر بوبو اچانک لپک کے اسے دبوچ لیتا اور اس کی بدبو اس کے گرد گھیرا ڈال دیتی۔ وہ چیخ مار کے اٹھ بیٹھتا اور دیکھتا کہ بوبو گھسٹ گھسٹ کے اس کے بستر تک پہنچ گیا ہے۔ وہ گندگی سے لتھڑا پڑا ہے اور کوٹھری میں شدید بدبو پھیلی ہوئی ہو۔

پھر وہ کھلی ہوا میں سانس لینے کو کوٹھری سے باہر نکل آتا اور جانوروں کے احاطے میں سیاہ آسمان تلے اونٹ اور گدھے اور بکرے اور بکریاں کالی پرچھائیوں میں لپٹے نظر آتے اور ایک اور قسم کی ناگوار سی بو اس کے نتھنوں میں بھر جاتی مگر وہ گرم ہوا کے باوجود احاطے میں کھڑا رہتا اور دور سے آنے والی سمندر کی لہروں کی آواز اسے نئی ہمت اور حوصلہ دیتی۔

چھوٹل نے کئی بار سوچا کہ وہ آپا سے بات کرے کہ وہ اس مصیبت سے چھٹکارا پانے میں اس کی مدد کرے۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ اس سے کچھ کہتا، آپا نے ایک دن کہا، "لو بھئی چھوٹل، میں کل واپس جا رہی ہوں۔"

"مگر کیوں؟" چھوٹل نے پوچھا۔

آپا نے جواب دیا، "میری چھٹیاں جو ختم ہو گئیں۔ کالج کھلنے والا ہے۔"

چھوٹل پریشان ہو گیا، "مگر آپ تو......"

آپا نے کہا، "بھئی میں تو عارضی طور پر پاپا کے پاس رہنے آئی تھی۔ اس دوران رضاکارانہ طور پر 'کچھوا گھر' میں کام بھی کیا۔ مگر اب تو جانا پڑے گا۔"

اس دن کئی کچھوؤں کو سمندر میں چھوڑا گیا جن کی پشت پر آپا نے لال قلم سے آخری بار دنیا کے نام محبت کا سندیس لکھا تھا۔ جانے سے پہلے آپا نے چھوٹل کو پلاسٹک کا ایک چھوٹا سا تھیلا تحفے میں دیا۔ اس میں بسکٹوں کا ایک ڈبہ، ایک لال قلم اور ایک ٹی شرٹ تھی۔ جس پر 'کچھوا گھر' کا نشان چھپا ہوا تھا۔

"اس سے تمھیں میری یاد آئے گی۔" آپا نے اس کا گال تھپتھپا کے کہا، "خوش رہا کرو۔"

آپا کے جانے کے بعد چھوٹل نے سمندر کی طرف جانا چھوڑ دیا۔ ویسے بھی بوبو اسے کب چھوڑتا تھا۔ اسے بھوک لگتی تو وہ منھ سے زور زور غوں غاں کی آوازیں نکالتا اور زمین پر اپنا سر مارتا۔ پھر اپنے دونوں مڑے ہوئے پاؤں گھسیٹتا اس کے پاس آ جاتا۔

چھوٹل کو بوبو کے ساتھ گھر کے اندر جانے کی اجازت تو نہیں تھی مگر وہاں سے دونوں کے لیے کھانا ضرور آ جاتا تھا، مگر کسی کسی دن جب گھر میں مہمان آئے ہوئے ہوتے کھانا آنے میں دیر ہو جاتی تھی اور بوبو اس روز اسے بہت تنگ کرتا۔

اس دن بھی شاید وہاں کوئی دعوت تھی۔ شام سے بے شمار گاڑیاں والا کے آس پاس کھڑی تھیں اور ٹھنڈے کمروں میں مہمانوں کی خاطر مدارات جاری تھی لہٰذا گھر والے جانوروں کے احاطے میں رہنے والوں کو بھول گئے۔

جب سب گاڑیاں چلی گئیں اور ہر طرف خاموشی چھا گئی تو چھوٹل نے باہر جھانکا۔ باہر ہوا ٹھنڈی تھی۔ آدھے چاند کی ملگجی روشنی میں اس نے دیکھا کہ گھر کے پھاٹک کی بتیاں بجھا دی گئی تھیں اور آس پاس کوئی نہ تھا۔ بالکل خاموشی تھی، بس احاطے میں بیٹھا ہوا کوئی جانور گردن ہلاتا تو اس کے گلے کی گھنٹی سے ضرور ہلکی سی آواز نکلتی۔ اچانک بوبو سوتے سے اٹھ گیا اور چھوٹل کو ڈھونڈنے کے لیے ادھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ اس کے منھ سے نکلتی غوں غاں کی فریاد اتنی دردناک تھی کہ چھوٹل لپک کے اندر آ گیا۔ بوبو شاید بھوک سے بے حال ہو رہا تھا۔ چھوٹل نے دیکھا کوٹھری میں کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا، اچانک اسے آپا کے دیے ہوئے تحفے کا خیال آیا جس میں بسکٹ کا

ایک ڈبہ کب سے رکھا ہوا تھا۔ اس نے بسکٹ نکال کے بوبو کو کھلایا۔ پھر اندر کی گرمی، گھٹن اور بدبو سے پریشان ہو کے اس نے سوچا کیوں نہ وہ بوبو کو لے کر سمندر کی طرف چلا جائے، کھلی ہوا میں۔ اس نے آپا کا دیا ہوا تھیلا اٹھایا اور بوبو کو پہیوں والی چھوٹی گاڑی پر لادا جو اسے گھر والوں نے اسے ٹہلانے کے لیے دی تھی۔ چھوٹل بوبو کو لے کر باہر نکلا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے آرام پا کے بوبو فوراً ہی سو گیا۔

چھوٹل آہستہ آہستہ سمندر کی طرف گیا۔ چاندنی میں 'کچھوا گھر' کے قریب سمندر کی لہریں بار بار ریک واٹر سے ٹکرا کے جھاگ اڑاتی عجیب انداز سے پیچھے کو لوٹ رہی تھیں جیسے کچھ شکایت کر رہی ہوں۔

چھوٹل کو خیال آیا۔ پتہ نہیں آپا کے جانے کے بعد کچھوے سمندر میں چھوڑے جاتے ہوں گے یا نہیں، کیا پتہ سمندر کو یہی شکایت ہو!

اچانک بوبو نے شور مچا دیا۔ اس کے منھ سے وہی ناقابل فہم آوازیں نکل رہی تھیں جو بھوک لگتے وقت نکلتی تھیں۔ چھوٹل نے دیکھا، بوبو پھر گندہ ہو گیا تھا۔ اس نے اسے گاڑی سے نکالا، اسے کھانے کو ایک اور بسکٹ دیا اور پھر اسے الٹ کے مستعدی سے گندگی صاف کرنے لگا۔ کپڑے سے اس کی پیٹھ صاف کرتے ہوئے اچانک اسے عجیب خیال آیا...... آپا نے کہا تھا، سمندر کے پاس سب دکھوں کا علاج ہے۔ اس نے بوبو کو آپا کی دی ہوئی سفید قمیض میں لپیٹ دیا جس پر 'کچھوا گھر' کا نشان بنا ہوا تھا۔

بوبو نے یکا یک بے چین ہو کے ایک بار پلٹا کھایا تو اسے لگا جیسے وہ بوبو نہ ہو کوئی کچھوا ہو جس کے بدن کا ہر عضو سمندر کے لمس کے لیے بیتاب تھا۔ شاید سمندر اسے پکار رہا تھا۔

چھوٹل نے جلدی سے آپا کے تھیلے میں سے لال قلم نکالا اور سوچا کہ اس کی پیٹھ پر وہی بات لکھے:
'مجھے چاہو، مجھے بچاؤ'

مگر پھر بے اختیار اس کا دل بھر آیا۔ وہ بوبو کو گلے لگا کے رونے لگا۔ اسے کچھ لکھنا کہاں آتا تھا۔

☆☆☆

ہم کو شکستِ حرفِ تمنا کا غم نہیں

عذرا اصغر

کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ بُرا وقت انسان پر کہہ کے نہیں آتا۔

اور یہ "بُرا وقت" ہی تھا شاید کہ جو شمس النساء ظہیر پر بنا کہے، بنا چاہے آن پڑا تھا۔ اس وقت تو انھوں نے یونہی محسوس کیا تھا۔ رنگوں کے پرت تو کھلتے کھلتے ہی کھلتے ہیں۔

اجنبی دیس، انجانے لوگ، ان دیکھے راستے۔ نہ ٹھکانوں کا پتہ نہ راستے معلوم۔ ایسے میں کسی نے فون پر کہا۔

"ہماری ایک چھوٹی سی تنظیم ہے۔ ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی کہ اس کا قیام عمل میں آیا ہے۔ بنیادی طور پر ہم شاعر ادیب لوگ نہیں ہیں۔ لیکن فن کے قدر دان ضرور ہیں۔ آپ کا ادب میں ایک مقام ہے اور ہماری خواہش ہے کہ آپ ہماری بزم میں تشریف لائیں اور ہمیں اپنے شاہکار فن پارے سے محظوظ فرمائیں۔ آنے والے سنیچر کو شام سات بجے۔"

دعوت دینے والی ناصرہ بشیر تھی۔

شمس النساء ظہیر کو بات کچھ عجیب سی لگی۔ خاتون نے اپنی تنظیم میں شامل جن اراکین کے نام لیے تھے ان میں سے ماسوائے ایک فرد کے اس نے کبھی کسی کا نام تک نہیں سنا تھا۔ وہ بھی بس نام ہی تھا۔ شناسائی بالکل نہ تھی۔ شعروادب سے تعلق واسطہ بھی نہیں۔ پھر کیوں؟ بھلا کیوں بلایا جارہا ہے؟

بڑی ملائمت سے اس نے کہا "دیکھیے خاتون! اس سنیچر کو تو میں فارغ نہیں ہوں۔ معافی چاہتی ہوں۔ پھر کبھی سہی۔ انشاءاللہ"

بات بن گئی اور وقت ٹل گیا۔ وہ مطمئن ہوگئی اور لمحہ بھر بعد بھول بھی گئی۔

کون تھیں وہ۔ کس نے بلایا تھا۔ مگر ٹھیک ایک ہفتے بعد پھر ان ہی کا فون آگیا۔ بلانے پر اصرار۔ تعریف۔ تشکر۔

اس نے کہا "معاف کیجیے گا خاتون! میں شرمندہ ہو رہی ہوں۔ اصل میں مجھے کل ہی ایک غیر ملکی دورے پر روانہ ہونا ہے۔ اس لیے ایک بار پھر معذرت چاہوں گی۔"

"واپسی کب تک ہوگی؟" پوچھا گیا۔

"دیکھیے، کہہ نہیں سکتی۔ دو تین ہفتے تو یقیناً لگ ہی جائیں گے۔"

"چلیے ٹھیک ہے۔ ہم آپ کی واپسی کا انتظار کریں گے۔"

بات تو ایک بار پھر بن گئی مگر اسے ذہنی طور پر خاصی الجھن ہوئی۔ ادبی زندگی کے پچیس تیس سالہ دور میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ کسی محفل میں جانے سے کترا رہی تھی۔ وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ اس نے سوچا۔ مگر بات سمجھ میں نہ آسکی۔ شاید اس گریز کی وجہ غیر ادبی ماحول ہو۔ مگر ایسا ہی اگر ہوتا تو اسے اتنے اصرار سے بلایا کیوں جاتا؟ وہ تذبذب میں پڑ گئی۔

'ہو سکتا ہے صاحبِ ذوق لوگ ہوں۔' ایک سوچ آئی۔

'یقیناً پڑھا ہوگا، تبھی تو اتنا اصرار ہے۔'

مختلف پہلوؤں سے اس نے تھوڑی دیر غور کیا پھر ایک لمحہ بعد ہی اس کے ذہن کی سلیٹ سے سب کچھ صاف ہو گیا۔ وہ بھول گئی۔ وہ، جو ادب کی شناور تھی۔ ادب کے سمندر میں غوطہ زن ہو گئی۔ لکھتی، پڑھتی، دفتر جاتی۔ کبھی کبھار شہر میں منعقد ہونے والی کوئی ایک آدھ اچھی سی تقریب میں شرکت کر لیتی۔ شاید دو ہفتے گزر گئے یا اس سے بھی کچھ اوپر۔ تب پھر وہی فون آ گیا۔ اسے تھوڑی سی کوفت ہوئی تو، مگر اس نے بھرپور اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہامی بھر لی۔ بار بار کی معذرت خواہی کو اس نے خود ہی تکبر پر محمول کیا تھا۔ پتہ پوچھا اور وقتِ مقررہ پر پہنچنے کا وعدہ کر لیا۔

پروگرام سے ایک روز پہلے جو فون اسے آیا اس نے اس کے مطمئن دل میں کسی غیر محسوس خطرے کی ہلکی سی گھنٹی بجائی۔ دل کی دھڑکن کانوں سے گرم گرم بھاپ بن کر نکلی۔ فون کے دوسرے سرے پر نہایت مہذب لب و لہجے اور شستہ زبان میں جو صاحب بات کر رہے تھے انھوں نے اپنا نام امجد طفیل ہاشمی بتایا۔

امجد طفیل ہاشمی کی آواز کے سحر نے اسے لمحہ بھر کو کچھ دہلا سا دیا۔ ایک سہم سا اس نے اپنے وجود پر طاری ہوتا محسوس کیا۔

جانے یہ کیسا احساس تھا۔ وہ سمجھ نہ سکی۔

وہ...... شمس النساء ظہیر، جو پچھلے پچیس تیس برسوں سے ادب کی شاہراہ پر مردانہ وار مردکی حاکمیت کے معاشرے میں اپنے فن اور مضبوط قوتِ ارادی کا علم سنبھالے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ آگے..... اور آگے۔ وہ افسانے کی ایک قدآور لکھاری تھی۔ شاعری میں مقام رکھتی تھی اور ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھی۔ کئی غیر ملکی دورے اور کانفرنسیں بھگتا چکی تھی اور اپنی پینتالیس سالہ زندگی کی کشتی کو تن تنہا دنیا کے سمندر میں کھے رہی تھی۔ خود میں آسودہ اور مطمئن تھی۔ بچپن سے جوانی تک جو ماحول اسے ملا تھا اس میں نہ کوئی الجھن تھی نہ رکاوٹ۔ اس کے ماں باپ حتیٰ کہ دادا تک کا تعلق صوت و حرف سے رہا تھا۔ مگر یہ وہ زمانہ تھا جب عورت کو معاشرے میں سہولیات

موجود نہیں تھیں۔ وہ انسان ہوتے ہوئے بھی انسان نہیں تھی۔ صرف عورت تھی۔ مرد کے تابع فرمان۔ اسے بڑی شدت سے ادراک تھا۔ اس کی ماں تعلیم یافتہ تھیں۔ ادیب تھیں۔ مگر معاشرے کی مروجہ پابندیوں کا شکار تھیں۔ وہ تخلیق کرتی تھیں لیکن اپنے نام سے چھپوا نہیں سکتی تھیں۔ اپنے نام کو نمایاں نہ کر سکتی تھیں۔

"کسی غیر مرد کی زبان پر ان کا نام کیوں آئے؟"

چنانچہ جہاں آرا بیگم اپنے نام کے تین حرف لکھتی تھیں...... ا،ج،ب۔

گھریلو ذمہ داریوں اور معاشرتی دباؤ نے اس کی ماں کی ذہانت کو نگلا دیا تھا۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ اس کی ماں اس کے باپ کے مقابلے میں زیادہ ذہین اور عقل والی تھی۔ مگر اسے وہ مواقع حاصل نہیں تھے جو اس کے باپ کو حاصل تھے۔ یہ سب دیکھتے ہوئے اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنا گھر نہیں بسائے گی۔ وہ مجرد رہے گی۔ وہ معاشرتی دباؤ سے آزاد رہ کر نہ صرف یہ کہ زندگی گزارے گی بلکہ کھلے ذہن کے ساتھ تخلیق کاری کرے گی۔ اس کے خیال میں شادی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنتی تھی۔ کسی بھی فن کار کو یا فن کی خدمت کرنی چاہیے یا گھر بسا کر خالصتاً ایک گھریلو بن جانا چاہیے۔ "شادی" اس کے نزدیک ایک ایسا شعبہ زندگی تھا جس کے ساتھ کسی دوسرے شعبے کو اپنانا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے لیے پہلا رستہ...... پہلا شعبہ چنا اور اپنے فیصلے پر مطمئن ہو گئی۔ اس کے قدم کبھی ایک لمحے کو بھی لڑکھڑائے نہیں تھے۔ کسی فرد بشر نے اسے متاثر نہیں کیا تھا۔ کسی شخص نے اس کے دل دروازے کی کنڈی نہیں بجائی تھی۔ لیکن یہ مرد...... انجانا...... ان دیکھا شخص امجد طفیل ہاشمی جو بظاہر بڑی سادگی سے کہہ رہا تھا۔

"محترمہ کل ہونے والی نشست میں میزبانی کے فرائض اس خاکسار کو ادا کرنا ہیں۔ میں آپ کے نام اور کام سے کسی حد تک آگاہ تو ہوں لیکن تھوڑی سی مزید معلومات مل جائیں تو مجھ جیسے کم علم کو سہولت رہے گی۔ میری میزبانی کا بھرم رہ جائے گا۔"

لمحہ بھر کو اس نے توقف کیا، پھر سنبھل کر بولی، "آپ پوچھتے جائیے۔ میں جواب دیتی جاؤں گی۔"

امجد طفیل ہاشمی نے گمبھیر، ٹھہری ٹھہری آواز اور نرم شگفتہ لہجے میں چھوٹے چھوٹے سوال کرنا شروع کیے۔

کب سے لکھ رہی ہیں؟ کیا کیا لکھا؟ تخلیق نگاری کے محرکات؟ ادب کے حوالے سے آپ کا نقطۂ نظر؟ معاشرے میں عورت کو کیا مقام ملنا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔ سوالات کے دوران اس نے امجد طفیل ہاشمی کی آواز اور لہجے کے سحر سے خود کو کافی حد تک آزاد کر لیا تھا۔

اگلے دن وہ بتائے ہوئے پتے پر جا پہنچی۔ پھاٹک پر کھڑے پہرے دار نے مؤدب ہو کر اس کا استقبال کیا اور اسے گھر کے اندرونی دروازے تک پہنچا کر واپس چلا گیا۔ مگر گھر کے اندر کوئی بھی اس کے استقبال

نے لیے آگے نہ بڑھا۔ وہ خاموشی سے جا کر ایک خالی کرسی پر ٹک گئی۔

بڑے سے کمرے میں چاروں طرف دیوار کے ساتھ بچھے صوفوں پر ہر عمر کے مرد اور عورتیں بیٹھی آپس میں دھیرے دھیرے محو گفتگو تھیں۔ اس نے ادھر اُدھر نظر دوڑائی مگر کوئی ایک شخص بھی شناسا دکھائی نہ دیا۔ تھوڑی دیر بعد جانے کس جانب سے، لمبا گہرے کلر کا کرتا اور علی گڑھ کٹ سفید پاجامہ پہنے دراز قامت، چھریرا بدن، مسکراتا چہرے والا پچاس پچپن کے لگ بھگ عمر کا شخص اسٹیج پر آیا اور مائیک سنبھال کر بولنے لگا۔

'ارے! یہ تو وہی آواز ہے۔' اس نے جیسے چونک کر خود سے کہا۔ 'یعنی امجد طفیل ہاشمی۔'

پروگرام جاری رہا۔ مختلف لوگ بلائے جاتے رہے۔ کچی پکی شاعری۔ شوقیہ گلوکاری۔ وہ بیٹھی الجھتی رہی۔ اس کا تو کوئی ذکر ہی نہیں تھا۔

بھلا کیوں آئی تھی میں؟ کاش! ایک بار اور انکار کر دیتی۔ کتنی غیر سنجیدہ محفل ہے!

پھر آہستہ سے وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور بغیر کچھ کہے دروازے سے باہر نکل آئی۔ جاتے جاتے پیچھے سے کسی نے کہا۔ "سنئے۔ ابھی کھانا لگا چاہتا ہے۔ آپ ٹھہریئے پلیز۔ اور ہاں آپ کا تعارف؟"

"شمس النساء ظہیر۔" اس نے نرمی سے کہا اور گیٹ سے باہر آ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

گھر آ کر تھوڑی دیر تک اس پر کبیدگی طاری رہی اور پھر جیسے سب رفت گزشت ہوا۔ دن، ہفتے، مہینے اور سال گزر گئے۔ پھر ایک دن اس کے سیل فون پر ایک چھوٹا سا میسج آیا۔

'آپ کیسی ہیں؟' میسج کے نیچے اس نے نمبر اور نام دیکھا۔ جانے کب اور کیسے اس نے یہ نام اور نمبر محفوظ کر لیا تھا اور کیوں؟ پتہ نہیں! یہ کون ہے؟ کوشش بسیار کا یہ سلسلہ تسلسل کے ساتھ جاری ہو گیا۔ روز یا دوسرے دن ایک دو میسج آ جاتے۔ وہ الجھتی۔ میسج پڑھتی اور چپ سادھ لیتی۔ اُدھر سے اصرار ہوتا، 'پلیز! کچھ کہیے۔ ایک لفظ۔ میسج کی رسید۔ ہُوں، ہاں۔ چلیے ڈانٹ ہی دیجیے۔'

آخری میسج پر وہ ہنسے بنا نہ رہ سکی۔

خاصا دلچسپ آدمی ہے۔

اس نے میسج کر کے پوچھا، "محترم! جانے کیسے آپ کا نام میرے سیل میں درج ہے۔ میسج بھی ملتے ہیں مگر مجھے یاد نہیں آ رہا آپ کون ہیں اور کیوں میرے پاس آپ کا نمبر محفوظ ہے؟ کیا ہم کبھی ملے ہیں؟"

اس کی تو جیسے عید ہو گئی۔ فوراً اس نے تفصیلی فون کر ڈالا۔

اف! وہی گمبھیر، بھرناک آواز۔ وہی شائستہ لہجہ۔ شستہ اندازِ تکلم۔

اپنے وجود میں وہ لرز کے رہ گئی۔ کسی ان ہونے خدشے نے اس کے اندر کروٹ لی۔ مقصد بات ٹالنا تھی یا خود کو جھٹلانا۔

اس نے پوچھا، "چلیے آپ سے بات ہو ہی گئی ہے تو اتنا بتا دیجیے کہ وہاں پر میرے بلائے جانے کا سبب کیا تھا؟ میں جاننا چاہتی ہوں۔ الجھن سی ہے۔"

اس نے ڈھیروں معذرت کی۔ میزبان تو وہ نہ تھا، پھر بھی معذرت خواہ تھا۔ شرمندہ تھا۔

کہنے لگا، "کیا میں آپ سے مل سکتا ہوں؟ شاید میں اپنی خجالت مٹا سکوں۔"

"مگر کیوں؟ اس کی کیا ضرورت ہے؟ بس بات ختم ہو گئی۔"

"جی نہیں۔ بات تو اب شروع ہو رہی ہے۔" اس کا جملہ معنی خیز تھا۔

پھر بھی ناسمجھ بن کر اس نے پوچھا، "وہ کیسے؟"

"اگرچہ یہ ساری واردات ایک چھوٹی سی غلط فہمی پر مبنی ہے مگر میزبانوں کی اس کوتاہی اور بداخلاقی پر میں بے حد شرمسار ہوں۔ میں مل کر معذرت کرنا چاہتا ہوں اور ویسے بھی خاتون، مجھے آپ نے بہت متاثر کیا ہے۔"

یکا یک اسے لگا جیسے وہ پگھل رہی ہے۔ شکست کھا رہی ہے۔ وہ اس شخص سے گریز کرنا چاہتی تھی لیکن کر نہیں پا رہی تھی۔ جانے کون سی نادیدہ طاقت اسے کھینچ رہی تھی۔

اس نے شاید غیر ارادی طور پر کہا، "کسی دن تشریف لایئے۔"

اور پھر اگلے ہی روز...... کہ وہ چھٹی کا دن تھا، وہ دروازے پر کھڑا پوچھ رہا تھا۔

"میں اندر آ سکتا ہوں؟"

اور وہ...... شمس النساء ظہیر ایسے آگے بڑھی جیسے صدیوں سے اس لمحہ کی اور اس شخص کی منتظر تھی۔

☆☆☆

کارڈ بورڈ کے انسان

صدیق عالم

میں جوان تھا اور آسمان میں ان دنوں وہ تمام ستارے چمکتے تھے جو صرف ایک جوان شخص کو نظر آتے ہیں جب ایک دن میں نے کالج اسکوائر پر کارڈ بورڈ پہنے ہوئے کچھ انسان دیکھے۔ انھوں نے تاریک عینک سے اپنی آنکھیں ڈھک رکھی تھیں اور ایک دوسرے کے ساتھ سرگوشی میں باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

ان میں سے میں کسی کو نہیں پہچانتا تھا، مگر مجھے اطلاع مل چکی تھی کہ اس طرح کے لوگ ان دنوں شہر میں نظر آنے لگے ہیں۔ وہ جب میرے قریب سے گزرے تو میں نے سوچا، وہ شاید رک کر اپنے اس عجیب وغریب لباس کا جواز پیش کریں گے مگر انھوں نے کمال خوبی کے ساتھ مجھے نظر انداز کر دیا اور یہیں ممکن تھا کہ میں پیچھے رہ جاتا کہ میں نے یا شاید میرے اندر کے دوسرے انسان نے انھیں مخاطب کر لیا۔

"اس عجیب وغریب لباس کے ذریعے آپ لوگ شاید کوئی خاص پیغام دینا چاہتے ہیں؟"

"کسے؟" ان میں سے ایک نے میری طرف سر موڑے بغیر کہا اور رک گیا جس کے ساتھ ہی ان سب کے پاؤں تھم گئے تھے جیسے اس کا اس طرح رکنا دوسروں کے لیے کسی ملٹری افسر کے حکم کا درجہ رکھتا ہو۔

"شاید اس ملک کو، شاید کچھ خاص لوگوں کو، یا شاید آپ کا اپنا یہ خاص طریقہ ہو، ہر چیز کو در گزر کر دینے کا۔ کارڈ بورڈ، اس کے ساتھ جینا آسان تو نہیں۔"

"آپ نے تو اتنا کچھ کہہ دیا کہ ہمارے لیے کچھ بھی باقی نہیں بچا۔" سامنے کھڑے چھدری داڑھی والے آدمی نے کہا۔ وہ میری آنکھوں کے اندر تاک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کارڈ بورڈ کے سوراخوں سے بڑے ہی مضحکہ خیز انداز میں باہر لٹک رہے تھے۔ اس کے پیچھے ایک عورت کھڑی تھی جس کے سینے کو کارڈ بورڈ سپاٹ کرنے میں ناکام رہا تھا۔ "اور مشکل یہ ہے کہ آپ نے آخر میں ہماری جھولی میں ایک ایسا سوال ڈال دیا ہے جس کا جواب ہم دینا نہیں چاہتے۔" یہ اس عورت کی آواز تھی۔

سڑک پر رات کے لیمپ کی مناسب روشنی تھی، پھر بھی وہ لوگ صاف دکھائی نہیں دے رہے تھے یا ممکن ہے وہ ایک خاص ڈھنگ سے چلتے ہوئے ایک دوسرے کے سائے میں چھپنے پر قادر ہو گئے ہوں۔ اچھی طرح پہچان میں آ جانا، یا اپنی طرح کے مسئلے تو کھڑا کر ہی سکتا ہے۔

"آپ چپ ہیں؟" عورت کارڈ بورڈ سے آواز آئی۔ "شاید ہماری گفتگو ختم ہو گئی ہے۔ تو ہم جا سکتے ہیں؟"

''نہیں نہیں۔'' میں نے آگے بڑھ کر ان سے قریب ہونے کی کوشش کی۔ شاید میرے اس عمل کو انھوں نے پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا تھا کیونکہ کارڈ بورڈ کے سائے دو قدم پیچھے ہٹ کر پھر سے تھم گئے۔ ہمارے درمیان فاصلہ پہلے کی طرح برقرار رہا۔

''آہ!'' میں نے اپنی گردن کو دونوں ہاتھوں سے سہلاتے ہوئے کہا، ''میرا دم گھٹ رہا ہے۔ آپ اپنے پیچھے ایک ایسی خاموشی چھوڑے جا رہے ہیں جو کسی دبی ہوئی چیخ کی طرح میرے پرخچے اُڑا دے گی۔''

صاف ظاہر تھا، میں سٹری پر اتر آیا تھا۔ انھوں نے اسے محسوس تو کیا ہوگا، مگر ان کی خاموشی اور سنجیدگی میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا۔ آخر کار داڑھی والے شخص نے ایک لمبی سانس لی اور کہا، ''آپ بھی شاید اس شہر کے دوسرے لوگوں کی طرح ایک صاف باطن انسان بننے کی اداکاری کر رہے ہیں۔''

''تو آپ لوگ اس شہر کے نہیں اور آپ لوگوں کا ایک خاص نقطۂ نظر ہے۔''

''بے شک ہم نے یہیں جنم لیا، مگر ایک صبح جو اور دوسری صبحوں سے کچھ الگ نہ تھی ہم لوگوں نے محسوس کیا کہ گرچہ ہم شہر کے مختلف مقامات میں رہتے آئے ہیں اور زندگی میں ہماری کبھی ملاقات نہیں ہوئی، ہمارے درمیان کچھ قدریں تو مشترک ہیں ہی جن کی بنیاد پر ہم ایک دوسرے کو جان سکتے ہیں۔ تو ہم نے ان نشانات کی تلاش کی جو ہمیں ایک دوسرے تک لے جا سکتے تھے اور آپ دیکھ رہے ہیں، ہماری ایک مخصوص تعداد بن چکی ہے اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم اس قابل ہو چکے ہیں کہ اپنی مخصوص شناخت کا دعویٰ پیش کر سکیں۔ لیکن یہ آپ کس نقطۂ نظر کی بات کر رہے ہیں؟ کیا انسان کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ کسی نقطۂ نظر کا قیدی بن کر جیے۔ کیا صرف انسان بننا کافی نہیں؟''

''پھر یہ کارڈ بورڈ؟'' میں نے اپنی زمین کو مضبوط کرتے ہوئے کہا۔ ''اور وہ نشانات جنھوں نے آپ لوگوں کو ایک جگہ جمع ہونے پر مجبور کیا۔ اور وہ مخصوص شناخت جس کا آپ دعویٰ کر رہے ہیں۔ کیا اتنا سب کچھ کہہ کر میں نے اپنی حد سے تجاوز کیا ہے؟''

''شاید!'' ایک دوسرے شخص نے اپنی نارنجی عینک کے اندر سے کہا۔ ''ممکن ہے آپ جو کہہ رہے ہیں وہ اپنی جگہ ٹھیک ہو۔ مگر یہ آپ بھی تسلیم کریں گے کہ ہر شخص کا چیزوں کو دیکھنے اور سمجھنے کا اپنا ایک خاص طریقہ ہوتا ہے۔ اس طرح ہم جو دیکھتے ہیں وہ کسی حد تک خود ہماری ایجاد ہوتی ہے، وہ چیز نہیں ہوتی جسے ہم دیکھتے ہیں۔''

اور وہ دھیرے دھیرے کشادہ سڑک پر آگے بڑھتے گئے، دور تک ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوتے ہوئے جیسے وہ اتنی دوری سے بھی ایک خاص اشاراتی زبان میں مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہے ہوں۔

اور پیارے قارئین! لگے ہاتھوں میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ میں کارڈ بورڈ کے اس ہجوم میں بے شمار عورتوں کو بھی دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا، آخر کار، کیا واقعی عورتوں کو ان کی زبان مل گئی ہے!

میں گھر لوٹا تو تھک چکا تھا۔ مجھے پتہ تھا آگے بھی ان لوگوں سے میری ملاقات ہونے والی ہے اور میں ابھی سے سوچ رہا تھا کہ شاید آگے ہمارے بیچ گفتگو کے لیے کچھ ٹھوس زمینیں تیار ہو جائیں، یا ہماری گفتگو کے موضوعات بدل جائیں۔ میں اپنے کمرے میں دیر رات تک جاگتا رہا اور رات جیسے جیسے گہری ہوتی گئی باہر سے کتوں کے بھونکنے کی آوازوں میں شدت آتی گئی۔ اس کے ساتھ ہی رک رک کر چلتی ٹرینوں کا شور بھی سنائی دینے لگا جو دن کے وقت سنائی نہیں دیتا تھا ان ٹرینوں کی پٹریاں کبھی شہر کی سرحد پر واقع تھیں جس کے دوسری طرف بنجر میدان یا تاریک کھائیاں تھیں۔ لیکن شہر اب اس قدر پھیل گیا ہے کہ یہ پٹریاں اب اس کے عین وسط میں آ گئی ہیں۔ میں نے اپنے پرانے دنوں کے ان لمحوں کو کھنگالنے کی کوشش کی جن میں ان کارڈ بورڈ کے انسانوں جیسی کوئی بات کبھی پیش آ چکی ہو۔ میں تیس برس کا ہو چکا تھا اور ایک طرح سے میرے پاس پیچھے مڑ کر تکنے کے لیے بہت کچھ بن چکا تھا۔ مگر میں نے دیکھا، میرے ماضی میں ایسا کچھ بھی نہ تھا۔ صرف ایک میکانکی انسان، ایک روبوٹ جس نے گھڑی کے کانٹوں کے ساتھ جینے کی کوشش کی، سوچ کے ان ڈھانچوں کو قبول کیا جو وراثت میں اسے ملے تھے اور اب جب کہ دور کتے بھونک رہے تھے اور رہ رہ کر ٹرین کے گزرنے کی آوازیں آ رہی تھیں میں دیکھ رہا تھا کہ میں ایک روبوٹ بننے کے حق سے بھی محروم ہو گیا تھا جو ایک پروگرام کے تحت عمل کرتا ہے۔

رات جانے کب میں سو گیا، جانے کب صبح ہو گئی۔ میری آنکھیں کھلیں تو مجھے لگا میرا جاگنا خود میرے لیے حیرت کا ایک نیا ماحول لے کر آیا تھا۔ میں نے محسوس کیا، آسمان آج ضرورت سے زیادہ نیلا تھا اور کوے ضرورت سے زیادہ کالے، گھر کے لوگ کچھ زیادہ ہی گھر کے لوگ نظر آ رہے تھے۔ مگر پھر جانے کیوں ان کی گفتگو میں مجھے کچھ ایسی بات محسوس ہوئی جس نے میرے کان کھڑے کر دیے۔

صبح کے اخبارات میں کچھ لوگوں کے زندہ جلائے جانے کی خبریں تھیں جنھیں کارڈ بورڈ پہنے پایا گیا تھا اور حکومتِ وقت نے، جس کے جبڑے کسی لکڑ بگھے سے کم تیز نہیں ہوتے، اس نے دعویٰ کیا تھا کہ ان کارڈ بورڈ کے انسانوں کو زندہ جلا دیا جانا ضروری تھا کیونکہ انھوں نے اپنے جسموں سے ڈائنامائٹ لگا رکھے تھے۔

ہاں، میں نے تائید میں سر ہلایا، ڈائنامائٹ تو انھوں نے اپنے وجود سے لپیٹ رکھا تھا جو ان لکڑ بگھوں کے جبڑوں کو چور کر دینے کے لیے کافی تھا، مگر تھے تو وہ کارڈ بورڈ کے انسان۔ ان کا جلا دیا جانا بالکل فطری تھا۔ اور یہ دیکھ کر میں ایک ایسے ملک میں جاگا تھا جس پر لکڑ بگھوں کی حکمرانی تھی میں نے اپنا سر جھکا لیا اور ایک کارڈ بورڈ کا ڈبہ جس کا جوتا نکال لیا گیا تھا، اٹھا کر اس میں انسانی منھ اور آنکھوں کے لیے سوراخ بنائے جو بالکل مضحکہ خیز نظر آ رہے تھے کیونکہ ان کے اندر انسانوں جیسی کوئی بات نہ تھی۔ تو میں نے قدِ آدم آئینے کے اندر بیٹھے اس دوسرے آدمی سے کہا جو میری طرح ہی ایک دوسرا کارڈ بورڈ کا انسان بنانے میں مصروف تھا۔

''یہاں سے ایک نئی کہانی شروع ہوتی ہے۔ اب کارڈ بورڈ تو نظر آئیں گے مگر اندر کا انسان جل چکا ہوگا۔''

شُدھی کرن

اختر آزاد

"اگر تم سب اپنی سلامتی چاہتے ہو تو یہاں سے چلے جاؤ۔ یا پھر گھر لوٹ آؤ، شدھی کرن کا کام جاری ہے۔ پھر نہ کوئی تمھیں ملیچھ کہے گا اور نہ کوئی تمھیں یہاں سے جانے کے لیے ہی کہے گا، کیوں کہ تب ہم میں اور تم میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔"

....

"ماں یہ ملیچھ کیا ہوتا ہے اور شدھی کرن کسے کہتے ہیں؟"

"کیوں؟ کیوں پوچھ رہا ہے یہ سب تو؟"

"نہیں ماں، بس ایسے ہی..... اپنا وہ پانڈے سر کا بیٹا ہے نا، آج اسکول میں کہہ رہا تھا کہ اس کے گھر میں کل رات میٹنگ ہوئی تھی جس میں بہت سارے لوگ جمع ہوئے تھے۔ سب یہی کہہ رہے تھے کہ یہ ملیچھ باہر سے آئے ہیں جس نے ہماری اس دھرتی کو اپوتر کیا ہے۔ انھیں اگر یہاں رہنا ہے تو اپنا شدھی کرن کرانا ہوگا۔ ورنہ دھرتی کی شدھتا کے لیے اس کا خون بہایا جائے گا۔ اس کا گوشت چیل کوؤں میں بانٹا جائے گا۔"

"نہیں، نہیں! پانڈے سر کے گھر ایسی میٹنگ نہیں ہو سکتی۔ وہ تو برسوں سے گاؤں والوں کو اچھائی اور سچائی کا درس دیتے آئے ہیں۔"

"بھگوان کو پرسن کرنے کے لیے ملیچھوں کے خون سے ہولی کھیلنا ضروری ہے ماں؟ ماں، پھر ہم لوگ کیوں نہیں کھیلتے؟ اگر ہولی ہم لوگوں کا بھی تیوہار ہوتا تو کتنا مزا آتا۔ ہم بھی ملیچھوں کے خون سے ہولی کھیلتے۔ ماں تم بتاتی کیوں نہیں کہ یہ ملیچھ کون ہے اور شدھی کرن کسے کہتے ہیں؟"

وہ سوچ میں پڑ گئی ماں کو سوچ میں غرق دیکھ کر وہ بھی سوچ میں ڈوب گیا کہ اس کی بات سن کر ماں یکایک گم صم کیوں ہو گئی۔ اس نے صرف پانڈے سر کے گھر میں میٹنگ کے بارے میں بتایا تھا اور ساتھ ہی ساتھ ملیچھ اور شدھی کرن کے بارے میں پوچھا تھا۔ اگر نہیں بتانا تھا تو نہیں بتاتی۔ گم صم ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ پھر یکایک خیال آیا کہ ماں اکثر کہتی رہتی ہے کہ اسے بلڈ پریشر ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ بلڈ پریشر کیا ہوتا ہے۔ لیکن اسے لگا کہ کہیں اس کی ماں کو بلڈ پریشر تو نہیں ہو گیا۔ وہ دوڑ کر گلاس میں پانی بھر لایا اور دروازے سے دوا نکال کر

ماں کو کھلانے لگا۔ دوا کھانے کا وقت بھی ہو چکا تھا اور اس کی بات سننے کے بعد بہت حد تک بلڈ پریشر بھی بڑھ گیا تھا۔ اس لیے ماں نے دوا کھالیا۔ کچھ دیر کے بعد ان کی طبیعت بحال ہوگئی۔

''ماں تمھیں کیا ہو گیا تھا؟ میری بات سن کر تم خاموش کیوں ہو گئیں؟ میں نے آج تمھیں تنگ بھی نہیں کیا تھا ماں۔ میں نے تو صرف پلیچھ اور شدھی کرن کے بارے میں پوچھا تھا۔ تم کہو گی تو اب سے یہ بھی نہیں پوچھوں گا۔ کل کلاس میں پانڈے سر سے ہی پوچھ لوں گا۔''

بیٹے کی بات سن کر ماں کی تو جیسے جان ہی نکل گئی۔ انھوں نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

''نہیں بیٹا نہیں! تم اب اس سے نہیں پوچھو گے۔ ورنہ جو ہولی کل آنے والی ہے وہ آج ہی آنے گی اور بھگوان کو پرسن کرنے کے لیے وہ لوگ، آج ہی اس دھرتی کو خون سے لال کر دیں گے۔''

بیٹے نے سوچا کہ بھگوان کو خوش کرنے کے لیے وہ لوگ دھرتی کو لال کریں یا پیلا، ہولی آج کھیلیں یا کل۔ اس میں ماں کو پریشان ہونے کی کیا پڑی۔ اس لیے اس نے کہا۔ ''وہ لوگ بھگوان کو پرسن کرتے ہیں تو کرنے دو ماں۔ اس میں تمھیں کچھ سوچنے کی کیا ضرورت؟ میں بھی دھرتی کو لال ہوتا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔ بولو نا ماں، دیکھنے دو گی نا تم مجھے؟''

''بیٹے ایسی باتیں نہیں کرتے۔ تم ابھی چھوٹے ہو۔ بارہ سال کی عمر میں تمھیں یہ سب کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا۔ بس کل سے تم اسکول نہیں جاؤ گے اور یہ بات کسی کو نہیں بتاؤ گے۔ ایک دو دن کے اندر ہم لوگ یہاں سے کسی دوسری جگہ چلے جائیں گے۔''

''ایک دو دن کے اندر کیوں ہم تو ہولی دیکھ کر جائیں گے۔ پھر دوسری جگہ کیوں؟ ابو کے پاس چلیں گے۔'' پھر کچھ سوچتے ہوئے، ''ابو کیسے ہیں ماں؟ جب وہ یہاں سے گئے تو میں کتنا چھوٹا تھا؟ میں اس وقت چلتا تھا یا نہیں؟ ابو، ابو کہتا تھا یا نہیں؟'' پیار سے ماں کا چہرہ چھوتے ہوئے، ''تمھیں تو سب یاد ہوگا نا ماں؟''

''ہاں بیٹا، مجھے سب یاد ہے۔'' یہ کہتے ہی ان کی آنکھوں کے سامنے شوہر کا چہرہ گھوم گیا۔ وہ رونے لگیں۔

''تم رو کیوں رہی ہو ماں، میں چلوں گا تمھارے ساتھ۔'' ماں کے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے، ''ابو رہتے کہاں ہیں ماں؟ تم تو وہاں گئی ہوگی نا؟ راستہ تو معلوم ہے نا؟ ایسا نہیں کہ چلتے چلتے راستہ بھٹک جائیں۔ ابو بھی نہ ملیں اور یہاں بھی نہ لوٹ سکیں۔ پھر کہاں جائیں گے ماں؟''

بیٹے کی بات سن کر ماں کی آنکھیں ایک بار پھر ڈبڈبا گئیں۔ انھوں نے سوچا کہ بیٹے سے بہت دنوں تک اس بات کو چھپا کر رکھنا اچھا نہیں ہے۔ کبھی نہ کبھی تو بتانا ہی پڑے گا۔ یہ سوچ کر وہ بیٹے کو بانہوں میں بھرتی ہوئی بولیں۔ ''بیٹے، ابو سے ملنے کا ارادہ دل سے نکال دو۔ وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ میں نے تم سے جھوٹ بولا

ہے کہ وہ دوسرے شہر میں کام کرتے ہیں۔ کبھی کبھی رات میں جب تم سوجاتے ہوتو آتے ہیں اور صبح تمہارے اٹھنے سے پہلے چلے جاتے ہیں...... اصل میں آج سے دس سال قبل بھی ایک ایسی ہی میٹنگ اس گاؤں میں ہوئی تھی اور ہولی کے دن ملیچھوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی تھی۔ ملیچھ یہ لوگ ہم مسلمانوں کو کہتے ہیں۔ جانتے ہو کس لیے؟ کیوں کہ ہمارے آباو اجداد جو ہندو تھے، اسلامی مساوات سے اتنے متاثر ہوئے کہ مسلمان ہو گئے۔ انھیں ہندوؤں نے ملیچھ کا نام دے دیا اور واپسی کے سارے راستے بند کر دیے۔ لیکن جب یہ دیکھا کہ اس طرح سے تو ایک ایک کر کے سارے ہندو، مسلمان ہو جائیں گے، تب ہندو گل بند ہونا شروع ہوئے جس کے نتیجے میں 'شدھی کرن تحریک' کی بنیاد پڑی۔ اس کے تحت وہ ہندو جو مسلمان ہو گئے تھے، اسے ڈرا دھمکا کر دوبارہ ہندو بنایا گیا۔ تمہارے ابو اپنی ضد پر اڑے رہے کہ ہم جان دے دیں گے لیکن واپس اس گھر میں نہیں جائیں گے جہاں بھگوان کے درشن کے لیے مندر میں گھسنے نہیں دیا جاتا۔ کچھ لوگوں نے ملک چھوڑ دینے کا بھی مشورہ دیا۔ لیکن وہ اس کے لیے بھی تیار نہیں ہوئے کہ ہندوستان سب کا ہے.......... آخر کار ہندوؤں نے انھیں مار کر شدھی کرن کی ہولی جلائی۔ کسی طرح ان کے ایک ہندو دوست نے مجھے اور تمھیں بچا کر مہینوں اپنے گھر میں رکھا۔ پھر جب حالات کچھ اچھے ہوئے وہ ایک رات مجھے اس گاؤں میں چھوڑ گئے۔ اس وقت یہاں مسلمانوں کی تھوڑی آبادی تھی۔ تب سے میں اس گاؤں میں ہوں۔ اس وقت تو صرف دو سال کا تھا۔''

ماں، بیٹے کو آغوش میں بھر کر چومنے لگتی ہے۔ بیٹے کی آنکھوں میں بھی آنسو اتر آتا ہے۔ کچھ دیر تک دونوں خاموش رہتے ہیں۔ پھر بیٹا اپنے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے کہتا ہے۔ ''ماں! یہ لوگ ہم مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل کر بھگوان کو پرشن کرتے ہیں۔ ان کا بھگوان کس مٹی کا بنا ہے جو انسانوں کا خون پیتا رہتا ہے۔ آخر ہم لوگوں نے بگاڑا کیا ہے؟'' وہ بولتے بولتے رک کر سوال کر بیٹھتا ہے۔

''بیٹے یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ تو شروع سے ہوتا آیا ہے۔ حضرت محمدؐ کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ جب ہندوستان میں مسلم حکمرانوں نے اپنی موجودگی کا دھماکے دار احساس دلایا اور ذات پات، چھوا چھوت، اونچ نیچ کا درس قریب نو سو سالوں تک پڑھایا تو یہاں کے مظلوم جن کے ساتھ دھرم کے نام پر صدیوں سے استحصال ہوتا آیا تھا، اس میں سے بہت سارے مسلمان ہو گئے۔ ان ہی مسلمانوں کو دوبارہ ہندو بنانے کی کوشش میں بھاگلپور کے کھیتوں میں بیج کی جگہ انسانوں کی کھوپڑی بوئی گئی۔ جمشید پور میں بچوں اور عورتوں سے بھری ایمبولینس جلائی گئی۔ مراد آباد میں نمازیوں سے بھری عید گاہ کو نشانہ بنایا گیا۔ بمبئی، بھیونڈی، میرٹھ اور نہ جانے کتنے شہروں میں انسانوں کی ہولیکا جلائی گئی۔ فیض آباد میں بابری مسجد کا انہدام کیا گیا۔ گودھرا کے نام پر گجرات میں فرقہ پرستی کا ایسا وحشیانہ کھیل کھیلا گیا جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔''

''لیکن ماں پانڈے جی تو ایک دن کلاس میں بتا رہے تھے کہ بابری مسجد کی جگہ پہلے رام مندر تھا جسے

بابر نے توڑ کر مسجد بنوایا تھا۔ وہ کبھی مسجد تھی ہی نہیں۔ مندر تھا تو پھر ماں ہندوؤں نے اپنے ہی مندر کو کیوں توڑ دیا۔ کیا اس سے اس کا بھگوان رام خوش ہوا ہوگا؟''

بیٹے نے اپنے بستے سے رامائین نکال کر رام کی تصویر کو غور سے دیکھا۔ پھر ماں کے سامنے بڑھا دیا۔ ماں نے تصویر پر ایک نظر ڈالی اور کہا۔

''مسجد یا مندر ٹوٹنے سے بھگوان رام خوش ہوا ہوگا یا نہیں، وہ تو وہی جانیں، جس نے اس جگہ کو رام کا جنم استھان بتا کر اس کی بنیاد میں اینٹ پتھر کی جگہ لاکھوں انسانوں کی ہڈیاں ڈالی ہیں۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ ان پرانی یادگاروں کو جسے بچا کر رکھنا ہم سب کی ذمہ داری ہے۔ اگر بچا نہیں پاتے تو بزدل ہیں۔ اور اگر مسمار کرتے ہیں تو قاتل ہیں۔ ایسے قاتلوں کو تاریخ کبھی معاف نہیں کرے گی۔'' کچھ دیر وہ دم لینے کے لیے رکتی ہیں، پھر کہتی ہیں: ''بیٹے وہ لوگ مسلم حکمرانوں کی یادگاریں ایک ایک کر کے ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہندوستان کی قسمت کا تاج جو ساری دنیا میں اپنی مثال آپ ہے اس پر بھی لوگوں کی زعفرانی نظر لگی ہوئی ہے۔''

اس کے ساتھ ہی ہنی مون کا زمانہ انھیں یاد آجاتا ہے۔ تاج محل میں کھنچوائی ہوئی بہت ساری تصویریں ان کی آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ہیں۔ ایک بار پھر شوہر کا چہرہ ان کی آنکھوں کے سامنے ڈوبنے ابھرنے لگتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ ان کے چہرے پر اداسی کے بادل چھا جاتے ہیں جو آنکھوں سے ہو کر برسنے کے لیے بیتاب نظر آتے ہیں۔

''ایک اور بات بتاؤں ماں؟ پانڈے جی کا بیٹا یہ بھی کہہ رہا تھا کہ ملیچھوں نے ساری دنیا میں دہشت پھیلا رکھی ہے۔ پنٹاگن اور ورلڈ ٹریڈ سینٹر ان لوگوں نے ہی توڑا ہے۔ کیا یہ سچ ہے ماں؟''

بیٹے کی بات سن کر وہ پہلے کچھ دیر چپ رہیں۔ مسکرائیں۔ پھر بولیں۔

''ہاں بیٹا! جاپان کے ہیروشیما اور ناگاساکی پر بم ہم نے ہی گرائے ہیں۔ بوسنیا میں نسل کشی ہم نے ہی کروائی ہیں۔ افغانستان پر دہشت گرد ہونے کا الزام ہم نے ہی لگائے ہیں۔ کیمیائی ہتھیار کے بہانے عراق کو نیست و نابود کرنے کے منصوبے ہم نے ہی بنائے ہیں۔ جمہوریت کا گھناؤنا ناٹک رچا کر صدام کا تختہ ہم نے ہی الٹے ہیں۔ ہم نے ہی فلسطین اور لبنان کے مظلوموں پر ظلم ڈھائے ہیں۔ ہر وہ کام جو خلاف انسانیت ہے، ہم نے ہی کیے ہیں۔ اور اب تو دنیا کی اقوام بھی یہی سمجھ رہی ہیں کہ مسلم دہشت گرد ہوتے ہیں۔ اصل میں ہر طرف سے یلغار کیا جا رہا ہے۔ ہندوؤں کے ساتھ ساری دنیا کو اس بات کا ڈر ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کی شرح پیدائش میں اگر روک نہیں لگائی گئی تو دنیا میں سب سے زیادہ تعداد ان کی ہو جائے گی۔ اس لیے سب نے منصوبہ بند طریقے سے ساری دنیا میں ایک طرح کی مہم چھیڑ رکھی ہے کہ مسلمانوں کو شدھی کرن کے نام پر اور کہیں دہشت گردی کے نام پر گھسیٹا جائے اور دنیا کے منظر نامے کو دھندلا کر ایک نیا منظر نامہ ترتیب دیا جائے۔ مسلمانوں کے مورال کو کمزور کیا

جائے تاکہ ہر میدان میں اسے شکست دی جا سکے۔''

''ماں یہ دہشت گرد کیا ہوتا ہے؟'' اس نے کچھ اس طرح سے پوچھا ہے، آج وہ سب کچھ جان لینا چاہتا ہو جو مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے۔

''بیٹا پہلے مجھے بھی نہیں معلوم تھا۔ لیکن اخباروں میں پڑھ پڑھ کر اور ریڈیو ٹی وی سے سن سن کر اب یہ معلوم ہو گیا ہے کہ وہ جو اپنی دھرتی کی حفاظت میں اپنی جانیں قربان کرتے ہیں، دوسروں سے اپنی تہذیب اور شناخت کی خاطر لوہا لیتے ہیں۔ اپنے مذہب پر چلتے ہوئے حق کے راستے پر شہید ہوتے ہیں، انھیں جاں بازوں کو شہید یا مجاہد نہ کہہ کر آج کی عالمی اصطلاح میں ''دہشت گرد'' کہا جاتا ہے۔ لیکن میری ڈکشنری میں دہشت گرد کے دو معنی ہیں۔ آر ایس ایس اور وہائٹ ہاؤس۔ لیکن یہ سب کہاں کسی کو نظر آتا ہے۔ نظر آتی ہیں وہ تنظیمیں جو مذہب کی روشنی میں علم کی شمع روشن کرتی ہیں۔ وہ مدرسے جہاں غریب و نادار بچے پڑھتے ہیں۔ جہاں دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے ملتی ہے۔ اس مدرسے پر دہشت گرد ٹریننگ کیمپ ہونے کا الزام تھوپا جاتا ہے۔ جو عیش و عشرت سے الگ سادی زندگی کی عمر بھر پیروی کرتے ہیں۔ ساری دنیا میں گھوم گھوم کر انسانیت کا درس دیتے ہیں۔ وہ بھلا بم کی فیکٹری کیسے لگا سکتے ہیں؟ جسموں پر بم باندھ کر انسانوں کی لاشیں کیسے بکھیر سکتے ہیں؟ یہ جعل سازی نہیں تو اور کیا ہے؟ لیکن یہ سب ہم کس سے پوچھیں؟''

''آر ایس ایس اور وہائٹ ہاؤس...... یہ کس کا نام ہے ماں؟'' وہ بولتے بولتے رکتا ہے۔ کچھ سوچتا ہے، پھر کہتا ہے، ''ماں رکو۔ پانڈے سر کا بیٹا ایک کاغذ بھی اپنے ساتھ لایا تھا جو اس رات میٹنگ میں بانٹا گیا تھا جس میں شاید ایسا ہی کچھ لکھا ہوا ہے جس کے بارے میں وہ کچھ کچھ بتا رہا تھا۔ لیکن اسے بھی نہیں معلوم کہ وہ کون لوگ ہیں۔ بس اسے اتنا معلوم تھا کہ اس کے لوگ بھی وہاں آئے ہوئے تھے جو ملیچھوں کے خون سے ہولی کھیلنا چاہتے تھے۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے اسکول بیگ سے زعفرانی رنگ کا کاغذ نکالا اور ماں کی طرف بڑھا دیا۔ ماں نے مڑے ہوئے کاغذ کو سیدھا کیا تو دیکھا کہ ایک کونے میں پچاس ستارے بنے ہوئے ہیں۔ یہ آر ایس ایس اور وہائٹ ہاؤس کا مشترکہ پمفلٹ تھا جس میں لکھا تھا:

''مسلمان ایک عجوبہ قوم ہے جو بہت تیز رفتاری کے ساتھ ساری دنیا میں پھیل گئی ہے۔ ہم دنیا کی پرانی قومیں ہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ آنے والے دنوں میں اس کی اکثریت ہم سے کئی گنا زیادہ ہو جائے گی۔ اور ہم اس کے ماتحت ہو جائیں گے۔ اسے روکنے کے لیے ہمیں ہر محاذ پر شکست دینا ہے۔ کہیں اسرائیل بن کر، کہیں گجرات بن کر، کہیں لادن کو ڈھونڈنے کا بہانہ بنا کر، کہیں کویت کی حمایت کر کے، کہیں صدام کو ڈکٹیٹر بنا کر، کہیں سعودی عرب کا پاسبان بن کر، کہیں کچھ اور کچھ بن کر...... اس قوم کو بدنام کر کے ہی ہم اسے صفحۂ ہستی سے مٹا سکتے

ہیں۔ اگر ایسا کرنے میں ہم ناکام رہے تو وہ دن دور نہیں جب اسلامی ناگ ہمیں ڈس لے گا اور ہمارا صدیوں کا وجود ایک پل میں ختم ہو جائے گا۔ اس لیے آج وعدہ کرو کہ اس زہریلے ناگ کا پھن کچلنے ہم سب ایک دوسرے کی مدد کریں گے اور وقت کے پٹارے میں بند کر کے اسے جب جہاں چاہیں گے، اپنی بین پر نچائیں گے۔''

پمفلٹ پڑھنے کے بعد ماں کے چہرے کا رنگ پوری طرح سے اڑ گیا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ بیٹے نے کچھ دیر تک ماں کے چہرے پر آتے جاتے رنگ کو دیکھا اور پھر بولا۔ ''کیا لکھا ہے ماں؟''

''کچھ بھی نہیں۔ بس اتنا جان لو کہ دنیا کے ہر موڑ پر نہ جانے کتنے آر ایس ایس اور کتنے وھائٹ ہاؤس ہاتھ میں کٹار لیے کھڑے ہیں۔ لیکن ہم بھی بے حیا پودے کی طرح ہیں۔ جتنا وہ کاٹیں گے اتنی تیزی سے ہماری شاخیں پھیلیں گی۔ ہمیں ختم کرنا اس کے بس میں نہیں ہے۔''

کچھ دیر دونوں کے درمیان خاموشی چھائی رہی۔ ماں سے زیادہ بیٹے کے دل کی دھڑکنیں تیز تھیں۔ خوف سے اس کا جسم کانپ رہا تھا۔

''کیا وہ لوگ ہمیں بھی کاٹ دیں گے؟''

''نہیں میرے لال۔ ایسی باتیں نہیں کرتے۔ ہم لوگ آج راتوں رات یہاں سے بھاگ چلیں گے۔ وہ جو دور ایک گاؤں دکھائی دیتا ہے نا، وہاں کافی مسلمان ہیں۔ ان کے ساتھ مل کر ہم لڑیں گے۔ اپنی جان دے دیں گے۔ لیکن پٹارے میں بند ہو کر اس کے اشارے پر گلی گلی ناچ نہیں دکھائیں گے۔''

ماں کی باتیں سن کر بیٹے کو کچھ یاد آ گیا۔ وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ چارپائی کے نیچے سے ہوائی چپل نکال کر پہنتے ہوئے بولا۔

''تو اچھا ماں، اب تم رکو، میں تھوڑا پانڈے سر کے گھر جاتا ہوں۔ ان کے بیٹے کے پاس میری پٹاخے والی بندوق دیوالی سے پڑی ہوئی ہے۔ میں ابھی لے کر آتا ہوں۔''

ماں اسے روکنے کی کوشش کرتی ہیں۔ لیکن وہ تیزی سے بھاگتا ہوا نظروں کے سامنے سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ پھر کچھ دیر کے بعد وہ اپنی بندوق کمر میں کھونسے، سینہ تانے گھر کے اندر داخل ہوتا ہے۔ ماں اس کے انتظار میں بے چین تھیں، سینے سے لگا لیتی ہیں اور چوم چوم کر اس کے گال سرخ کر دیتی ہیں۔

اس روز ماں شام سے ہی اس گاؤں کو چھوڑ کر دوسرے گاؤں جانے کی تیاری میں جٹی ہوئی تھیں۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو، اس کے لیے انھوں نے شام سے ہی دروازہ بند کر رکھا تھا۔ بیٹے کو کہیں باہر نکلنے نہیں دیا تھا۔ جلدی کھانا کھلا کر سلا دیا تھا۔ وضو کر کے پہلے عشاء کی نماز پڑھی۔ دیر تک دعائیں مانگیں۔ پھر کلام پاک کی تلاوت میں جٹ گئیں۔ دل کو جب کچھ سکون ملا تب وہ بستر پر دراز ہوئیں۔

آدھی رات ہوتے ہی جب انھیں لگا کہ گاؤں والے سو گئے ہیں تب وہ اپنے بیٹے کو جگا کر چند

ضروری سامان اور زیورات کی پوٹلی لے کر پیچھے کے دروازے سے چوروں کی طرح نکل کر کھیتوں کی پگڈنڈی سے ہو کر خود کو دوسرے گاؤں کی طرف چھپتے چھپاتے لے جانے لگیں۔

آسمان میں بادل تھے۔ بادل نے چودھویں کے چاند کو نگل لیا تھا۔ کھیتوں میں لگی فصلیں ہواؤں کے زور کے آگے جھکی جا رہی تھیں۔ دونوں اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر جانی پہچانی پگڈنڈیوں پر بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ ابھی آدھا سفر بھی طے نہیں ہوا تھا کہ بادل بے وفا کی طرح بیچ سے سرک گیا اور چاند نمودار ہو گیا۔ یکایک پیچھے سے چور چور کی آواز ابھری اور قریب ہوتی چلی گئی۔ دونوں نے بھاگنے کی کوشش کی۔ پھر چھپنے کی۔ لیکن پیچھے سے آتی ہوئی بھیڑ بالآخر چاندنی رات کا فائدہ اٹھا کر دونوں کو گنّے کے کھیت سے ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئی۔

"ارے یہ کوئی چور نہیں، ملیچھن با......" ایک زور سے چلایا۔

"مار دے ماں بیٹے دونوں کو۔ لگتا ہے گاؤں چھوڑ کر بھاگ رہی ہے سالی۔" دوسرے نے کہا۔

تیسرے نے ڈنڈا مارنا شروع کیا۔ ابھی دونوں کو دو دو ڈنڈے ہی لگے تھے کہ زمین پر گر گئے۔ بیٹا بے ہوش ہو گیا۔

"نہیں نہیں رکو۔" پانڈے نے لاٹھی چلانے والے کا ہاتھ تھام لیا۔ مارنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ پوچھ کر دیکھنے میں کیا برائی ہے۔ اگر انکار کرتی ہے تو سالی کو یہیں کھیت میں کھود کر گاڑ دیں گے۔"

بھیڑ چاروں طرف سے ماں بیٹے کو گھیرے ہوئے تھی۔ ماں بے ہوش بیٹے کے سامنے ہونق کی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔ پانڈے اس کے سامنے لاٹھی لیے کھڑا تھا۔

"دیکھو گڈو کی ماں۔ وقت بہت کم ہے اور ہم تمھارا بھلا چاہتے ہیں۔ تمھارا پتی بھی اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے مارا گیا تھا۔ ہندوستان، ہندوؤں کا استھان ہے۔ یہاں ملیچھوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اگر تمھیں زندہ رہنا ہے تو ہندو دھرم کو اپنانا ہوگا۔ اور اگر تم نے انکار کیا تو میرے لوگ تمھیں ننگا کر کے تیرے بیٹے کے سامنے وہ سب کچھ کریں گے جس کے بارے میں تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔"

سینکڑوں لوگوں کے درمیان گھری ماں اپنے بیٹے کو سینے سے چمٹائے تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ بیٹا کچھ کچھ ہوش میں آ گیا تھا۔ ماں کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ لیکن ایک بات بار بار ان کے ذہن میں گونج رہی تھی کہ کسی بھی طرح بیٹے کو کافروں سے بچایا جائے۔ بعد میں دیکھا جائے گا جو ہوگا۔

بہت دیر تک وہ کچھ نہیں بولیں تو پانڈے نے بیٹے کے اوپر ایک ڈنڈا رکھ دیا۔ وہ دوبارہ بے ہوش ہو گیا۔ ماں چلا اٹھیں۔

"اسے مت مارو۔ تم جیسا کہو گے میں کرنے کے لیے تیار ہوں۔" ماں پانڈے کے پیروں پر گر کر گڑگڑانے لگیں۔

"اگر تم شدھی کرن کے لیے راضی ہو تو پھر تم ہماری حفاظت میں ہو۔ آؤ۔ جب تک تم شدھی کرن کیمپ

میں رہوگی۔ شدھی کرن کے بعد تمھارا ویواہ کسی ایسے آدمی سے کر دیا جائے گا جس کی بیوی سورگ سدھار گئی ہو۔ وہ تمھارے بیٹے کو بھی اپنا لے گا۔"

"کوئی یہاں ہے ایسا جو شدھی کرن کے اپرانت اسے اپنائے گا؟" ایک نے آواز لگائی۔

بھیڑ میں سے ایک ادھیڑ عمر گنجا بڑی سی توند لیے آگے بڑھا اور پانڈے کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"شری مان! ہمری نجر تو کب سے گڈو کی مائی پر گڑی ہوئی تھی۔ بھلا ہو شدھی کرن کا شری مان۔ شدھی کرن کے دن اگر آپ کہیں تو شادی کا جوڑا اور پنڈت جی کو بھی اپنے ساتھ لیتے آئیں۔"

"نہیں لاؤ گے تو کوئی دوسرا ہاتھ مار لے گا۔" ایک نے اس کے گنجے سر پر زور سے چپت لگائی۔

دوسرے نے اس کی توند کو سہلاتے ہوئے عورت سے کہا، "ٹھیک سے دیکھ لو۔ بعد میں مت کہنا کہ توند نہیں ہے۔ کھاتے پیتے گھر کا ہے۔ تمھیں بھی خوب کھلائے گا۔"

ٹھٹھا مار کر سب کے سب ہنس پڑے۔

پانڈے کے کہنے پر ایک نے بے ہوش بچے کو گود میں اُٹھا لیا۔ کئی لوگ عورت اور بچے کو کیمپ تک پہنچانے گئے۔ وہ گنجا توند والا بھی وہاں تک گیا اور دربان کو کچھ سمجھا بجھا کر سب کے ساتھ لوٹ گیا۔ کیمپ میں پہلے سے بچے، جوان، بوڑھے، مرد و عورت موجود تھے۔ سب پر گہری نگرانی رکھی جا رہی تھی۔ کیمپ کو چاروں طرف سے کٹیلی جھاڑیوں اور کٹیلے تاروں سے گھیرا گیا تھا۔

تیسرے دن ہولی تھی......

اس دن سارے گاؤں میں ملیچھوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔ بھگوان کو خوش کرنے کے لیے اس کے پاس اس سے اچھا کوئی دوسرا موقع نہیں تھا۔ بچ وہ گئے جو موت کے خوف سے شدھی کرن کے لیے راضی ہو گئے تھے۔ سبھوں کو شدھی کرن کیمپ لایا گیا۔ یہاں بھی مشترکہ جھنڈے لگے ہوئے تھے۔

شدھی کرن سے پہلی رات......

یہ ملیچھوں کے لیے آخری رات تھی۔ کل اس کا شدھی کرن کیا جانا تھا۔ سب کے سب اپنی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بھاگنے کے جب سارے راستے بند ہو گئے تو قتل گاہ میں سب نے اپنا اپنا سر جھکا دیا کہ زندگی رہی تو پھر کافروں سے نپٹا جائے گا۔

دوسری طرف اسی رات دھرم پری ورتن سنگٹھن کے ادھیکچھ کو خوشی سے نیند نہیں آ رہی تھی کہ صبح ہوتے ہی صدیوں کا سپنا ساکار ہونے والا تھا۔ وہ کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ مذہب کی فلسفیانہ گفتگو میں اپنے ہمزاد سے الجھ گئے کہ وہ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ اس کے پُروج کس مذہب کے تھے؟ دنیا کا پہلا

مذہب کون سا ہے؟ رات بھر وہ اسی طرح کے سوالوں میں الجھے رہے۔ لیکن جب کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پائے تو ان کی حالت پاگلوں جیسی ہو کر رہ گئی۔

آخر کار رات کا اندھیرا چھٹا اور شدھی کرن کا سورج طلوع ہو گیا۔

منچ پر آر ایس ایس اور وہائٹ ہاؤس کے لوگ جلوہ افروز تھے۔ دونوں کے درمیان پانڈے اپنی مونچھوں پر تاؤ دے رہا تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں ملیچھ دوزانو بیٹھے تھے۔ سب کے ہاتھوں میں عشتر کہ جھنڈا تھا۔ گنجے سر والا نقلی بال اُگائے، شادی کا جوڑا پہنے پنڈت جی کے ساتھ مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہا تھا۔

اسی درمیان پانڈے مائیک کے سامنے آیا۔

''بہنوں اور بھائیو! اب وہ گھڑی آ چکی ہے جس کا ہمیں صدیوں سے انتظار تھا۔ ملیچھ یا تو مارے گئے یا کچھ ہی دیر میں اس کی اشُدھ آتما، شدھی کرن کی آگ میں جل کر ختم ہو جانے والی ہے۔..... اور اب میں دھرم پری ورتن سنگٹھن کے ادھیکچھ مہودیہ سے آگرہ کرتا ہوں کہ وہ ڈائس پر آئیں اور ایک ملیچھ کو اپنے شبھ ہاتھوں سے شدھی کرن کر کے اس شبھ اوسر کو یادگار بنائیں۔''

ادھیکچھ مہودیہ ہاتھ جوڑے مائیک کے سامنے آئے۔

''بہنوں اور بھائیو! رات بھر دھرم پری ورتن کے سمبندھ میں گہن ادھین کے اُپرانت میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ دھرتی پر جب بھی پہلی بار ایک پروش اور استری کا آگمن ہوا ہوگا تو اس وقت اس کا کوئی دھرم نہیں رہا ہوگا۔ انسان کا انسان سے ملن پر اگر کوئی مذہب بنا ہوگا تو وہ 'انسانیت' کا ہوگا اور یہی دنیا کا سب سے پرانا مذہب رہا ہوگا۔ ویسے ہندو دھرم بھی بہت پرانا ہے.....

''دوستو! اب وہ شبھ گھڑی آ گئی ہے۔ میں شدھی کرن کے لیے ایک ایسی عورت کو آواز دے رہا ہوں جس کے پتی کو دھرم کے نام پر دس سال پہلے میں نے اس خنجر سے موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔'' کمر سے دھار دار ترشول نما خنجر نکال کر ہوا میں لہراتے ہوئے اس نے آگے کہا، ''آج اس کی پتنی کی باری ہے۔ وہ جلد سے جلد منچ پر آئے۔''

عورت کو منچ پر جاتے دیکھ کر مجمع پر سکوت طاری ہو گیا۔ پانڈے مسکرا رہا تھا۔ پھر یکا یک ایک زوردار ہوا کا جھونکا آیا اور منچ پر لگا ہوا عشتر کہ جھنڈا زمین پر آ گرا۔ پانڈے اور پانڈے جیسے لوگوں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ مجمع مبارک باد دینے کے لیے منچ پر ٹوٹ پڑا۔ فوٹو گرافروں نے کیمرہ سنبھال لیا۔

سنگٹھن کے ادھیکچھ نے اس عورت کے ہاتھ خود اپنا شدھی کرن کروا لیا تھا۔

☆☆☆

شبِ تشنہ لبی

مشتاق اعظمی

ایک بار پیچھے مڑ کر دیکھ لوں فرح.....!

بے خبر سوئی تمھاری پیٹھ سے اجازت لے کر فریم میں جڑی ہوئی اپنی اس تصویر کو دیکھ لینا چاہتا ہوں جو بار بار نظر اٹھانے پر اکساتی ہے اور اس سجے سجائے بیڈ روم سے اٹھا کر ہاسٹل کے اس بے ترتیب کمرے میں اچھال دینا چاہتی ہے جہاں کی دیواریں میرے لیے غیر مانوس ہیں۔ ضد کی آخری حد تک پہنچا ہوا تمھارا اوٹ پٹانگ رویہ بربادی کی آخری منزل پر دستکیں دے رہا ہے۔

''میں کلب جاؤں گی اور ضرور جاؤں گی۔''

''آپ کی طرح اُول جلول اور جھولا بن کر مجھے نہیں جینا ہے۔''

''آفس سے لوٹتے وقت کیا سبزی، گوشت اور دوسرے گھریلو سامان لے کر آپ نہیں آ سکتے؟ نوکروں پر مجھے بھروسہ نہیں ہے۔''

''رات کے گیارہ ساڑھے گیارہ بجے تک ٹی وی ضرور دیکھوں گی۔ آپ ڈسٹرب ہوتے ہیں تو دوسرے کمرے میں جا کر سویئے۔''

''ضروری نہیں کہ آپ کی ہر خواہش پوری کروں۔ میرے اپنے جذبات ہیں۔ میری اپنی خواہشیں ہیں، خواہشوں کے اتصال کا الگ الگ وقت نہیں ہونا چاہیے۔''

روز کی کچ کچ سے میرے اندر کا پورا مرد جاگ اٹھا ہے اور میں تمھیں بے خبر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ ویسے بھی تم میری پسند نہیں تھیں۔ اماں کی مرضی کو دخل تھا۔ شاید انھوں نے فیصلہ کرنے میں عجلت سے کام لیا۔ تمھارے بڑے گھرانے اور تمھاری مخمور آنکھوں نے سب کو مسحور کر دیا تھا اور ماں بہنوں کی پسند بن کر تم آ گئی تھیں۔ لیکن انھیں بھی ساتھ رہنا راس نہیں آیا۔ گاؤں لوٹ جانا پڑا۔

میرے لیے تم شروع سے سرد تھیں۔ ایک دم ٹھنڈی۔ برف نہیں کہوں گا کہ اس میں بھی گرمی ہوتی ہے۔ تم جو گھٹ پار رہنا چاہتی تھیں۔ بھلا میں یہ کیسے گوارا کر سکتا تھا۔

افروز کو گئے ہوئے آج ایک مہینہ پورا ہو چکا ہے۔ بینک اکاؤنٹ میں بہت روپے ہیں۔ پھر پاپا کی

روز کی آمدنی بھی تو میری ہی ہے۔ میں آزاد پنچھی ہوں اور رہوں گی۔ اپنی آزادی کسی کو چھیننے کا حق کیوں کر دوں؟ سماج کی تھوڑی بہت بندشیں ہیں۔ لیکن ہم جس ماحول میں جیتے ہیں یہاں اپنا آپ ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ بچوں کی ضرورت کے لیے اور ایک تصدیق نامے کے لیے ہماری شادیاں ہوتی ہیں۔ بس!

پچھلی سیڑھی کا دروازہ بند کر کے میں پردہ ٹھیک کرتی ہوں۔ پھر بستر پر آجاتی ہوں۔ نیند آنکھوں میں نہیں ہے۔ رامش کا سراپا کیوں بار بار نگاہوں میں جم جاتا ہے۔ وہ کلب کا نیا ممبر ہے۔ اونچے قد کا۔ بے حد اسمارٹ۔ کسی گزٹیڈ پوسٹ پر ہے۔ کئی دنوں سے میرے ارد گرد منڈلا رہا ہے۔ پہلے تو میں نے اسے نظر انداز کیا۔ لیکن رامش کی بڑھتی ہوئی دلچسپی نے رفتہ رفتہ مجھے اس کی طرف راغب کر ہی دیا۔

آج کلب سے نکل کر میں کار میں بیٹھنے جا رہی تھی کہ پیچھے سے آ کر کسی نے میری آنکھیں موند لیں۔ میں چیخنے ہی والی تھی کہ اس نے ایک ہاتھ میرے منھ پر رکھا اور دوسرے بازو سے میری کمر کے گرد حلقہ بنا لیا۔ اوہ! تو یہ ہے۔ رامش کی دیدہ دلیری پر مجھے حیرانی ہوئی۔ گھبراہٹ بھی ہوئی تھی کہ کلب کے احاطے سے کوئی دیکھ نہ لے۔ میں نے مصنوعی غصے سے اسے ڈانٹ دیا تھا اور وہ ہنستا ہوا اپنی کار کی طرف بڑھ گیا تھا۔

بستر پر لیٹتی ہوں لیکن آنکھوں میں رامش سمایا ہوا ہے۔ پرسوں مسز ڈوکانیا نے مجھ پر طنز کیا تھا کہ پیسہ کمانے کے لیے کلب میں پرانے کپڑے لانا میرے لیے کیسے ممکن ہے۔ میرے بچے تو ہیں نہیں اور اصل میں مسز چودھری نے سب ہی ممبروں کو جاڑے میں غریبوں کے لیے کچھ نہ کچھ اکٹھا کرنے کو کہا تھا۔ مجھ سے بچوں کے نیکر اور قمیض کی فرمائش کی گئی تھی۔ میں سخت کش مکش میں تھی۔ لیکن میرا مسئلہ رامش نے کل نہایت خاموشی سے حل کر دیا۔ ایک گٹھر کپڑا نہ جانے وہ کہاں سے لایا تھا اور میرے نام سے جمع کرا گیا تھا۔ کتنا بولڈ ہے وہ!

ہوا کا ایک جھونکا آیا اور میری زلفوں کو الجھاتا ہوا کھڑکی کے راستے سے نکل گیا۔

میں نے نیلی روشنی کا بلب جلا کر مرکری آف کر دی ہے۔ آنکھوں کے راستے سے رامش اب میرے دل و دماغ پر حاوی ہو گیا ہے۔ وہ میرے لیے ہی آتا ہے۔ سارا وقت مجھ سے ہی باتیں کرتا ہے اور موقع ملنے پر مجھے چھونے سے باز نہیں آتا۔ اکثر سرگوشی بھی کرتا ہے:

"آپ کے انگوری لبوں کی تھرتھراہٹ بڑی جان لیوا ہے۔"

"آپ کی آنکھوں میں خوف زدہ ہرنی کی چمک ہے۔"

"آپ کے بدن کے کساو پر کسی تنی ہوئی کمان کا گمان ہوتا ہے۔"

"آپ کی ہنسی میں پہاڑی جھرنے کی گنگناہٹ شامل ہے۔"

میں سر کو جھٹک کر آنکھیں موند لیتی ہوں۔ لیکن رامش چھلانگ مار کر پلکوں پر بیٹھ جاتا ہے۔ میں پلکیں زور سے بھینچ لیتی ہوں۔

مگر...... کوئی فائدہ نہیں۔ کیا میں پلکیں کھولوں؟ اگر بھاگ گیا تو!

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی ہے۔ زور سے انگڑائی لے کر بدن توڑتی ہوں پھر ساڑی کھول کر مسہری پر ڈال دیتی ہوں۔ فریج سے نکال کر ایک گلاس پانی پیتی ہوں۔ پھر مسہری پر لیٹ جاتی ہوں۔ میری پیاس تو کم نہیں ہوئی۔ حلق کو تراوٹ چاہیے۔ افروز ہوتے تو...... تو ان پر مجھے پورا حق تھا...... میں نے ان سے بیاہ کیا ہے

ایک مہینہ گزر گیا...... وہ کہاں ہیں؟ میں نے خیر خبر کیوں نہیں لی؟

رامش......! وہ تو چھلاوہ ہے۔

افروز...... افروز...... افروز......!

میں بڑی بے چینی محسوس کر رہی ہوں۔ لگتا ہے میرے چاروں طرف ندی ہے اور میں ریت کے ٹیلے سے گھری ہوئی ہوں۔

☆☆☆

چق ماق

احسان بن مجید

مجمع بہت بڑا تھا۔ حد نظر تک کالے چٹے سر نظر آرہے تھے۔ ہر چہرے سے ایک تجسس عیاں ہورہا تھا۔ ہر شخص دوسرے سے پوچھ رہا تھا ہم یہاں کیوں آئے ہیں۔ ہر ایک شانے اُچکا کر لاعلمی کا اظہار کردیتا۔ یوں ایک ہی سوال پورے مجمع میں گردش کرتے ہوئے ہوا میں تحلیل ہوجاتا۔ ایک لمحے میں کئی شانے اُچکے اور اپنے مقام پر آ کر ٹھہر گئے۔ صبح سے دوپہر ہوئی، پھر شام اور اب سرمئی اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ مجمع میں کھلبلی مچنے لگی۔

''میں تو بیوی بچوں سے جلدی لوٹ آنے کا کہہ آیا تھا!'' ایک نے ساتھ کھڑے آدمی کے کان میں سرگوشی کی۔

''میرا بیٹا ابھی ٹیوشن پڑھ کر واپس نہیں آیا تھا!'' دوسرے نے اس سے کہا۔

''میں بیمار ماں کی دوائی لینے گھر سے نکلا تھا کہ یہاں آگیا!'' اس نے ذرا اونچی آواز میں کہا تو باقی سب چونکتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

''جنٹلمین، سب آچکے ہیں؟'' ایک کرخت اور بھدی آواز فضا میں گونجی۔

''یس سر!'' مجمع کا مجمع ہمہ تن زبان ہوگیا تھا۔

''سب لوگ پٹیاں اپنے ساتھ لائے ہیں؟'' سوال کیا گیا۔

''جی ہاں۔'' ایک غوغا برپا ہوا۔

''پٹیاں کس لیے؟'' کسی نے بہ آواز بلند پوچھا۔

''بلڈی فول، تمھیں کسی نے نہیں بتایا؟'' آواز میں رعونت اور برہمی نمایاں تھی۔

''کاٹن بھی سب کے پاس ہے؟ میرا مطلب روئی سے ہے۔'' پھر پوچھا گیا۔

''جی ہے۔'' ان گنت دہانے کھلے۔

''روئی کو کیا کریں گے؟'' مجمع کے آخر میں کھڑے کسی شخص نے ہوا میں ہاتھ لہرایا۔

''یہ اسٹوپڈ (Stupid) کون ہے؟'' آواز میں گرج تھی۔

کئی ہزار چہرے اس کی طرف مڑے اور ان چہروں پر کھدی آنکھوں سے نکلتی چنگاریاں اس نے اپنے جسم پر محسوس کیں۔ پٹیوں اور روئی کا سوچ کر اس کے ذہن میں جانے کتنے زخمی چہرے ابھرے، کتنے خوب

صورت جوان ایک بازو یا ٹانگ سے معذور نظر آئے، کتنے ہی زمین پر لیٹے زخموں سے تڑپ رہے تھے۔ وہ اس تصور ہی سے کانپ کر رہ گیا تھا۔

اسے یہاں سے بھاگ جانا چاہیے! اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا ہی تھا کہ اس کے گرد کئی ہزار بازوؤں کا حصار بن گیا۔ بے شمار ہاتھوں نے اس کی ٹانگیں جکڑ لیں۔

''مجھے جانے دو۔'' اس نے سب کی منت سماجت کی۔

''پاگل مت بنو، پچھتاؤ گے۔'' لاکھوں ہونٹ ہلے تھے۔

''کرنا کیا ہوگا؟'' اس نے سب کے سامنے دونوں ہاتھ یوں پھیلائے جیسے کچھ مانگ رہا ہو۔

''تمھیں سوال کرنے کی بہت بُری عادت ہے۔ پھر بھی ابھی سب کچھ بتا دیا جائے گا۔'' کئی انگلیاں سیدھی ہو کر اپنے اپنے ہونٹوں کو چھو گئی تھیں۔

''کب بتایا جائے گا؟ اوپر سے رات ہو رہی ہے۔'' وہ پھر منمنایا۔

''او یار تم کس مٹی کے بنے ہو؟ کیوں ہماری بیڑیوں میں پتھر میں ڈالنے پر تلے ہوئے ہو!'' اس کے کانوں میں شہد کی مکھیاں بھنبھنانے لگیں۔

''میرے پیارے لوگو!'' جانے یہ آواز کیسی تھی کہ سب انسان جیسے پتھر کے مجسمے بن گئے، گہرا سکوت طاری ہو گیا۔

''اب میں آپ کو نئی تہذیب سے روشناس کرانے چلا ہوں۔ اگرچہ یہ آپ کا ملک ہے، اس میں آپ کی اپنی تہذیب ہے، اپنی قدریں ہیں لیکن یہ سب صدیوں پرانی ہیں، دنیا میں نئی قدروں کا بول بالا ہو رہا ہے، فرسودہ تہذیب کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟'' اس سوال پر بھی بات ختم نہیں ہوئی تھی۔

''بالکل ٹھیک۔'' ایک قیامت خیز شور برپا ہوا۔

''تمھیں صدیوں کا سفر درپیش ہے، کیا اس کے لیے تیار ہو؟'' آواز نے مجمع سے تصدیق چاہی۔

''تیار ہیں۔'' لاکھوں بازو یوں بلند ہوئے جیسے زمین سے بے شمار کھمبیاں اُگ آئی ہوں۔

''شاباش!'' آواز کی چاشنی میں گھلا زہر اسے اپنے حلق میں اُترتا محسوس ہوا۔

''اب اپنے ہاتھوں میں پکڑی پٹیاں آنکھوں پہ باندھ لو۔'' پہلا حکم ملا۔

سب نے فوراً اپنی آنکھیں پٹیوں سے ڈھانپ لیں۔

آنکھیں چھن گئیں! اس نے سوچا۔

''گ ...... ریٹ (گریٹ)!'' یہ آواز جانے کہاں سے آئی تھی۔ اس نے چند بار پنجوں کے بل ہو کر اسے دیکھنے کی کوشش کی تھی لیکن آگے کھڑے طویل القامت شخص کی وجہ سے نہیں دیکھ سکا تھا۔

''روئی؟؟'' مجمع سے کوئی سیانا بولا۔

''آپ سب لوگ اچھے ہیں، روئی اپنے پاس رکھیں۔ دورانِ سفر کام آئے گی۔ اب ہم سفر آغاز کرنے جا رہے ہیں۔ سفر چونکہ طویل ہے اس لیے تھوڑے وقت میں منزل تک پہنچنے کے لیے آپ کو میرے پیچھے چلنا نہیں، دوڑنا ہوگا!'' آواز میں خوشامد در آئی تھی۔

''ریڈی، گو... گو... !'' آواز اتنی بلند تھی کہ اس کی بازگشت چند لمحوں تک اس کے کانوں میں گونجتی رہی۔

اور پھر قیامتِ صغریٰ برپا ہوگئی۔ زندہ انسانوں کے ساتھ جیسے قبروں سے مُردے بھی اُٹھ کر بھاگنے لگے۔ وہ اپنی جگہ بُت بنا کھڑا رہا۔ لوگ اس سے ٹکراتے ہوئے گزرتے رہے۔ اتنا غبار اٹھ رہا تھا جیسے یہاں نیپام بم پھٹا ہو۔ ایک اژدہام مغرب کی سمت روانہ ہوگیا تھا۔ آخری آدمی اس سے ٹکرانے والا تھا کہ وہ رستے سے ہٹ گیا۔ اس نے اپنی آنکھوں پر پٹی نہیں باندھی تھی، وہ دیکھ رہا تھا۔ آخری آدمی بھی اس کی نظروں سے اوجھل ہوگیا تھا۔ میدان میں وہ تنہا رہ گیا تو اس نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا اور سب کو خدا حافظ کہتے ہوئے واپس گھر لوٹ آیا۔

گھر کیا تھا، ایک کمرے کا مکان تھا جس میں چار ٹین کے بکسے رکھے تھے اور تین چارپائیاں بان کی تھیں۔ اس مکان میں اس کے تینوں بچے پیدا ہوئے تھے۔ معاشرے میں اس کا مقام ایک مزدور سے زیادہ نہیں تھا۔ دن بھر اینٹ گارا اٹھانے کے بعد اسے جو معاوضہ ملتا اس سے گھر کا سودا لینے کے بعد بچوں کے لیے بھی کچھ نہ کچھ لے آتا کہ اسے دیکھتے ہی ان کی چونچیں بھی کھل جاتی تھیں۔ بیوی بچوں کے چہرے پر بھی آسودگی آ جاتی تھی۔ تھکن سے چور جسم وہ بان کی چارپائی پر پھینکتا تو بان جیسے اس کے جسم میں کھبتے ہوئے اپنے نشان چھوڑ جاتا۔ بچے اس کے جسم پر اچھلتے، کودتے تو اسے ایک راحت کا احساس ہوتا۔

بیوی اسے دیکھتے ہی کھانا لے آئی۔ بچے بھی اس کے پاس آ بیٹھے۔ اس نے کھانے کے دوران کوئی بات نہیں کی، بس نوالہ توڑتا، سالن کی تھالی میں ڈبوتا اور دو چار دانت مارتے ہوئے حلق سے نیچے کہیں پھینک دیتا۔ بچے کھانا کھاتے ہوئے شرارتیں کر رہے تھے لیکن بیوی کی نظریں اس کے چہرے پر خاموشی کی وجہ ڈھونڈتی رہیں۔

اس سے زیادہ اچھی زندگی کیا ہوگی، اس سے زیادہ خوب صورت تہذیب کہاں ہوگی اور اس سے زیادہ اچھی قدریں کہاں ملیں گی! وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔

''کیا کہا؟'' بیوی، بچوں کو چھوڑ کر اسے پنکھا جھلنے لگی۔ بچے شرارتیں کرتے سو گئے تھے۔

''کچھ نہیں۔ تم سو جاؤ۔'' اس نے کروٹ بدل لی۔

بے چارے آنکھیں ہوتے نابینا ہو گئے تھے... جانے کہاں پہنچے ہوں گے... راستے میں کئی بھوک پیاس سے تڑپ رہے ہوں گے اور کئی ابھی تک دھکے ٹھڈے کھاتے دوڑ رہے ہوں گے... ان کے پاؤں میں چھالے پڑنے کے بعد پھٹ گئے ہوں گے، لباس بھی تار تار ہو گیا ہوگا، سانس پھولی ہوگی لیکن انھیں کہیں پڑاؤ کا حکم نہیں ملا ہوگا۔ انھیں کہاں جانا تھا اور جانے کیا کیا سوچتے ہوئے اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

"ماں! آج بابا کو سونے دو۔ ان کی یہ عمر بوجھ اٹھانے کی نہیں، ہم جائیں گے کام پر!" بیٹے ماں سے کہہ رہے تھے۔
اسے لگا جیسے بہت دور کچھ مرد آپس میں باتیں کر رہے ہوں۔ وہ فوراً اٹھ بیٹھا۔ سامنے چارپائی پر تین مرد بیٹھے تھے، اس نے ہتھیلیوں سے اپنی دونوں آنکھیں مسل ڈالیں۔ غور سے دیکھا، وہ اس کے بیٹے تھے۔ اسے اپنا سراپا عجیب لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بالشت بھر سفید داڑھی تھی، جسم لاغر ہو چکا تھا۔ اس کی نظر چولھے کے پاس بیٹھی بیوی پر پڑی، اس کے سر میں بھی چاندی اُتر آئی تھی۔

"اسٹاپ (Stop) رُک جائیں!" جانے کتنی مدت بعد یہ آواز مجمع کی سماعت سے ٹکرائی تھی،

"میں بہت تھک گیا تھا۔" کسی کے منھ سے نحیف سے الفاظ نکلے۔

"چپ اوئے!" کسی دوسرے نے اسے جھڑک دیا۔ اس کا لہجہ بھی تھکا ہوا تھا۔

"آپ خوش قسمت ہیں، آپ نے منزل پالی۔ آپ تمام لوگ نئی تہذیب میں پہنچ چکے ہیں، آپ کو میرا ممنون ہونا چاہیے۔ ہونا چاہیے نا؟" آواز نے سوال کیا تھا۔

"جی ہاں، کیوں نہیں۔ ہم سب آپ کے ممنون ہیں۔" لیکن اب وہ شور نہیں اٹھا تھا۔

"اب آپ لوگ نئی تہذیب دیکھنے کے لیے بے قرار ہوں گے، مگر اس سے پہلے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لیں کہ اس کے بعد میری آواز آپ تک نہیں پہنچ پائے گی۔" آواز ہدایت دے کر خاموش ہو گئی تھی۔

سب نے فوراً روئی کانوں میں ٹھونستے ہوئے آنکھوں کی پٹیاں کھول دیں۔ چند لمحوں تک انھیں کچھ دکھائی نہیں دیا۔ بینائی بحال ہوئی تو سب جنگلی غاروں کے سامنے کھڑے تھے۔ انھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ سب کے چہروں پر کالی چٹی داڑھی بڑھتے بڑھتے بہت بڑھ گئی تھی۔ سر کے بال دھول سے اَٹے ہوئے تھے۔ لباس چیتھڑے بن گیا تھا۔ حدِ نظر تک جنگل پھیلا ہوا تھا۔ غاروں میں رہنے والے ان کو دیکھ کر حیران اس لیے ہو رہے تھے کہ یہ بھی کوئی ان جیسی ہی مخلوق ہیں لیکن یہ اتنا لشکر آیا کہاں سے ہے۔ غاروں کے مکینوں نے اپنے جسم درختوں کے پتوں سے ڈھانپ رکھے تھے اور ان کی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ کچھ مادر زاد ننگے گھوم رہے تھے۔ مجمع کے لوگوں نے آپس میں کوئی بات کی تھی لیکن کوئی کسی کی بات نہیں سُن سکا تھا۔

رات گہری ہونے لگی تھی۔ ایک بوڑھا جنگلی کہیں سے مُردہ ہرن کھینچ لایا اور باقی سب اپنا اپنا چقماق لے کر اس کے گرد بیٹھتے ہوئے آگ جلانے کی کوشش کرنے لگے۔ مجمع کے لوگ سارے جنگل میں بکھر گئے اپنا اپنا چقماق ڈھونڈنے۔ ☆☆☆

شخصیت

ذکر ایک شجر سایہ دار کا (حافظ شاہ محمد شفیع فردوسی)

احمد یوسف

چھ سال کی عمر میں میرا داخلہ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں کرایا گیا تھا۔ ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۸ء میں کلکتے میں رہا، پھر دادی اماں کے انتقال کے دو سال بعد میرے دادا ابا نے اماں کو پٹنہ بلا لیا اور اس طرح ہم لوگ سب بھائی، بہن پٹنہ آ گئے۔

لیکن کلکتے کے تین چار سال مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔

میرے ابا تین بھائی تھے۔ سائیکل کا بڑا سا کاروبار تھا اور نیشنل ٹاکیز نام کا ایک سنیما ہال تھا جس کا نظم و نسق چھوٹے ابا کے ہاتھ میں تھا۔ ہم لوگ ڈاکٹر لین میں رہا کرتے تھے۔

ہم لوگوں کا ایک مثالی مشترکہ خاندان جس میں مرد تو اپنے روزگار میں لگے رہتے تھے۔ بچے بچیاں اسکول چلے جایا کرتے تھے اور سبھوں کے جانے کے بعد گھر میں میری اماں، منجھلی اماں اور چھوٹی اماں رہا کرتی تھیں۔

دادا ابا پٹنہ میں اپنی زمینداری کی دیکھ بھال کرتے۔ روز کچہری جانا ان کا معمول تھا۔ کلکٹر کے یہاں نیلام ہوتے۔ دادا ابا نیلام میں جائداد خریدتے اور پھر اسے کچھ دنوں بعد بیچ دیا کرتے۔ پھر چھوٹے بڑے مقدمے میں بھی لگے رہا کرتے تھے۔

کبھی فرصت ملتی تو دادا ابا اور دادی اماں ہمیں دیکھنے کلکتہ چلے آتے۔ گھر میں بڑی چہل پہل ہو جاتی۔ کلکتے میں دادا ابا کے بھتیجے اور پوتے بھی تھے جو ہم ہی لوگوں کی طرح بہت بڑا سا سائیکل کا بزنس کرتے تھے۔ دادا ابا دادی اماں جانے لگتیں تو بچوں کا رونا دھونا دیکھنے کے قابل ہوتا۔

میرے نانا ابا ۱۹۰۲ء میں قضا کر چکے تھے۔ نانی بھی ختم ہو چکی تھیں اس لیے ہم لوگوں کے ننہال سے تو کوئی نہیں آتا تھا لیکن منجھلے ابا کے خسر شاہ صاحب کہلاتے تھے، وہ کبھی کبھار محی الدین نگر سے آ جاتے۔ وہ ہم سب لوگوں کے نانا ابا تھے یعنی یہ کہ صرف منجھلے ابا کے لڑکے انھیں نانا ابا نہیں کہتے بلکہ ہم لوگ اور پھر چھوٹے ابا کے لڑکے بھی انھیں نانا ابا کہتے۔

اس طرح چھوٹے ابا کے خسر حافظ شفیع بھی اکثر بہار شریف سے تشریف لاتے تو وہ بھی ہم سب بھائی بہنوں کے نانا ابا ہو جاتے اور وہ بھی ہم لوگوں کو اتنی محبت دیتے کہ یہ محسوس ہوتا کہ سگے نانا ابا ہیں۔

اپنے نواسے سید علی اظہر، سید علی مظہر اور سید علی اصغر کی طرح وہ ہم لوگوں کو بھی اپنے پاس بٹھاتے اور دینی مسائل بتاتے، بزرگوں کے قصے سناتے اور بہت سے واقعات جو انتہائی سبق آموز ہوتے ہم لوگوں کے سامنے پیش کرتے۔

شاہ شفیع صاحب کے چار بھائی اور تھے جنھیں ہم لوگوں نے اس وقت نہیں دیکھا تھا لیکن وہ ان کا ذکر ہمیشہ کرتے تھے۔ شاہ الیاس صاحب، حکیم شاہ عبدالحمید صاحب، شاہ خضر صاحب اور شاہ سعید صاحب۔

کلکتے میں اپنے قیام کے دوران اپنے دو بڑے بیٹوں، سموں ماموں اور رافو ماموں کے یہاں بھی جاتے رہتے۔ یہ دونوں بھائی ان کے محل اولی سے تھے۔ یہ دونوں بھائی میری چھوٹی اماں (سعیدہ نام تھا اور حافظ شفیع صاحب کے محل ثانی کی سب سے بڑی اولاد تھیں) کو اس قدر مانتے تھے کہ یہ پتا نہیں چلتا تھا کہ ان لوگوں کے درمیان ایک ہلکی پھلکی دیوار بھی حائل ہے۔

سموں ماموں ہم لوگوں کے سینما نیشنل ٹاکیز میں منیجر تھے۔ چھوٹے ابا اکثر ہم لوگوں کو کار بھیج کر سینما بلاتے۔ سمو ماموں سے وہیں تھوڑی دیر کی ملاقات ہو جاتی۔ ان کی دوسری بیگم بنگالن تھیں۔ سینما خضر پور میں تھا اور سمو ماموں مٹیا برج میں رہتے تھے۔ ان کے ایک لڑکے کلیم تھے جو ان کے محل اولی سے تھے۔ میں نے سنا کہ وہ بنگلہ دیش کے مومنٹ میں بہت آگے تھے۔ بنگلہ بہت اچھی بولتے تھے۔

رافو ماموں ایک جوتے کی دکان پر سیلز منیجر تھے۔ ان سے ملنے جب کبھی ہم لوگ ان کی دکان پر گئے تو وہ خوب باتیں کرتے اور ہمیں خوب ہنساتے۔

دادی اماں کا انتقال ۱۹۳۷ء میں ہوا اور چھوٹے ابا نے ۱۹۳۸ء میں نیشنل ٹاکیز کو فروخت کر دیا۔ اس کے بعد سمو ماموں سے سینما کی ملاقات ختم ہو گئی۔ خود ہی وہ ہم لوگوں سے ملنے لین آجایا کرتے۔

اسی طرح نانا ابا بھی سال میں ایک بار کلکتے کا ایک چکر ضرور لگا جاتے۔

میری چھوٹی اماں محل ثانی سے ان کی بڑی بیٹی تھیں۔ ان کی دو بہنیں اور تھیں اور ایک چھوٹے بھائی آمن ماموں تھے (جنھیں بیشتر لوگ آمن جی کہتے تھے)۔

چھوٹی اماں کی وضع داری یہ تھی کہ جب کبھی انھیں نانا ابا، نانی اماں یا کسی بہن کو خط لکھنا ہوتا تو مجھے بلواتیں۔ تینوں بھائی ایک ہی گھر میں ایک ساتھ رہتے تھے، خانہ داری بھی ایک ہی تھی۔

زینے سے پہلی منزل کے لیے جائیں تو اوپر پہنچ کر دائیں ہاتھ پر میری اماں کا کمرہ ملتا اور بائیں ہاتھ پر چھوٹی اماں کا۔ درمیان میں ایک راہداری تھی جس کے بعد منجھلی اماں کا کمرہ آتا تھا۔

میں چھوٹی اماں کے یہاں خط لکھنے پہنچتا تو میرے سامنے یہ منظر ہوتا کہ ایک مونڈھے پر وہ بیٹھی ہیں، ان کے سامنے پیچوان رکھا ہے (گیس کے سبب ان دنوں حقہ پیا کرتی تھیں) اور اس کے بعد ایک خالی مونڈھا اور

ہے۔ یہ موقعہ صرف میرے لیے ہوتا۔

میری عمر اس وقت سات آٹھ سال کی تھی۔ مجھ سے یوں خط لکھواتی تھیں کہ میری تحریر صاف ستھری اور کافی حد تک صحیح ہوتی تھی۔

پھر ایک طویل خط کی ابتدا ہوتی۔ انھیں بہت سے اشعار یاد تھے جنھیں جا بجا اپنے خط میں لکھواتیں۔ خط کی ابتدا ابھی بالعموم کسی نہ کسی شعر ہی سے ہوتی۔ مجھے ابھی ایک شعر یاد آ رہا ہے:

حالِ دل کیوں کر لکھوں لکھنے کو دفتر چاہیے
روشنائی کے لیے سارا سمندر چاہیے

پھر داستان شروع ہو جاتی۔ چھوٹے ابا کی شوگر کی تکلیفیں، اپنی گیس کی تکلیفیں، اظہر کی کھانسی، مظہر کے دانے اور اصغر کے گلے کی تکلیفیں۔ باجی بڑی تھیں اور اس وقت کنواری تھیں اس لیے ان کی صرف خیریت لکھوا دیتیں۔

۱۹۳۷ء میں جب میری دادی اماں کا پٹنہ میں انتقال ہوا تو نانا ابا تعزیت کے لیے بہار شریف سے آئے تو میرے دادا ابا نے ان سے فرمائش کی کہ دادی اماں مرحومہ کے لیے قطعہ تاریخ کہہ دیں۔ کچھ دنوں بعد ان کی تاریخ آ گئی جو درج ذیل ہے:

قطعۂ تاریخ

ارتحال پر ملال اہلیہ سید عبداللطیف

جناب حاجی عبداللطیف کو افسوس
وہ غم ہے مردم خانہ کا روح فرسا غم

شب دوازدہم تھی مہ صیام کی آہ
سدھاریں ملک عدم کو ولایتی بیگم

بڑی عفیفہ، بڑی عابدہ، بڑی سوگھڑ
بڑی خلیق، بڑی خوش مزاج نیک فہم

یہ وہ تھیں بالوئے خانہ فروغ کاشانہ
بہار گھر کی یہ کہتی تھی گھر ہے باغ ارم

جو وہ نہیں تو کہاں کی بہار کیسا باغ
خزاں رسیدہ چمن جیسے گھر کا یہ عالم

شفیع مصرع تاریخ انتقال پہ لکھ
ہیں آج خلد میں بی بی ولایتی بیگم

۱۳۵۶ھ

(شب دوازدہم رمضان المبارک ۱۳۵۶ھ مطابق ۱۵ نومبر ۱۹۳۷ء)

اور یہ تاریخ (خواجہ کلاں کے ایک قبرستان میں) سنگ مرمر کے ایک لوح پر آج بھی تازہ دکھائی دیتی ہے۔

☆☆☆

شخصیت

جناب حُسین امام

بشیر موجد

پاکستان کے معماروں کے ساتھ پاکستان میں کیا سلوک کیا گیا؟

یہ چالیس پینتالیس برس ادھر کی بات ہے، ریونیو بورڈ کے ایک فرعون مزاج ممبر کے ساتھ اسلم بٹ پرائیویٹ سکریٹری کے فرائض انجام دیتے تھے جو میرے، احمد ندیم قاسمی صاحب اور پروفیسر تنویر کے مشترکہ دوست تھے۔ اسلم ایک اچھے شاعر اور دانشور تھے۔ انسان دوستی ان کی فطرت میں شامل تھی۔ دوپہر کے دفتری وقفے میں میرے علاوہ چند ادیب اور شاعر اور بھی تھے جو اس وقفے کی محفل میں شریک ہوا کرتے تھے جن کے نام اس وقت مجھے یاد نہیں آرہے۔ ان میں آج کے معروف میوزک ڈائرکٹر اور گائک میاں شہریار (جو اس وقت صرف شہریار تھے) اسی دفتر میں ملازم تھے، آیا کرتے تھے۔ میری پہلی ملاقات ان سے اسی دفتر میں اور اسی وقفے کی محفل میں ہوئی تھی۔

ایک دن میں معمول کے مطابق دفتری وقفے میں دفتر پہنچا تو سائلوں کی قطار میں مجھے ایک جانا پہچانا چہرہ دکھائی دیا لیکن میرے ذہن نے کہا کہ تمھاری آنکھوں کو دھوکا ہو رہا ہے۔ جس چہرے سے اس چہرے کی مشابہت ہے وہ چہرہ تو تحریک پاکستان کے صف اوّل کے رہنما کا ہے۔ میں یقین و بے یقینی کے دوراہے پر کھڑا اسی کشمکش میں مبتلا کبھی بٹ کے دفتر پہنچ جاتا اور کبھی واپس آکر پھر اس چہرے کو گھورنے لگتا۔ سوچتا کہ کہاں وہ رہنما قائداعظم کا ساتھی اور کہاں یہ سائلوں کی قطار میں کھڑا چہرہ۔ لیکن میرے اندر سے بار بار آواز آتی رہی کہ یہ چہرہ ہو بہو اسی چہرے جیسا ہے جس کو میری آنکھوں نے حضرت قائداعظم کے جلسوں میں تقریریں کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ جب یہ چہرہ اسٹیج پر تقریر کرنے کے لیے آتا تھا تو سامعین اپنی سانسیں روک روک کر اس کی تقریریں سنا کرتے تھے۔ اس شخصیت کا سراپا آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ کالی شیروانی زیب تن، چوڑی دار پاجامہ، سر پر قراقلی ٹوپی اور آنکھوں پر گولڈن فریم والی عینک۔

میں اسی ادھیڑبن میں تھا کہ اسلم بٹ اپنے دفتر کے ساتھ والے کمرے سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئے۔ علیک سلیک کے بعد میں نے اپنی الجھن کا ذکر کیا تو اسلم بٹ نے کہا آؤ اٹھو، ابھی چل کے دیکھ لیتے ہیں۔ ہم دونوں کمرے سے باہر نکلے تو قطار میں کھڑے سائل تھک ہار کر بینچوں پر بیٹھ چکے تھے۔ ان بیٹھے ہوئے لوگوں

میں وہ چہرہ بھی موجود تھا لیکن اب شیروانی کا لے رنگ کی بجائے گہرے گرے کلر کی تھی جو جگہ جگہ سے اپنے ، ملک کی اقتصادی بدحالی کی نشان دہی کر رہی تھی۔ وہ کھلی موہری کا سفید پاجامہ پہنے ہوئے تھے اور عینک کا فریم سنہرے رنگ کی بجائے بلیک رنگ کا تھا۔ آنکھوں میں وہی دانشورانہ اور قائدانہ چمک قائم تھی۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ میں ہمت کر کے ان کے قریب گیا اور سلام عرض کیا کہ وہ سلام کے جواب میں وعلیکم السلام کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ مجھ سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے کہو بیٹا آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ ان کا یہ مہذب انداز گفتگو سن کر مجھے یہ یقین ہو گیا کہ یہ وہی شخصیت ہے جس کا سراپا میرے ذہن میں اب تک محفوظ چلا آ رہا ہے۔ میں مسلم لیگ نیشنل گارڈ کا ورکر رہا ہوں، مجھے تحریک پاکستان کا وہ زمانہ یاد ہے جب مسلم لیگ کے جلسوں میں حضرت قائداعظم کے ساتھ آپ جیسی شخصیت شامل ہوا کرتی تھی۔ میں اپنے ماضی کی یادداشتوں کی بھول بھلیوں سے نکلنا چاہتا تھا۔ یقین و بے یقینی کی کشمکش مجھے پریشان کیے ہوئے تھے۔ میں نے خود کو حاضر کرتے ہوئے مودبانہ انداز میں کہا، ''آپ مجھے اپنا اسم گرامی بتانا پسند فرمائیں گے؟ میرا دل کہہ رہا ہے کہ آپ قائداعظم کے ساتھ حضرت حسین امام ہیں۔''

''آپ نے ٹھیک پہچانا ہے۔ میں ہی اس جلیل القدر، نیک فطرت قائد کے ساتھیوں میں سے ہوں۔ میرا نام حسین امام ہے۔''

بیساختہ میری زبان سے نکلا ''آپ تو اس ملک کے معماروں میں سے ہیں لیکن آپ ان سائلوں کی قطار میں کیوں کھڑے ہیں۔ اس دفتر کی یہ سیڑھیاں بیٹھنے کے لیے آپ کے شایان شان نہیں ہیں۔''

''بیٹا! مجھے وقت نے کھڑا کیا ہے، میں خود تو کھڑا نہیں ہوا۔ وقت اور حالات کے دباؤ نے مجھے ان سیڑھیوں پر بیٹھنے پر مجبور کیا ہے۔''

پھر اچانک میرے ذہن میں اپنے پیارے دوست محسن بھوپالی کا شعر یاد آیا:

نیرنگیٔ سیاست دوراں تو دیکھیے
منزل انھیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

اتنے میں اسلم بٹ آگے بڑھے اور اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہنے لگے کہ آپ کا کام میرے ہی دفتر سے متعلق ہے۔ آئندہ آپ جب بھی تشریف لائیں تو میرے دفتر آ جایا کریں، میں حسب توفیق آپ کی خدمت کروں گا۔

اسلم بٹ نے جناب حسین امام صاحب کا ہاتھ پکڑا اور اپنے دفتر لا کر کرسی پر بٹھاتے ہوئے اپنے اسسٹنٹ منظور سے کہا کہ اچھی سی چائے لے کر آؤ۔

میں نے پھر اپنا سوال دہراتے ہوئے عرض کیا کہ جناب سائلوں میں آپ کیوں بیٹھے ہوئے تھے۔ دوبارہ میرا سوال سنتے ہی ان کے چہرے پر بیتے دنوں کی یادوں نے میلہ سا لگا دیا۔ چہرے کا رنگ کبھی تمتما اٹھتا اور کبھی اداس لمحوں کی گرد میں گم ہو جاتا۔ میری بے یقینی تو یقین میں بدل چکی تھی لیکن اس کی جگہ اب حیرت نے لے لی تھی اور میری حیرت یقین کو پاش پاش کرنے کی کوشش پیہم میں مصروف تھی۔ جس سے میری یادداشت کے پاؤں کبھی اکھڑ جاتے اور کبھی جم جاتے۔ اسلم بٹ نے دوبارہ امام صاحب سے مخاطب ہو کر کہنا شروع کیا کہ آئندہ سائلوں کے ساتھ کھڑے نہ ہوا کریں، آپ جیسی شخصیت کو اس طرح کھڑا ہوا دیکھ کر ہمیں دکھ ہوگا۔

سائلوں کا ذکر بار بار سننے کے بعد ان کے چہرے کو تغیر نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پھر ذرا سے توقف کے بعد فرمانے لگے "میں جن لوگوں میں کھڑا تھا یہ میرے ہی سابقہ وطن کے لوگ ہیں۔ مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے ورکر ہیں۔ یہ کبھی کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ پاکستان بنانے والوں میں ان کا اتنا ہی حصہ ہے جتنا کسی ورکر کا ہو سکتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو گھر بار لٹا کر آئے ہیں۔ اس وطن کے لیے، اس پاک سرزمین کے لیے، اپنے بال بچوں کو، بوڑھوں کو اور جوانوں کو اس آزادی کی بھینٹ چڑھا کر آئے ہیں۔ میں ان کا ساتھ کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ یہ میرے ہیں اگر میں ان لوگوں میں نہ بیٹھتا تو میں اپنے ضمیر کا مجرم ہوتا۔ میں اپنے ورکر کی توہین کا مرتکب ہوتا۔ یہ بات میری تربیت میں نہیں ہے۔"

یہ گفتگو کرتے ہوئے حسین امام صاحب کی آنکھوں میں نمی بار بار آ جاتی اور ان کی شخصیت بار بار نمی کو آگے بڑھنے سے روکنے میں کامیاب ہو جاتی۔ پھر فرمانے لگے کہ "میں محسوس کر رہا ہوں کہ گورے حکمرانوں کے جانے کے بعد کالے حکمرانوں نے ان کی جگہ لے لی ہے۔ منزل ان کے ہاتھ آئی ہے جو اس سفر میں شریک ہی نہ تھے۔ یہ لوگ پاکستان کے مقاصد کو غلط مفہوم دیتے جا رہے ہیں جو اچھی بات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم پر رحم فرمائے۔"

اتنے میں کالے انگریز نے اپنے سکریٹری کو اندر بلوایا۔ کچھ دیر کے بعد اسلم بٹ واپس آئے تو آتے ہوئے کچھ پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے چہرے پر فرعونیت کے تازہ تازہ لگے زخم صاف دکھائی دے رہے تھے۔ اسلم بٹ نے حسین امام صاحب سے مخاطب ہو کر کہا "صاحب اس وقت ضروری میٹنگ کے لیے گورنر کے پاس جا رہے ہیں۔ آپ چند روز بعد تشریف لے آئیے گا۔ میں آپ کی ملاقات کروا دوں گا۔"

حسین امام بڑے ذہین آدمی تھے۔ وہ معاملے میں حائل فرعونیت کو سمجھ گئے۔ وہ خاموشی سے اٹھے۔ ہم دونوں سے ہاتھ ملاتے ہوئے صرف اتنا کہا کہ "ہمارے حکمرانوں نے حکمرانی کے چلن نہ بدلے تو یہ وطن عزیز کسی وقت بھی بڑی مشکل میں آ جائے گا۔"

پھر وہ خمیدہ پیٹھ لیے دفتر کی اونچی کرسی کی سیڑھیوں سے نیچے اتر گئے۔ ☆☆☆

سیّد ابوالحسنات حقی

کوئی بتاؤ زمیں پر کہاں سے آئے ہیں
وہ راستے جو ہمیں یار سے ملاتے ہیں

اگر وہ چاہے تو اک پل میں رت جگے ہو جائیں
میں جانتا ہوں کہ اس ہاتھ میں تماشے ہیں

سنو کہ میرا مقدر ہے جاگتے رہنا
جو خواب ہیں مرے اطراف سب تمھارے ہیں

ہم انکسار و مروت میں لالہ زار ہوئے
مگر یہ داغ تو ہم خود سے بھی چھپاتے ہیں

ہمارے ہاتھ میں دکھنے لگے نقوشِ وفا
مگر انھیں سے تو ہم زندگی بھی پاتے ہیں

تمام رنگ ہنر ہم پہ ہو گیا ظاہر
سو اپنے خون سے ہم تتلیاں بناتے ہیں

سنبھالے رکھتی ہے دنیا کو عشق سامانی
مرے وجود میں بے انتہا خزانے ہیں

حقیقتیں ہیں کہاں تک بتایئے حسنات
یہاں تو چاروں طرف سیکڑوں فسانے ہیں

سیدابوالحسنات حقی

نگاہ میں ہوں نہ دل میں ہوں برہمی یہ ہے
رپورتاژ مرا آج سرسری یہ ہے

تمھاری اصل سے واقف ہے دور تک دنیا
صفائی دیتے ہیں کیوں اصل کج روی یہ ہے

ہم اپنے تیروں سے خود ہی شکار ہوتے ہیں
ہماری صف میں اگر ہے تو ابتری یہ ہے

مسیح وقت ہیں سفاکیوں کے مجرم ہیں
ضمیر و ذہن کی سرحد پہ تھرتھری یہ ہے

نہ قطب ہوں نہ قلندر نہ کوئی دوسرا وصف
کوئی تو آ کے کہے دیکھو آدمی یہ ہے

کلاہ کے لیے جگنو تلاش کرتے ہیں
بکھر گئی ہے سر فرق روشنی یہ ہے

دیار چھوڑ گئیں غیرتیں قناعت کی
وگرنہ ہم بھی دکھاتے کہ خسروی یہ ہے

☆☆

علقمہ شبلی

جس طرف بھی دیکھیے یلغار ہے
سانس لینا بھی یہاں دشوار ہے

بٹ گیا گھر، یہ تو تھا ہی حادثہ
اب دلوں کے بیچ بھی دیوار ہے

ناز جس کو نا طرف داری پہ تھا
آج وہ بھی حاشیہ بردار ہے

لوٹ کیوں آتی نہیں میری انا
آپ کی محفل بھی اک دربار ہے

ٹوٹ سکتا ہو، نہ جھک سکتا ہو جو
آدمی وہ صاحب کردار ہے

سرفروشان وطن کے واسطے
نازش گردن فراز دار ہے

یوں تو دی آواز دنیا نے مگر
خوئے درویشی بہت خود دار ہے

☆☆

رفعت سروش

آئی ہیں شہر تمنا میں براتیں کتنی
طاق حسرت میں سجا رکھی ہیں یادیں کتنی

ایک امید کہ پھر چاند نظر آئے گا
جاگ کر کاٹی ہیں ان آنکھوں نے راتیں کتنی

زندگی تو نے ہی بویا تھا تمنا کا شجر
مجھ سے مت پوچھ کہ اب پھیلی ہیں شاخیں کتنی

مصلحت روز لگاتی ہے زباں پر تالے
آ کے ہونٹوں پہ ٹھہر جاتی ہیں باتیں کتنی

ایک خواہش کہ کبھی خود سے بھی ملنا ہو نصیب
ورنہ کہنے کو بر آئی ہیں مرادیں کتنی

منزل شوق کے موہوم تصور میں سروشؔ
دل آوارہ بدلتا رہا راہیں کتنی

☆☆

سہیل غازی پوری

ابرِ احساسِ نمو جب بھی برسا کھل کے
سوندھی مٹی سے مہکنے لگے قریے گل کے

یہ نہ سمجھو کہ فقط برف پگھلتی ہے یہاں
وقت کی دھوپ سے بہہ جاتے ہیں پتھر گھل کے

ذہن میں اس لیے رکھتا ہوں ترازوئے ہنر
جو بھی بات آئے زباں پر تو وہ آئے تل کے

رات دن اب جو ترستی ہیں تمھاری آنکھیں
صاف ہو جائے گا کیا شیشۂ ہجراں دھل کے

ایک دن پاؤں تلے سے بھی زمیں سرکے گی
کچی بنیاد پہ رکھیں گے جو پتھر پل کے

دل کے گوشے میں جگہ کیا دے دی
تم تو بن بیٹھے ہو مختار ہی جیسے کُل کے

اپنے بچپن میں مجھے یاد ہے لکھنے کے لیے
تختیاں ہوتی تھیں، ہوتے تھے قلم نرکل کے

بستیاں پھر وہی خوابوں میں نظر آئیں سہیلؔ
زندگی ہم نے گزاری تھی جہاں مل جل کے

☆☆

ظفر گورکھپوری

ایسا بھی اک موسم اپنے قریۂ جاں میں آیا تھا
اندر تپتی دھوپ کا پہرہ، باہر بادل چھایا تھا

کچھ پانا ممکن ہی کہاں تھا اپنے آپ کو کھوئے بغیر
ایسا مشکل رستہ ہم نے دانستہ اپنایا تھا

ایسی کیا مجبوری تھی جو لوٹ گیا وہ یوں چپ چاپ
دستک تو دے سکتا تھا جب دروازے تک آیا تھا

اک حسرت تھی دنیا جیتیں لیکن وہ بھی ہار گئے
یادوں کا جو ساتھ ہمارے تھوڑا سا سرمایہ تھا

اب تو لہروں میں رہ کر بھی ملتا ہے دل کو آرام
جس دن پانی میں اُترے تھے اس دن جی گھبرایا تھا

سر کا زخم، مُرادوں کے گل یا مٹھی بھر خاک دعا
اُس در سے کچھ تو لے آتے جب دامن پھیلایا تھا

☆☆

خیال آفاقی

دنیا کے ہر اک ظلم پہ خاموش رہا ہوں
میں خود سے بہت روز فراموش رہا ہوں

کچھ شہر کے آئینے بھی محروم نظر تھے
کچھ میں بھی یونہی جان کے روپوش رہا ہوں

ہر دور میں کم ظرف کا دعویٰ یہ رہا ہے
"میں اگلے زمانے میں بلا نوش رہا ہوں"

کب میں نے فراموش کیا ہے ترے غم کو
کب میں تری یادوں سے سبکدوش رہا ہوں

غیروں سے نہ ہو تجھ کو تکلم میں کوئی عار
یہ سوچ کے محفل میں گراں گوش رہا ہوں

دیکھا تھا کبھی ایک نظر اس نے مجھے بھی
پہروں میں یہی سوچ کے مدہوش رہا ہوں

کیا کرتا خیالؔ اس کا تصور کہ گئی شب
میں ہوش میں رہتے ہوئے بے ہوش رہا ہوں

☆☆

ڈاکٹر سید قاسم جلال

اب تو دل میں تری طلب بھی نہیں
گو بظاہر کوئی سبب بھی نہیں

جی رہے ہیں جو ہیں حیات سے سیر
پی رہے ہیں جو تشنہ لب بھی نہیں

نوحۂ غم بھی اب نہیں لب پر
اور کوئی نغمۂ طرب بھی نہیں

بے حجابی بھی مرگِ الفت ہے
شرطِ وابستگی ادب بھی نہیں

ظلمتِ غم میں چاند تارے کیا
مشعلِ آہِ نیم شب بھی نہیں

جو دعائیں جلالؔ ہوں بے روح
ہو نہ مقبول تو عجب بھی نہیں

☆☆

احمد صغیر صدیقی

تمام اہلِ یقیں بے گماں گزرتے ہیں
جہاں سروں سے کئی ہفت خواں گزرتے ہیں

خیالِ در بدری کچھ زیادہ آتا ہے
نظر سے دور تلک جب مکاں گزرتے ہیں

ہمارے ساتھ بھی ہوتی ہے اپنی دھوپ کہ جب
سب اپنے اپنے لیے سائباں گزرتے ہیں

گزارتے ہیں انھیں بھی کمال ہے کہ نہیں
کسی کے ہجر میں لمحے کہاں گزرتے ہیں

وقوع ہوتے ہیں فرصت کے سارے ہی لمحات
جو کام کے ہوں وہ سب رائیگاں گزرتے ہیں

میں اپنے گھر میں سہی، مجھ کو بے سفر نہ کہو
درخت چلتے ہیں مجھ میں سماں گزرتے ہیں

پڑاؤ اپنا ہے اُس خطۂ جنوں میں جہاں
زمین ناچتی ہے آسماں گزرتے ہیں

☆

کرامت بخاری

(لاہور)

بے آس بہت ہے کہ یہ بیمار بہت ہے
اب ہم سے ملو دل کو یہ اصرار بہت ہے

یہ زخمِ جگر طالبِ پیکانِ نظر ہے
اب اس کے لیے لذتِ آزار بہت ہے

اک شخص جو ہر آن خفا رہتا ہے ہم سے
دل اس کی محبت میں گرفتار بہت ہے

کچھ ہم بھی بلانے کا تقاضا نہیں کرتے
کچھ اس کی طبیعت میں بھی انکار بہت ہے

مانا ہمیں جینے کا قرینہ نہیں آتا
اے زیست مگر تجھ سے ہمیں پیار بہت ہے

آتی ہیں نظر خواب میں بے خوابیاں شب کی
آنکھوں میں کہیں حسرتِ دیدار بہت ہے

چہروں پہ اتر آئے ہیں انداز دوکاں کے
بازار میں آرائشِ بازار بہت ہے

اس ذات کے صحرا کی کڑی دھوپ میں ہم کو
ساتھی نہ سہی سایۂ دیوار بہت ہے

☆

ارمان نجمی

سادہ ورق پہ نقش بناتے تو بات تھی
زورِ قلم سے رنگ جماتے تو بات تھی

محوِ سفر ہیں ہم بھی رہِ عام پر تو کیا
اپنی ڈگر پہ چل کے دکھاتے تو بات تھی

دنیا بھی دیکھتی کہ لہو کس کے تن میں ہے
للکار کر عدو کو بلاتے تو بات تھی

یہ کیا کہ سیلِ تند کی موجوں میں بہہ گئے
پانی میں ہاتھ پاؤں چلاتے تو بات تھی

کیوں عافیت کی گوشہ نشینی میں گم ہوئے
دنیا سے رسم و راہ بڑھاتے تو بات تھی

صحرا میں آ کے ہم نے چراغاں تو کر دیا
اپنی زمیں پہ باغ لگاتے تو بات تھی

☆☆

ارمان نجمی

تصویرِ شوق حسبِ تمنا نہ بن سکی
جو دل میں تھی وہ صورتِ زیبا نہ بن سکی

مٹی نہیں تھی وہ جسے کوزوں میں ڈھالتا
دنیا مرے خیال کی دنیا نہ بن سکی

رشتے رہے عزیز مسافت کے بیچ بھی
دوری کبھی وجود کا حصہ نہ بن سکی

اس آگ تک پہنچ نہ سکے کیا ہوا کے ہات
جو راکھ میں دبی رہی شعلہ نہ بن سکی

گھر کیا چھٹا کہ سارا جہاں تنگ ہو گیا
آوارگی سکون کا خیمہ نہ بن سکی

اس کی شناخت کیا جو حقیقت تھی خواب کی
پرچھائیں روشنی کا سراپا نہ بن سکی

کہنے کو کیا نہیں تھا مجھے اس کے رو برو
ناگفتنی سخن کا تقاضا نہ بن سکی

☆☆

خواجہ جاوید اختر

کسی کو ابھی تک پتہ کچھ نہیں ہے
مری بند مٹھی میں کیا کچھ نہیں ہے

نگاہیں بھی کچھ بیاں کر رہی ہیں
زباں سے تو اس نے کہا کچھ نہیں ہے

شکایت سبھی کو مجھی سے ہے، لیکن
مجھے تو کسی سے گلہ کچھ نہیں ہے

بہت کچھ دیا ہے زمانے کو ہم نے
زمانے سے ہم کو ملا کچھ نہیں ہے

جو مل جائے اس کو غنیمت ہی سمجھو
وگرنہ تو اچھا برا کچھ نہیں ہے

سروں کو جہاں سب جھکائے ہوئے ہیں
وہاں سے مرا سلسلہ کچھ نہیں ہے

☆

خواجہ جاوید اختر

صرف کہنے کو زندگی کچھ ہے
یہ کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ ہے

تو نے بس غم ہی غم دیے مولا
میرے حصے میں اور بھی کچھ ہے!

صرف دل کو سکوں نہیں ملتا
ورنہ کہنے کو تو سبھی کچھ ہے

تیرگی میں بھی دیکھ سکتا ہوں
دل کی آنکھوں میں روشنی کچھ ہے

دیکھ کر دوسروں کو ہنستے تھے
اپنی حالت بھی اب وہی کچھ ہے

کچھ تو ہے بے قراری مجھ کو بھی
اور اس کو بھی بے کلی کچھ ہے

☆☆

شفیع ہمدم

ادبار کی ہے ہر طرف یلغار دیکھیے
جینا ہوا ہے کس قدر دشوار دیکھیے

انگڑائیوں کی زد میں اب ان کا وجود ہے
آنکھوں میں ان کی نیند کے آثار دیکھیے

یہ ابلق ایام بڑا بے لگام ہے
تھمتی کہاں ہے! وقت کی رفتار دیکھیے

دکھ درد ہے، الم ہے، شب بے چراغ ہے
اک جان پر ہیں سیکڑوں آزار دیکھیے

زد میں کسی پریت کی یہ شہر آ گیا
سُونے پڑے ہیں کوچہ و بازار دیکھیے

چھینکے ہے ایک لمحے میں یہ سر اُتار کر
سیل زماں کے ہاتھ میں تلوار دیکھیے

☆☆

راشد الہ آبادی

نئے ماحول میں گم عزت و توقیر کر دینا
غلط ہے گھر کے دروازوں کو بے زنجیر کر دینا

تو آقا ہے تری شان کریمی درگزر کرنا
میں بندہ ہوں مری فطرت میں ہے تقصیر کر دینا

ابھی ٹکرا رہا ہوں میں حقیقت کی چٹانوں سے
کہاں ممکن ہے خوابوں کا محل تعمیر کر دینا

الجھ جاؤ گے تم بھی زندگانی کے مسائل سے
کبھی فرصت ملے تو کوئی خط تحریر کر دینا

مرے نزدیک وہ آئے تو بس اتنی گزارش ہے
مجھے پتھر بنا دینا، اسے تصویر کر دینا

مرے احباب لطف اندوز ہو لیں میری حالت سے
مری بگڑی بنانے میں ذرا تاخیر کر دینا

ہم اپنی راحتیں راشد تمھارے نام کر دیں گے
ہمارے نام تم بھی درد کی جاگیر کر دینا

☆☆

انور شمیم انور

کیوں ہو تم اپنی عافیت کے خلاف
جی سکو گے؟ منافقت کے خلاف

تھے ہمارے جو چشم دید گواہ
بول پائے نہ مصلحت کے خلاف

خیر، یارب کہ گھر اٹھے بادل
پھر ہماری شکستہ چھت کے خلاف

دل نے پھر کر لیا یقیں تم پر
تجربوں کی مخالفت کے خلاف

دیکھ مجبوریاں بھی، میرے ضمیر
تو ہے کیوں اس ملازمت کے خلاف

عشق ہے صرف ان کا کام انور
جو ہیں نقصان و منفعت کے خلاف

☆☆

حنیف نجمی

وہم و گماں کی حد سے اوپر جانے دے
موج و تلاطم سے باہر سر جانے دے

بازاروں میں کب تک ناٹک کھیلے گا
جا اب تو بھی مجھ کو بھی گھر جانے دے

دیکھ کے رنگ چمن کا خوشبو کہتی ہے
اب تو گلچیں مجھ کو باہر جانے دے

پھر اپنی جنت کی فکر کروں گا میں
پہلے دوزخ تو میری بھر جانے دے

ایسے رام ہوا تو پھر کیا رام ہوا
مت کر اس پر منتر ونتر جانے دے

دے کر اب "سلطان" خدایا نجمی کو
ارض و سما کی حد سے باہر جانے دے

☆☆

نسیم سحر

کچھ نہ خیرات میں دے، گر نہیں دیتا لیکن
دیکھ تو لے کہ ترے در پہ سوالی کوئی ہے!

وحشتیں چاہتی ہیں مجھ سے ٹھکانہ کوئی
دیکھوں گر دل میں جگہ تھوڑی سی خالی کوئی ہے!

حسن میں وہ بھی ہے لاثانی، یہ مانا میں نے
عشق کے باب میں مجھ سا بھی مثالی کوئی ہے؟

کوئی تیشے کا حوالہ نہیں رکھتا، لیکن
نہر میں نے بھی پہاڑوں سے نکالی کوئی ہے!

یہ نہیں دیکھنا، برباد ہوا ہوں کتنا!
سوچنا یہ ہے کہ امکان بحالی کوئی ہے؟

جس طرف دیکھ نہیں پاتی ہیں آنکھیں کچھ بھی
اک عجب چیز ادھر دیکھنے والی کوئی ہے!

اس کو تم بھول ہی جاؤ گے کسی روز نسیم
اس سے بڑھکر بھی بھلا خام خیالی کوئی ہے

☆

نسیم سحر

یا مرے رو برو آئینہ مثالی کوئی ہے
یا مری آنکھ میں تصویر خیالی کوئی ہے

رنگ کرنے لگے تبدیل سمندر اپنے
خون کی بوند جو نہی میں نے اچھالی کوئی ہے

دھند میں ڈوب گیا ہے وہ مہِ چاردہم
مجھ سا دنیا میں بھلا اور زوالی کوئی ہے!

جس میں سونا نہیں، انسان کو پرکھا جائے
کوئی بتلاؤ کہ ایسی بھی کٹھالی کوئی ہے؟

ہجر کی کرچیاں چننے میں ہی مصروف رہا
ساعتِ وصل کہاں میں نے سنبھالی کوئی ہے

تو نے تو دل شکنی کی نہیں میری ہرگز!
میں نے ہی بات تری دل سے لگالی کوئی ہے

دشت میں دیکھ کے آیا ہوں غزالاں کتنے!
ایک بھی ان میں کہاں تجھ سا غزالی کوئی ہے

☆☆

مشتاق شبنم

نہیں ایسا کہ آئینہ نہیں ہے
بشر تو ہیں مگر چہرہ نہیں ہے

نہ جانے کیوں میں ڈوبا جا رہا ہوں
اگر آنسو مرا دریا نہیں ہے

وہ جل کر راکھ ہو جاتا ہے آخر
جو اپنا دکھ کبھی کہتا نہیں ہے

اسے ایندھن بنا دیتی ہے دنیا
شجر جو پھولتا پھلتا نہیں ہے

بچا لے ڈوبنے والے کو بڑھ کر
کوئی ایسا سرِ دریا نہیں ہے

ہزاروں مسئلے ہیں پیش و پس میں
وہی تنہا ہے جو تنہا نہیں ہے

قیامت خیزیاں قدموں کی اپنے
پلٹ کر وقت نے دیکھا نہیں ہے

افق روشن کسی سورج سے لیکن
زمیں کا صبح سے رشتہ نہیں ہے

زمانے کو سمجھتا ہوں میں شبنم
زمانے نے مجھے سمجھا نہیں ہے

پروین شیر

حوصلہ ہر دیدہ ور یوں کھو رہا ہے
جو نہ ہونا چاہئے سب ہو رہا ہے

چار سو دیواریں حائل ہو رہی ہیں
واپسی کا راستہ بند ہو رہا ہے

خستہ و بوسیدہ جسمِ ناتواں پر
زندگی کا بوجھ انساں ڈھو رہا ہے

یہ بھی منظر سامنے آیا ہے میرے
میرے رستے میں وہ کانٹا بو رہا ہے

آ گیا وہ گھر بھی شعلوں کی لپٹ میں
آ کے جس میں کوئی تھک کر سو رہا ہے

اس نے جب ساحل پہ کشتی خود جلائی
واپسی کے واسطے کیوں رو رہا ہے

☆☆

امجد حسین امجد

مروت میں یہاں تک آ گیا ہوں
عدو کے آستاں تک آ گیا ہوں

عنایت کم نہیں مجھ پر کسی کی
انوکھے امتحاں تک آ گیا ہوں

مری تشنہ لبی کا معجزہ ہے
کہ بحرِ بے کراں تک آ گیا ہوں

سفر میں ساتھ تنہائی تھی میرے
پلٹ کر کارواں تک آ گیا ہوں

بتا دے راز اپنے ہم نشیں کے
میں ایسے رازداں تک آ گیا ہوں

کھڑے ہو تم ابھی تک اُس کنارے
مجھے دیکھو کہاں تک آ گیا ہوں

مثالِ رہ گزر ہو تم زمیں پر
میں نیلے آسماں تک آ گیا ہوں

☆☆

شہناز نبی

میں کن بجھی ہوئی آنکھوں میں خواب رکھنے لگی
کہ ریگ زاروں میں جیسے سراب رکھنے لگی

اسے تو پہلے بھی ہرگز نہ تھا وفا کا خیال
میں کیسے کانٹوں میں اپنا گلاب رکھنے لگی

ابھی تو اس کے لبوں پر سوال آئے نہیں
ابھی سے کیوں سرِ منظر جواب رکھنے لگی

سمندروں کی عداوت کا راز جب سے کھلا
ہر ایک لہر جوازِ حساب رکھنے لگی

بھٹکتی پھرتی تھی وحشت، ٹھکانہ جوں ہی دیا
ہمارے دل کو وہ تب سے خراب رکھنے لگی

ہمارے جرم تو ثابت نہیں ہوئے ہیں مگر
نگاہِ لطف و کرم بھی عتاب رکھنے لگی

مجھے تو اب کوئی نسبت نہیں ہے دنیا سے
کتابِ زیست میں پھر بھی یہ باب رکھنے لگی

☆☆

رگِ سنگ

ضمیر الدین

گھنٹی کے جواب میں اختر نے خود دروازہ کھولا۔ باہر ظہیر کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر اختر کو دوہری حیرت ہوئی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ظہیر آئے گا اور پھر اس نے کچھ عجیب حالت بنا رکھی تھی۔

شیو بڑھا ہوا تھا۔ کپڑے قدرے میلے اور کافی گچلے ہوئے تھے۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں۔ آنکھیں جیسے اُبلی پڑ رہی تھیں اور چہرے کے ریشوں کو جیسے کسی ساز کے تاروں کی طرح کس دیا گیا تھا۔

''ارے ظہیر بھائی!'' کہہ کر اختر نے دروازہ پورا کھول دیا۔

کمرے میں پہنچ کر ظہیر اور اختر آمنے سامنے دو کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

''شمی کی طبیعت اب کیسی ہے؟'' اختر نے پوچھا۔

''اچھی ہے!''

''بخار کم ہوا؟''

''ہاں!''

''میں نے تو تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ جلدی اتر جائے گا۔ موسمی بخار ہے۔ ٹائیفائڈ آئیفائڈ خاک نہیں۔ ڈاکٹروں کو تو آج کل ہر بخار ٹائیفائڈ نظر آتا ہے.....''

وہ بات کرتے کرتے رک گئی۔ ظہیر کھڑکی کے باہر جھکے ہوئے آسمان کے سرخ کنارے پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ اس نے ایک بار غور سے ظہیر کی ہیئت کا جائزہ لیا اور اسے پھر تعجب ہوا۔ کیونکہ وہ جس ظہیر کو اتنے عرصے سے جانتی آئی تھی وہ تو بڑا نفاست پسند تھا۔ ہر وقت صاف ستھرا رہنے والا۔ پتلون کی شکن نہ ٹوٹے، گھنگریالے بالوں کی ایک لٹ بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔ چہرہ ہر وقت چمچماتا رہے۔ جوتوں میں منہ دیکھا جا سکے اور یہ ظہیر جیسے کوئی انقلابی جسے اپنے سوا سب کی فکر ہو۔

''ظہیر بھائی!''

چونک کر ظہیر نے اپنی نگاہوں کا رُخ اختر کی طرف موڑ دیا۔

"میں کیا پوچھ رہی ہوں۔"

ظہیر کی آنکھوں نے پوچھا۔ "کیا؟"

"یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟"

ایک پھیکی مسکراہٹ ظہیر کا جواب تھی۔

اختر کو ظہیر کی خاموشی اور اداسی پر تعجب ہو رہا تھا۔ کیونکہ وہ اگر باتونی تھی تو ظہیر بھی کم گو نہ تھا۔ دراصل ان کے تعلقات کی بنیاد ان کے مزاجوں کے موافقت پر ہی تھی۔ دونوں بلا کے ہنس مکھ، خوش مزاج اور زندہ دل تھے۔ شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا تھا کہ ظہیر پر خاموشی کا دورہ پڑتا تھا جن دنوں اس پر عشق کا بھوت سوار تھا اور شمی کو پانے کے امکانات روز بروز کم ہوتے جا رہے تھے ان دنوں کبھی کبھار وہ اداس نظر آتا۔ لیکن اپنی پریشانی اور فکروں کا ڈھنڈورا کبھی نہ پیٹتا اور اگر کبھی گم صم ہو بھی جاتا تو اختر اسے اتنا چھیڑتی کہ وہ اپنی فکروں اور پریشانیوں کو بھول کر پھر وہی ظہیر بن جاتا کہ جو تھا۔

لمحہ دو لمحہ خاموش رہ کے اختر نے ہلکے پھلکے لہجہ میں کہنا شروع کیا۔

"میں کل آ رہی تھی۔ مگر مرزا جی آن دھمکے اور ایسے چپٹے کہ ٹلنے کا نام نہ لیا گیارہ بجے رات کو جا کر پیچھا چھوڑا۔ قدرت کے دوست بھی ایک سے ایک بڑھ کر ہیں......

اور ذرا رک کر۔

"سوائے تمہارے!"

ظہیر نے جھکی ہوئی نظریں اٹھا کر اختر کی جانب دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔

"مگر تم تو گئے ہاتھ سے اب۔ پرائے جو ہو گئے۔ شادی کیا ہوئی گویا ہم کو بھول گئے۔"

اس کے لہجے میں نہ طنز تھا۔ نہ شکایت۔ بس تمسخر تھا۔

"کبھی کبھی درشت ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی نہ معلوم کب تک...... بیگم صاحبہ نے کہیں حکم صادر کر دیا کہ اختر کے ہاں آنا جانا بند تو پھر ہم تو صورت کو بھی ترس جائیں گے۔"

اس نے اپنی کرسی گھسیٹ کر ظہیر کی کرسی کے پاس کر لی۔

"کیوں نہ ہو صاحب! اکلوتی جو ٹھہریں اور بڑی دقت سے ہاتھ آئی ہیں۔"

شمی کے گھر والوں کو نہ اس کا ظہیر سے ملنا جلنا پسند تھا اور نہ وہ چاہتے تھے کہ وہ ظہیر سے شادی کرے۔

"ظہیر بھائی بے چارے صبح شام پوجا کرتے ہوں گے بیگم صاحبہ کی، تب چین آتا ہوگا کہیں۔ فرہاد کی قبر پر لات ماردی تم نے ظہیر بھائی۔"

وہ یکا یک اٹھ کھڑی ہوئی۔

ظہیر پھر کھلی کھڑکی کے باہر پھولی ہوئی شفق پر نظریں گاڑے ہوئے تھا۔

اختر چلائی ''ظہیر بھائی!''

ظہیر نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''سن رہے ہو کہ نہیں؟''

''ہاں۔''

''ہاں کیا خاک۔ میں پوچھتی ہوں چپ کا روزہ رکھا ہے یا ہونٹ سی لئے ہیں۔''

ظہیر چپ رہا۔

''یا اللہ خیر!''

وہ آ کر ظہیر کی کرسی کے ہتے پر بیٹھ گئی۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں بولتے کیوں نہیں.....؟''

ظہیر نے گردن جھکا لی۔

''ناراض ہو گئے ہو کیا؟''

ظہیر پھر بھی چپ رہا۔

''بولو.....'' اختر نے اپنا ہاتھ اس کی بغل کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''بولو ورنہ میں کرتی ہوں گدگدی۔''

ظہیر کے گدگدی بہت ہوتی تھی اور جب کبھی وہ کھو سا جاتا تھا تو اختر اسے گدگدی کر کے ہنسایا کرتی تھی۔

''بولتے ہو کہ نہیں؟''

ظہیر کے ہونٹ بند رہے اور اختر گدگدی کرنے لگی۔

''نہیں بھابھی'' ظہیر نے آہستہ سے اختر کے ہاتھ کو اپنے بدن سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

اختر اچھل کر کھڑی ہو گئی اور اس کا چہرہ ایک دم نہایت سنجیدہ ہو گیا۔

''تم نے آج پھر پی۔''

ظہیر کی جھکی ہوئی گردن اور جھک گئی۔

شادی سے پہلے جب ایک وقت ایسا آیا تھا کہ ظہیر شمی کو پانے کی امید قریب قریب چھوڑ چکا تھا اس نے شراب نوشی شروع کر دی تھی۔

''اچھی بھلی چھوڑ دی تھی۔ پھر یہ آج کیا ہوا کہ.....''

جب سب سے پہلے اختر کو پتہ چلا تھا کہ ظہیر نے شراب پینی شروع کردی ہے تو اس نے بہت کوشش کی وہ اس حرکت سے باز آجائے مگر ظہیر نے کئی بار چھوڑی اور کئی بار پھر شروع کی۔ آخر عاجز آکر اختر نے شمی کو خبر کردی اور جب ان کی شادی کے راستے سے تمام روڑے ہٹ گئے تو شمی نے ظہیر سے وعدہ لیا کہ وہ اب شراب کو چھوئے گا بھی نہیں۔ ظہیر نے وعدہ کیا اور اسے نبھایا بھی۔ اس کی شادی کو تین مہینے ہو چکے تھے مگر ان تین مہینوں میں وہ شراب کے پاس بھی نہیں پھٹکا تھا۔

"تمہیں شرم تو نہیں آتی شمی کو پتہ چلے تو کیا ہو۔ اسی محبت کی اتنی ڈینگیں مارا کرتے تھے۔ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ یہ نہیں کر سکتے۔ وہ نہیں کر سکتے۔"

ظہیر کے جبڑے مضبوطی سے ایک دوسرے پر جم گئے۔

"کیا چار روز پیتے ہوں گے۔ آج ادھر بھٹک آئے تو معلوم ہوگیا۔ تب ہی چپ سادھ رکھی تھی۔ ذرا اپنی صورت تو دیکھو آئینے میں۔ کیسی نحوست برس رہی ہے۔ جیسے کہیں......"

ظہیر اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔

"بھابھی! میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ میں لیٹوں گا۔ سونے کے کمرے میں کوئی ہے تو نہیں؟"

"ہوگا کون" اختر کی آواز میں جھلاہٹ تھی۔ "قدرت آج نجانے کیوں آفس سے نہیں آئے۔"

ظہیر سونے کے کمرے کی جانب چلا۔

"درد نہیں ہوگا تو کیا آرام ملے گا۔ ہونہہ۔"

وہ کمرے کے باہر نکل گیا اور اختر کرسی پر جیسے گر پڑی۔

اختر اور ظہیر ایک دوسرے کو اس زمانے سے جانتے تھے جب وہ کالج میں پڑھا کرتے تھے۔ پھر اختر کی شادی قدرت سے ہوگئی جو ظہیر کا گہرا دوست تھا اور کالج کی سرسری ملاقات ہمدلی اور ہمدردی کے مضبوط رشتے میں تبدیل ہوگئی۔ وہ ظہیر کو بھائی اور ظہیر اسے بھابھی کہنے لگا۔

کمرے کے باہر قدموں کی چاپ سن کر اختر کے چہرے پر سے ناراضگی نما تکلیف کے آثار مٹ گئے۔ قدرت کے قدموں کی چاپ تھی۔ مگر بدلی ہوئی۔ قدم تیز تیز اٹھ رہے تھے اور ان سے بے انتہا گھبراہٹ اور بے چینی کی صدا آرہی تھی۔ اختر کا جسم تن گیا۔

دھڑ سے دروازہ کھلا۔

قدرت ہی تھا۔

اختر کا سانس رک گیا۔

وہ بے حد سراسیمہ نظر آرہا تھا۔

اختر یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ کیا ہوا۔

"غضب ہو گیا۔"

اختر کے منہ سے پھر بھی آواز نہ نکل سکی۔

"دشمی کا انتقال ہو گیا!"

"ہائے!" اختر نے چھاتی پر ہاتھ مارا "انا للہ و انا الیہ راجعون۔ کب؟"

"کل رات کو۔" قدرت کا سانس پھولا ہوا تھا۔ گھبراہٹ کی وجہ سے یا تیز تیز چلنے کی وجہ سے۔

"میں ظہیر کے ہاں گیا تھا شام تک طبیعت بہتر تھی۔ پچھلے پہر اچانک......"

دونوں ایک دوسرے کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

"ظہیر جنازے کے بعد سے غائب ہے۔"

"وہ تو یہاں ہیں!"

"وہ یہاں ہے! گھر پر سب پریشان ہیں۔ خالہ بے چاری کا برا حال ہے۔ کہہ رہی تھیں کہ اسے سکتہ ہو گیا ہے۔ اس کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں ٹپکا۔"

آگے آگے اختر اور پیچھے پیچھے قدرت سونے کے کمرے کی سمت لپکے مگر ظہیر وہاں نہیں تھا۔

اختر نے آواز دی، "ظہیر بھائی!"

کوئی جواب نہ ملا۔

اختر نے پھر آواز دی، "ظہیر بھائی!"

جواب میں باہر گلی سے ایک عجیب قسم کا شور بلند ہوا۔ کسی کے چیخنے کی آواز اور پھر بہت سے لوگوں کی ملی جلی اونچی نیچی آوازیں دونوں نے دوڑ کر بالکونی پار کی اور نیچے جھانکا۔

گلی میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ کچھ ادھر اُدھر بھاگ دوڑ رہے تھے کچھ دم بخود گردنیں اٹھائے اوپر دیکھ رہے تھے۔ دو ایک ہاتھ ہلا ہلا کر آس پاس کے لوگوں سے کچھ کہہ رہے تھے۔ پان بیڑی والا اپنی دکان چھوڑ کر گلی میں آ گیا تھا۔ آئس کریم والے نے اپنا ٹھیلہ روک لیا تھا اور گھوڑا گاڑی والا گاڑی کی گدی پر کھڑا ہنٹر ہلا ہلا کر کسی کو کچھ ہدایت دے رہا تھا۔

قدرت کا فلیٹ تیسری منزل پر تھا۔ اس کے نیچے جو فلیٹ تھا اس کی بالکونی اور گلی کے فرش میں تقریباً ساٹھ فٹ کا فاصلہ تھا کوئی بالکونی میں سے کودے یا گر پڑے تو ہڈی پسلی ایک ہو جانا یقینی تھا۔

دونوں ہاتھوں سے بالکونی کی آہنی باڑھ کو پکڑے ہوئے ظہیر نیچے گلی میں جمع لوگوں اور اوپر کی بالکونی میں کھڑے ہوئے قدرت اور اختر کے درمیان معلق تھا۔ رہ رہ کر "مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ" کا نعرہ لگا رہا

تھا اور ساتھ ساتھ کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح باڑھ کو عبور کر کے بالکونی میں پہنچ جائے مگر بالکونی کے نیچے کوئی ایسی چیز اس کی پہنچ میں نہ تھی جس پر پیر ٹیک کر وہ اچک سکتا اور نہ ہی اس کے ہاتھوں میں اتنا دم تھا کہ خالی ان کے سہارے اتنا اوپر اٹھ سکتا کہ اس کا سینہ باڑھ تک آ جاتا۔

قدرت فوراً دروازہ کھول کر نیچے بھاگا۔ ابھی ایک زینہ اترا ہوگا کہ کچھ لوگ دوڑتے ہوئے اوپر آئے یہ لوگ قدرت کے نیچے والے فلیٹ کو دیکھ آئے تھے۔ اس کے دروازے میں تالا پڑا ہوا تھا۔

ایک ہی صورت باقی تھی۔ اگر کوئی مضبوط رسی مل جائے تو اسے قدرت کے فلیٹ کی بالکونی سے نیچے لٹکایا جائے تاکہ معلق ظہیر اسے پکڑ کر نیچے اتر سکے۔

قدرت اور اس کے پیچھے وہ لوگ اوپر بھاگے فلیٹ میں داخل ہوتے ہی اس نے بدحواس اختر سے پوچھا کہ گھر میں کوئی مضبوط رسی ہے۔ حالانکہ اختر کو بخوبی معلوم تھا کہ گھر میں اس کام کی کوئی رسی نہیں مگر پھر بھی اس نے آن کی آن میں آٹے دال کی کوٹھری کی ہر چیز الٹ پلٹ کر کے قدرت سے کہا نہیں۔

فوراً قدرت اور وہ لوگ نیچے کی طرف دوڑے اور کئی کئی سیڑھیاں ایک ایک چھلانگ میں پار کرتے ہوئے گلی میں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ کسی نے ایک رسی برآمد کی ہے۔ مگر گھوڑا گاڑی والا جواب اپنی گدی سے اتر آیا تھا، چلا رہا تھا، "بھائی اس سے کام نہیں چلے گا۔"

یکا یک پان بیڑی والے کے دماغ نے جست لگائی اس نے جھپٹ کر اپنی دوکان کے سامنے لٹکا رہنے والا پھٹا گھسیٹا اور اس میں پھنسا ہوا بانس نکالنے لگا۔ دو نوجوانوں نے بڑھ کر مٹھائی والے کو دوکان کا پھٹا بغیر اس کی اجازت کے گھسیٹا اور بانس نکال کر پھینک دیا۔ چار پانچ نوجوانوں نے دونوں پھٹوں کو ملا کر مضبوطی سے پکڑا اور انہیں بالکونی کے نیچے فٹ پاتھ پر پھیلا کر کھڑے ہو گئے۔

گلی میں ایک شور بلند ہوا۔

"کود پڑو بابو جی۔"

"ڈرو مت۔"

"ٹھیک ہے گھبراؤ نہیں۔"

ظہیر نے دوبارہ چہرہ جھکا کر خوفزدہ نگاہوں سے نیچے پھیلتے ہوئے پھٹوں کو دیکھا۔ پھر آنکھیں بند کیں اور بالکونی کی آہنی باڑھ کو آہستہ سے چھوڑ دیا۔

جب اس کے بدن نے فٹ پاتھ کی سختی محسوس کی تو ظہیر نے آنکھیں کھول دیں۔ جن پھٹوں پر وہ گرا تھا انہیں اس کے سمیت فٹ پاتھ پر رکھ دیا گیا تھا اور اس کے چاروں طرف بہت سے چہرے جمع تھے۔ چند ساعتوں تک موت سے بچ نکلنے کا خیال اس کے ذہن پر اس طرح حاوی رہا کہ ظہیر نے ان چہروں کو دیکھا

تو نگران پر لکھی ہوئی عبارتوں کو نہ پڑھ سکا۔ مگر موت سے نجات کا خیال پھر خیال تھا۔ گزر گیا اور پھر جو اس نے تماشائیوں کے چہروں پر جھجکتی ہوئی نظریں ڈالیں تو وہاں اسے نہ فکر و پریشانی نظر آئی اور نہ طمانیت اور خوشی۔ اگر کچھ تھا تو تمسخر جس میں کہیں کہیں حقارت کا شائبہ بھی تھا۔

ظہیر کی نظریں بھٹک گئیں۔

قدرت نے ہاتھ پکڑ کر اسے اُٹھایا۔

"بابو جی نیاز کروا دینا۔" مجمع میں سے آواز آئی۔

کچھ لوگ ٹھٹھا مار کر ہنسے۔

ظہیر کے لئے اپنی آنکھوں کو جو بھیگنے کا نام نہ لیتی تھیں اب ڈوبنے سے بچانا مشکل ہو گیا۔

ایک اور آواز آئی "بالکونی کی منڈیر ذرا اونچی کروا لو صاحب!"

ایک اور قہقہہ پڑا...... دو قدم چل کر بلڈنگ کے نیچے پھاٹک میں داخل ہونا ظہیر کے لئے دوبھر ہو گیا۔ پھاٹک میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر اختر پر پڑی جو زینہ اتر چکی تھی۔ ظہیر کو دیکھ کر وہ جہاں تھی وہیں رک گئی۔

ظہیر نے جھجکتے ہوئے اختر کی نظروں سے نظریں ملائیں ان میں حقارت تھی نہ ملامت اور نہ تمسخر، بس ایک استعجاب تھا جیسے کہہ رہی ہوں "تم اور یہ حرکت۔"

اختر دو قدم چل کر ظہیر کے پاس آئی۔ اس کا ہاتھ پکڑا اور زینے کی طرف لے جانے لگی مگر ظہیر کے قدموں نے اٹھنے سے انکار کر دیا۔ اس کا سر جھک کر اختر کے کاندھے پر آ گیا اور اس کے منہ سے نکلا۔

"بھابھی! امی مر گئی!"

اور پھر آنسوؤں کا نہ جانے کب سے امڈا ہوا طوفان جو ظہیر کی آنکھوں سے پھوٹا ہے تو......

☆☆☆

فنونِ لطیفہ

استاد اللہ بخش ۔ عہد ساز مصور

(مصوری میں پنجاب کی تہذیب اور ثقافت کا ترجمان)

بشیر موجد

قیامِ پاکستان سے پہلے ۱۹۴۶ء میں، میں ایک ادارے فائن پینٹنگ ورکس میں بورڈ نویسی کا کام سیکھ رہا تھا۔ اس ادارے کے منتظم اعلیٰ کا نام محمد شریف تھا۔ وہ استاد اللہ بخش صاحب کے ناکام شاگردوں میں سے ایک تھے۔ وہ چند برس تک استاد محترم کی شاگردی میں وقت گزار کر واپس آئے تو انھوں نے بورڈ نویسی کو اپنا ذریعۂ معاش بنالیا۔ اس دکان میں اور بھی کاریگر تھے۔ میرے علاوہ دو ایک شاگرد اور بھی تھے۔ ان میں کسی نہ کسی حوالے سے استاد محترم کا ذکر ہوتا رہتا تھا۔ اس ذکر سے میرے دل میں استاد محترم سے ملنے اور ان کا کام دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ اس زمانے میں استاد محترم کی یہ شہرت بھی تھی کہ وہ کرشن مہاراج کو زیادہ پینٹ کرتے تھے اور ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق وہ گوشت کھانے سے پرہیز کرتے تھے۔ اپنی اس ادا سے وہ ہندوؤں میں بہت مقبول تھے جس کی وجہ سے کرشن مہاراج کی بنائی ہوئی پورٹریٹ ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوجاتی تھی۔ ہندوؤں میں ان کا بہت احترام ہونے لگا تھا۔ میں نے دیکھا کہ بعض ہندو ان کو دیکھتے ہی کھڑے ہوکر تعظیم دیتے اور ان کے ہاتھ چومتے تھے۔ اس وجہ سے ان کی مالی حالت بھی بہت بہتر تھی اور انھیں ہندوستان گیر شہرت میسر آئی تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں میں قیامِ پاکستان کی جدوجہد اپنے عروج پر تھی۔ ہر طرف "لے کے رہیں گے پاکستان" کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ اس زمانے میں استاد محترم عطر چند کپور پریس کے شعبۂ ڈیزائننگ میں ملازمت کرتے تھے۔ یہ ادارہ میکلوڈ روڈ پر واقع تھا۔ رتن سینما جو اس وقت تعمیر کے مراحل طے کررہا تھا، اس کے بالکل سامنے سڑک کے اس پار کپور بلڈنگ کے ایک بڑے ہال میں بیٹھے استاد اللہ بخش برش کی رفاقت سے مصروفِ عمل رہتے تھے۔

ایک دن پتہ چلا کہ ہمارے ادارے کے منتظم اعلیٰ استاد اللہ بخش صاحب سے ملنے جارہے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر کہا کہ میں بھی استاد محترم سے ملنا اور ان کے کام کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ شریف صاحب مجھے ساتھ لے کر بیڈن روڈ سے لکشمی چوک ہوتے ہوئے کپور بلڈنگ کے ایک بڑے ہال میں پہنچ گئے۔ شریف صاحب نے بڑے ادب سے محترم کو سلام کیا تو انھوں نے اپنے پاس پڑی کرسی پر شریف صاحب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ شریف

صاحب نے بیٹھتے ہی اپنے آنے کا مقصد بیان کیا کہ میں نے ایک گاہک سے پورٹریٹ کا آرڈر لیا ہے۔ یہ آرڈر آپ کے برش کا مرہونِ منت ہے۔ شریف صاحب کی بات سن کر استادِ محترم نے عزیز صاحب کو آواز دی کہ شریف کا کام مکمل کر دینا اور جو بھی اجرت دیں، وصول کر لینا۔ میں شریف صاحب کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ شریف صاحب نے اٹھتے ہوئے میرا تعارف کروایا، یہ لڑکا میری دکان میں بورڈ تو یسی سیکھ رہا ہے، آپ سے ملنے اور آپ کا کام دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ استاد بہت اچھے موڈ میں تھے۔ میں نے موقع کو غنیمت جانتے ہوئے، جھجکتے ہوئے عرض کیا، استادِ محترم اگر آپ اجازت دیں تو میں کبھی کبھی آپ کا کام دیکھنے آ جایا کروں۔" انھوں نے شریف صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا، "ہاں آ جایا کرو۔" استادِ محترم کی 'ہاں' سے مجھے یوں لگا کہ جیسے مجھے دنیا جہان کی نعمتیں مل گئی ہیں۔

میں نے اوپر عزیز کا ذکر کیا ہے۔ عزیز صاحب استادِ محترم کے برادر نسبتی تھے اور شاگرد بھی۔ اسی شاگردی کا اعجاز تھا کہ پھر ایسا وقت بھی آیا کہ انھیں شہرت و عزت حاصل ہوئی۔ بطور اسٹیٹ آرٹسٹ، پٹیالا اسٹیٹ میں ملازم ہو گئے اور پاکستان کے قیام کے بعد واپس آئے اور ساری زندگی استادِ محترم کی خدمت میں گزار دی۔ استادِ محترم کی رحلت کے کچھ دنوں بعد وہ بھی راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔

قیامِ پاکستان کے بعد حالات کے تھپیڑے مجھے کراچی لے گئے۔ چند برس بعد میں واپس آیا۔ رائل پارک میں ایک کمرہ لے کر کمرشل ڈیزائننگ کا کام شروع کیا تو استادِ محترم کی پھر یاد آئی۔ ان دنوں وہ مسلم ٹاؤن میں مولانا مہر صاحب کے مکان کے عقب میں ذاتی رہائش گاہ میں مقیم تھے۔ میں ہر اتوار کو استادِ محترم کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت حاصل کرنے لگا۔ اس طرح حاضری دیتے ہوئے کئی برس بیت گئے۔ اسی زمانے میں، میں نے دیکھا کہ مصورِ مشرق عبدالرحمن چغتائی صاحب مہینے میں ایک بار استاد اللہ بخش سے ملنے آتے تھے اور اسی طرح مہینے میں ایک بار استاد اللہ بخش عبدالرحمن چغتائی کے گھر ملنے کے لیے جایا کرتے تھے۔ ان ملاقاتوں میں جو سب سے اہم بات تھی وہ یہ کہ دونوں استاد اپنا کام ایک دوسرے کو دکھا کر مشورہ لیتے تھے۔ ایک دن میں استادِ محترم کے پاس بیٹھا ہوا انھیں پینٹ کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ مین گیٹ پر ایک تانگہ آ کر رکا۔ استادِ محترم نے اس طرف دیکھے بغیر کہہ دیا کہ چغتائی ہوں گے۔ واقعی چغتائی صاحب اپنی پینٹنگ اٹھائے ہوئے تشریف لا رہے تھے۔ استادِ محترم نے کھڑے ہو کر اپنے دوست چغتائی کا استقبال کیا۔ چغتائی صاحب کرسی پر بیٹھ گئے تو دونوں استادوں نے ایک دوسرے کے حال احوال پوچھے۔ اتنے میں عزیز صاحب آ گئے۔ آتے ہی چغتائی صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگے، "میں نے ایک کام مکمل کیا ہے، میں چاہتا ہوں کہ آپ ایک نظر دیکھ لیں۔" چغتائی صاحب کی 'ہاں' سنتے ہی عزیز نے اپنی پینٹنگ لا کر سامنے رکھ دی۔ چغتائی صاحب نے اسے چند منٹ غور سے دیکھا، پھر چند ایک جگہ پر نقائص کی نشاندہی کی اور شاباش بھی دی، پھر کہا کہ استاد اللہ بخش کے ہوتے ہوئے میرے مشورے

لی کیا ضرورت تھی۔

اس کے بعد عزیز صاحب نے استاد اللہ بخش کی ایک پینٹنگ لا کر سامنے رکھ دی تو چغتائی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے، دو قدم پیچھے ہو کر اور پھر دو قدم آگے بڑھ کر پینٹنگ دیکھنے کے بعد فرمانے لگے، "اللہ بخش یار، کمال کی پینٹنگ کی ہے، جتنی بھی داد دی جائے، کم ہے۔" یہ الفاظ اپنے ایک ہم عصر استاد سے سن کر استاد اللہ بخش کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ پھر چغتائی نے اپنی پینٹنگ ایزل پر رکھتے ہوئے کہا کہ اس پینٹنگ میں، میں نے رنگوں کا ایک تجربہ کیا ہے۔ عزیز اور استاد محترم نے چغتائی صاحب کی پینٹنگ دیکھ کر کہا کہ چغتائی صاحب واش میڈیا صرف آپ کی ایجاد ہے، اس سے پہلے اس کی کوئی مثال موجود نہیں اور نہ ہی اس کے بعد اس مشکل کام کو کر سکے گا۔ دونوں استاد ایک دوسرے کو داد دینے کے بعد چائے نوش کرنے بیٹھ گئے۔ مجھے عزیز نے بتایا کہ ہر مہینے ایک بار دونوں استادوں کی اسی طرح ملاقات ہوتی ہے۔ اگلے مہینے ہم اپنا کام لے کر چغتائی صاحب کے گھر جائیں گے۔ اس طرح ایک دوسرے کے فنی تجربات سے فائدہ اٹھائیں گے۔

میں نے ان دو بڑے مصور استادوں کے باہمی روابط اور ایک دوسرے کے احترام کا اظہار جس طرح دیکھا، وہ ان کے ساتھ ہی چلا گیا۔ اتنی شہرت حاصل کرنے کے بعد بھی فن کی لگن میں آگے بڑھنے کے راستے تلاش کرنے کی لگن ہو تو ایسی ہو۔ ایک دن میں استاد محترم اللہ بخش کی خدمت میں حاضر تھا تو مجھے بتایا گیا کہ مصور میاں اعجاز صاحب (باغبان پوری) سے ملنے کا پروگرام ہے۔ عزیز صاحب اپنے ملازم کوچوان سے تانگہ تیار کروا رہے تھے۔ میں نے عزیز کے کان میں کہا کہ تانگے میں اگر گنجائش ہو تو میں بھی میاں اعجاز صاحب سے ملنے اور ان کا کام دیکھنے کا خواہش مند ہوں۔ ایک دو نمائشوں میں ان کے کام تو دیکھے ہیں لیکن ان سے ملاقات کا موقع کبھی نہیں ملا۔ عزیز صاحب نے استاد محترم سے میری خواہش کا اظہار کیا تو استاد محترم مجھ سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے، میں تمھیں عزیز کی طرح ہی عزیز رکھتا ہوں، تم ہمارے ساتھ چلو۔ تانگہ کوچوان نے گھر سے باہر نکالا تو میں یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ استاد محترم نے تانگے کا کنٹرول خود سنبھال لیا اور بلا تکلف چلاتے رہے۔ ملازم پچھلی سیٹ پر عزیز صاحب کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے انھوں نے اپنے ساتھ اگلی سیٹ پر جگہ دی جو میرے لیے باعث افتخار تھا۔

پون گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد ہم باغبان پورہ گھاس منڈی سے ہوتے ہوئے مدینہ چوک پہنچ گئے۔ ہم تینوں تانگے سے نیچے اتر گئے۔ تانگہ بان نے تانگہ مدینہ چوک کی ایک گلی میں کھڑا کر لیا۔ ہم پیدل چلتے ہوئے استاد اعجاز صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ عزیز نے دروازے پر دستک دی تو استاد اعجاز صاحب کے بڑے صاحب زادے میاں مجید نے دروازہ کھولا۔ یہ وہی مجید صاحب ہیں جو بعد میں نیشنل کالج آف آرٹس میں فوٹوگرافی کے استاد تھے۔ چند برس پہلے ریٹائر ہو کر اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنی رحمتوں سے نوازے۔

مجید صاحب ہمیں ایک کمرے میں بٹھا کر اپنے والد بزرگوار کو اطلاع دینے چلے گئے۔ جب انھیں اپنے محترم دوست اللہ بخش کی آمد کی اطلاع دی گئی تو وہ اس وقت اپنی پینٹنگ کو آخری فنشنگ ٹچ دے رہے تھے۔ وہ فوراً آئے اور استاد اللہ بخش کو گلے لگالیا۔ عزیز سے ہاتھ ملایا تو عزیز نے میرا تعارف کروایا۔ پھر ہم تینوں کو اس کمرے میں لے گئے جہاں پر وہ پینٹنگ مکمل کررہے تھے۔ جب ہم کمرے میں بیٹھ گئے تو انھوں نے استاد اللہ بخش اور عزیز کے حال احوال پوچھے، پھر اپنی پینٹنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے، ''اللہ بخش! اس پینٹنگ کے بارے میں آپ کا کیا تاثر ہے؟'' استاد اللہ بخش نے خوب داد دی۔ پھر ان کے بیٹے مجید صاحب دو اور پینٹنگ لے آئے تو استاد اللہ بخش نے بڑے محتاط انداز میں 'اچھا' کہہ کر خاموشی اختیار کرلی۔ پھر دونوں بزرگ استاد اپنے ہم عصروں کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ اتنے میں مجید صاحب چائے لے کر آگئے۔ چائے کے اختتام پر عزیز نے اجازت لی اور ہم واپس مدینہ چوک پہنچ گئے۔ استاد اعجاز صاحب بڑے پڑھے لکھے مصور تھے۔ انھوں نے مصوری پر اردو میں ایک کتاب مرتب کی تھی جو اس وقت کے مجلس ترقی ادب کے ڈائرکٹر امتیاز علی تاج نے دس ہزار روپے میں خرید لی تھی۔ پھر ایک زمانے کے بعد ندیم صاحب اسی منصب پر فائز ہوئے تو میں نے عرض کیا ''اس کتاب کو شائع کرنے میں کیا کوئی مجبوری حائل ہے؟'' مجھے بتایا گیا کہ اسلام آباد کا کوئی ادارہ (نام یاد نہیں رہا) مبلغ دس ہزار مجلس ترقی ادب کو دے کر اس کتاب کا مسودہ بغرضِ اشاعت لے گیا تھا۔ پھر آج تک اس مسودے کا کیا حشر ہوا یہ ندیم صاحب کے بھی علم میں نہ تھا۔

میرے قریبی دوست ریاض شاہد (جنھوں نے بعد میں فلم انڈسٹری میں نام پیدا کیا) ہفت روزہ ''لیل ونہار'' میں ملازم تھے۔ ایک دن آئے تو کہنے لگے کہ ایڈیٹر صاحب نے مجھے کہا ہے کہ میں استاد اللہ بخش صاحب کا انٹرویو کرلوں لیکن میں فنِ مصوری کے بارے میں کچھ نہیں جانتا، اس سلسلے میں تم میری مدد کرو۔ میں نے کہا میں حاضر ہوں۔ ہم دونوں نے بیٹھ کر کچھ سوالات تحریر کرلیے۔ پھر رکشہ لے کر مسلم ٹاؤن پہنچ گئے۔ استاد اللہ بخش اپنے کام میں مصروف تھے۔ میں نے جاتے ہی ریاض شاہد کا تعارف کروایا تو استاد محترم فرمانے لگے کہ مجھے فون پر اطلاع کردیتے تو میں ذہنی طور پر تیار ہوجاتا۔ پھر فرمانے لگے کہ میں جو کام کررہا ہوں اسے کسی حد تک مکمل کرنے کی اجازت دیں، فارغ ہوکر آپ سے باتیں کروں گا۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے کام سے فارغ ہوگئے تو ریاض شاہد نے انٹرویو کا سلسلہ شروع کیا۔ سوالات کیا تھے اور جوابات کیا تھے، اب میرے ذہن میں محفوظ نہیں ہیں۔ لیکن ایک آدھ سوال ذہن میں محفوظ ہیں اور اس کا جواب بھی۔ ایک سوال میں ان سے پوچھا گیا تھا کہ کیا یہ درست ہے کہ آپ کو تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا؟ استاد محترم نے فوراً جواب دیا کہ یہ ٹھیک ہے کہ تنگ دستی کی وجہ سے اسکول تک نہیں پہنچ سکا لیکن جس فن سے میں منسلک ہوں اس فن میں، میں نے پی ایچ ڈی کر رکھی ہے۔ انڈو پاکستان میں کئی بڑے بڑے شہرت یافتہ مصور میرے شاگرد ہیں۔ چند ماہ بھی انھوں نے لیے جو اس وقت ذہن

میں نہیں ہیں۔ ریاض شاہد نے سوال کیا کہ آپ فن کی طرف کیسے آئے تو استاد اللہ بخش کا جواب تھا کہ میں اس فن کی لگن لے کر ہی پیدا ہوا تھا۔ گھر میں غربت تھی جب کہ اس دور میں بڑی کٹھن منزلوں سے گزر کر یہ فن حاصل کرنا پڑتا تھا۔ مجھے بھی ان کٹھنائیوں سے گزرنا پڑا۔ چند برس میں نے ریلوے ورکشاپ میں بطور پینٹر کام کیا، پھر فن کی لگن مجھے مال روڈ کے ایک پینٹر کے پاس لے آئی۔ یہ جگہ ایک جھونپڑا نما سی دکان تھی جہاں پر آج کل مسجد شہدا تعمیر ہو چکی ہے۔ اس جگہ پر میں ایک روپیہ روزانہ پر ملازم ہو گیا۔ سوال و جواب کا سلسلہ جاری تھا کہ عصر کی اذان کان میں گونجی۔ اذان سنتے ہی استادِ محترم نماز کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر فرمانے لگے کہ نماز کے بعد ایک ضروری کام سے بھی جانا ہے۔ اگر کچھ سوالات رہ گئے ہوں تو پھر کسی دن فون کر کے آجانا۔ پھر ہم نہ جا سکے۔ یہ ادھورا انٹرویو ہفت روزہ ''لیل و نہار'' میں شائع ہو گیا جسے مصوری کے شائقین نے بہت پسند کیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد استادِ محترم کو مزید مالی آسودگی میسر آ گئی۔ آنے جانے کے لیے تانگہ مستقل میسر تھا۔ ان دنوں یہ معزز سواری کہلاتی تھی۔ ایک بھینس بھی پال رکھی تھی۔ اس گھوڑے اور بھینس کی دیکھ بھال کے لیے ایک ملازم بھی تھا جو گھریلو امور نپٹانے کے بعد کوچوانی کے فرائض انجام دیتا تھا۔

استادِ محترم کی کوئی اولاد نہ تھی۔ ایک دن بڑے دکھی ہو کر فرمانے لگے کہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، میں چاہتا ہوں کہ یہ مکان میں عزیز کو دے جاؤں۔ کیسے دوں یہ آپ کسی وکیل دوست سے مشورہ کر کے مجھے بتائیں۔ میں چند روز بعد اپنے ایک دوست وکیل میاں شاہنواز، جو میرے گاؤں کے تھے، کو لے کر چلا گیا تو استاد نے وکیل کے مشورے کے مطابق ایک کنال کا گھر عزیز کے نام کر دیا۔

استادِ محترم جب بھی برش لے کر بیٹھتے تو پہلے وضو کرتے، پھر ریڈیو کا وقت ہوتا تو ریڈیو لگا لیتے۔ اگر ریڈیو کا وقت نہ ہوتا تو پھر کسی شاگرد سے کہتے وہ ناول پڑھتا رہتا۔ کام کرتے کرتے وقفے سے پوچھ لیتے ہاں بتاؤ ہیرو اب کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ زیادہ تر ناول ایم اسلم کے ہوتے جو انھوں نے اکٹھے کر رکھے تھے۔ میں نے ایک آدھ بار حنیف رامے کو بھی وہاں ناول پڑھتے ہوئے دیکھا جو استادِ محترم کے نمایاں شاگردوں میں سے تھے۔

موسیقی استادِ محترم کی کمزوری تھی۔ طبلے کی جوڑی اور ہارمونیم گھر میں رکھا رہتا تھا۔ کبھی کبھی فرصت میں دل بہلا لیتے تھے۔ ان کے ایک شاگرد کو بھی گانے کا بہت شوق تھا۔ محمود بٹ (جونیئر) ان کا نام تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بقیدِ حیات ہیں۔ وہ جب بھی آتے استاد کے فرمانے پر ہارمونیم لے کر بیٹھ جاتے، اور استادِ محترم کی پسندیدہ غزلیں سنایا کرتے۔ جہاں بھی گانے والے کے سُر تال میں فرق آتا استاد فوراً ٹوک دیتے۔ یقیناً انھیں فنِ موسیقی کی اچھی خاصی شد بد تھی۔ میرے استفسار پر ایک دن فرمانے لگے ''مجھے گانے کا بہت ہی شوق رہا ہے لیکن ڈھب کا نہ تو استاد ملا اور نہ ہی مالی حالات نے مجھے اس طرف توجہ دینے کی مہلت دی۔''

استاد پہلے کلین شیو ہوا کرتے تھے لیکن آخری عمر میں داڑھی رکھ لی تھی۔ میں نے پہلی بار ریش مبارک

کے ساتھ دیکھا تو حیرانی سے پوچھ بیٹھا۔ استاد محترم مسکراتے ہوئے اور داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے ''حیرانی اور تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ پہلے یہ داڑھی اندر تھی، اب باہر جلوہ افروز ہوئی ہے۔'' استاد محترم کی جلوہ افروزی نے بہت لطف دیا۔ ان کی درویشانہ زندگی دیکھیں تو حقیقت سامنے آجاتی ہے۔

آخری عمر میں علیل رہنے لگے تھے۔ حویلی میاں خاں میں ایک حکیم صاحب تھے (ان کا نام اس وقت ذہن میں نہیں ہے) ان کے زیر علاج رہتے تھے۔ حکیم صاحب ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد اپنے آبائی پیشے حکمت کو اپنائے ہوئے تھے۔ میں بھی کبھی کبھی علاج کے لیے ان سے رجوع کرتا رہتا تھا۔ بڑے خلیق اور مخلص انسان تھے۔

استاد محترم جب مختلف امراض میں گھر گئے تو پھر انھوں نے ڈاکٹروں کی طرف رجوع کیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ اپنے آخری سفر پر روانہ ہوگئے۔ اپنے دور کا ایک اہم مصور خاموشی سے لحد میں اتر گیا۔ بقول استاد قمر جلالوی:

دبا کے قبر میں سب چل دیئے دعا نہ سلام
ذرا سی دیر میں کیا ہو گیا زمانے کو

جنازے میں حنیف رامے اور راقم الحروف کے علاوہ مولانا سالک اور مولانا میر کی اولاد کے علاوہ محلے کے صرف چند افراد تھے۔ لاہور کی ایک کروڑ آبادی میں سے کوئی مصور، کوئی دانشور شریک نہ تھا۔

میری دعا ہے اللہ تعالیٰ اس نابغۂ روزگار مصور کو اپنی رحمتِ خاص میں جگہ دے۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

جائیں گے ہم بھی خواب کے اس شہر کی طرف
کشتی پلٹ تو آئے مسافر اُتار کے

☆☆☆

خراجِ تحسین: ڈاکٹر وحید قریشی

(عہد حاضر کے زندہ ادیب کی خدمت میں)

زندگی کی اُداس شاموں میں
کتنے طوفان ٹل گئے ہوں گے

وقت کے ساتھ ساتھ جذبوں کے
کتنے کس بل نکل گئے ہوں گے

وحید قریشی

گوشے کے اہلِ قلم

- سید محمد ابوالخیر کشفی
- ڈاکٹر انور سدید
- ممتاز مفتی
- پروفیسر اکبر حمیدی
- ڈاکٹر شمس الدین صدیقی
- روزینہ فاروق
- عمران قریشی

ڈاکٹر وحید قریشی: کوائف اور کارگزاریاں

نام: عبدالوحید قلمی نام: ڈاکٹر وحید قریشی تخلص: وحید

پیدائش: ۱۴ر فروری ۱۹۲۵ء میانوالی، پنجاب۔ آبائی مسکن: گوجرانوالہ

والد: محمد لطیف قریشی (۱۲ر دسمبر ۱۸۹۸ء تا یکم اگست ۱۹۹۱ء)

تعلیم: بی۔اے (آنرز فارسی)، ایم۔اے (فارسی)، ایم۔اے (تاریخ)، پی۔ایچ۔ڈی (فارسی)،
ڈی۔لٹ (اردو)

شادی: ۲ر مئی ۱۹۵۳ء (سعیدہ وحید)

اولاد: نورین وحید (اکلوتی بیٹی)

ملازمت: الفریڈ پٹیالہ ریسرچ اسکالر۔ شعبۂ فارسی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور یکم اکتوبر ۱۹۴۷ء تا ۳۱ر دسمبر ۱۹۴۹ء

لیکچرر تاریخ، اسلامیہ کالج، گوجرانوالہ، ۶ر فروری ۱۹۵۱ء تا ۳۱ دسمبر ۱۹۵۶ء

لیکچرر تاریخ، اسلامیہ کالج، ریلوے روڈ، لاہور۔ ۲ر جنوری ۱۹۵۷ء تا ۲۴ر اگست ۱۹۵۸ء

لیکچرر اور صدر شعبۂ فارسی، اسلامیہ کالج، سول لائنز، لاہور۔ ۲۵ر اگست ۱۹۵۸ء تا ۲۰ر دسمبر ۱۹۶۲ء

لیکچرر اردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ ۲۱ر دسمبر ۱۹۶۲ء تا ۲۰ر دسمبر ۱۹۶۶ء

ریڈر، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ ۲۱ر دسمبر ۱۹۶۶ء تا ۲۴ر اپریل ۱۹۷۵ء

غالب پروفیسر، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ ۲۵ر اپریل ۱۹۷۳ء تا ۱۳ فروری ۱۹۸۵ء

پرنسپل اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ ۱۳ر اگست ۱۹۸۰ء تا ۱۵ر اپریل ۱۹۸۳ء

صدر نشین مقتدرہ قومی زبان، کراچی/ اسلام آباد۔ ۷ر اپریل ۱۹۸۳ء تا ۴ر نومبر ۱۹۸۷ء

پروفیسر حمید نظامی چیئر، شعبۂ ابلاغیات، پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ ۲۳ر فروری ۱۹۹۱ء تا ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۲ء

ناظم، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور ۹ر ستمبر ۱۹۹۳ء تا ۱۲ر جون ۱۹۹۷ء

وزیٹنگ پروفیسر شعبۂ اردو، اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۵ر اکتوبر ۲۰۰۰ء تا ۲۵ر دسمبر ۲۰۰۲ء

ممتاز پروفیسر (تاحیات)، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور، ستمبر ۲۰۰۳ء تا حال۔

ریٹائرمنٹ: ۱۳ر فروری ۱۹۸۵ء

اسفار: چین، ہندوستان، سعودی عرب، ایران، تاجکستان، انگلستان

اقامت: ۳۱۵، ای ـ ایم ـ ای ـ کالونی، ملتان روڈ، لاہور

مطبوعہ تصنیفات:

شبلی کی حیات معاشقہ طبع اول: ۱۹۵۰ء طبع دوم: ۲۰۰۲ء
میر حسن اور ان کا زمانہ ۱۹۵۹ء (مقالہ برائے ڈی ـ لٹ اردو)
مطالعہ حالی (مجموعہ مقالات) طبع اول: ۱۹۶۱ء طبع دوم: ۱۹۶۶ء
کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ (مجموعہ مقالات) ۱۹۶۵ء
تنقیدی مطالعے (مجموعہ مقالات) ۱۹۶۷ء
نقد جاں (شعری مجموعہ) ۱۹۶۸ء
باغ و بہار ایک تجزیہ طبع اول: ۱۹۶۸ء لاہور طبع دوم: ۱۹۸۴ء لکھنؤ
Oriental Studies (مجموعہ مقالات) طبع اول: ۱۹۶۹ء طبع دوم: ۱۹۷۰ء طبع سوم: ۲۰۰۴ء
نذر غالب (مجموعہ مقالات) ۱۹۷۰ء
پاکستان کی نظریاتی بنیادیں ۱۹۷۳ء
اقبال اور پاکستانی قومیت (مجموعہ مقالات) ۱۹۷۷ء
قائد اعظم اور تحریک پاکستان (مجموعہ مقالات) ۱۹۷۷ء
Ideological Foundations of Pakistan طبع اول: ۱۹۸۲ء طبع دوم: ۱۹۸۷ء
پاکستانی قومیت کی تشکیل نو اور دوسرے مضامین ۱۹۸۴ء
الواح (شعری مجموعہ اردو/ پنجابی) ۱۹۸۴ء
اردو نثر کے میلانات (مجموعہ مقالات) ۱۹۸۶ء
ہمارا نظام تعلیم اور قومی زبان ۱۹۸۷ء
مقالات تحقیق (مجموعہ مقالات) ۱۹۸۸ء
جدیدیت کی تلاش میں (مجموعہ مقالات) ۱۹۹۰ء
افسانوی ادب (مجموعہ مقالات) ۱۹۹۳ء طبع دوم: ۲۰۰۳ء
اساسیات اقبال (مجموعہ مقالات) ۱۹۹۶ء طبع دوم: ۲۰۰۳ء
مطالعہ ادبیات فارسی (مجموعہ مقالات) ۱۹۹۶ء

پاکستان کے تعلیمی مسائل (وی۔ پی۔ ایس، اسلام آباد)
اردو ادب کا ارتقا۔ ایک جائزہ ۲۰۰۶ء

غیر مطبوعہ تصانیف:

Insha Literature in Persian-A critical study مقالہ برائے پی ایچ ڈی
ڈھلتی عمر کے نوحے (شعری مجموعہ)

مختلف موضوعات پر ایک سو سے زائد مقالات ایسے ہیں جو ان کی کسی کتاب میں شامل نہیں۔ اس طرح ستر سے زائد تحریریں دیباچوں، تعارف ناموں، مقدموں اور تبصروں کی صورت میں موجود ہیں جبکہ انٹرویو، تراجم، روزنامہ ''جنگ'' اور ''پاکستان'' لاہور میں لکھے گئے کالموں اور زیرادارت رسائل کے لیے لکھے جانے والے اداریوں کی تعداد الگ ہے۔

ترتیب و تدوین:

اردو کا بہترین انشائی ادب۔ رجب علی بیگ سرور سے دورِ حاضر تک
ارمغانِ ایران
ارمغانِ لاہور
۱۹۶۵ء کے بہترین مقالے
پنجاب میں اردو از حافظ محمود شیرانی
تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاک و ہند جلد ششم (اردو ادب جلد اول)
توضیحی کتابیات ابلاغیات (باشتراک سید جمیل احمد رضوی)
ثواقب المناقب از محمد ماہ صداقت کنجاہی
دربارِ ملی
دیوانِ آتش
دیوان جہاں دار از مرزا جوان بخت جہاں دار شاہ
دیوانِ سودا
'صحیفہ' لاہور غالب نمبر (حصہ اول پنجم)
علامہ اقبال کی تاریخِ ولادت (باشتراک زاہد منیر عامر)
عمل صالح الموسوم بہ شاہجہان نامہ (تین جلدیں) از محمد صالح کنبوہ

مثنویات حسن (جلد اول)

مثنوی چندر بدن مہیار از قادر بخش وزیر آبادی

مثنوی سحر البیان

مقدمہ شعر و شاعری

منتخب مقالات اقبال ریویو

نامہ عشق از اندرجیت منشی

ہمیشہ بہار (تذکرہ شعرائے فارسی) از کشن چند اخلاص

یارنامہ (سی حرفیاں) از عبدی قیصر شاہی

یونیورسٹی اورینٹل کالج کے اساتذہ کا تحقیقی، ادبی اور درسی سرمایہ

یونیورسٹی اورینٹل کالج کے ریسرچ اسکالروں اور اساتذہ کی سنین وار فہرست۔

ادارتی خدمات:

''مجلہ علمی''، لاہور، ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان۔۱۹۶۴ء

''صحیفہ'' لاہور مجلس ترقی ادب۔۱۹۶۲ء تا ۱۹۷۴ء

''مجلہ تحقیق'' لاہور۔ جامعہ پنجاب۔ ۱۹۷۷ء تا ۱۹۸۲ء

''اورینٹل کالج میگزین'' لاہور۔۱۹۸۰ء تا ۱۹۸۳ء

اقبال ریویو (اردو، انگریزی، فارسی) لاہور۔۱۹۸۲ء تا ۱۹۸۳ء، ۱۹۹۴ء تا ۱۹۹۷ء

''اخبار اردو'' اسلام آباد۔۱۹۸۳ء تا ۱۹۸۷ء

''اقبال'' لاہور۔۱۹۸۸ء تا ۱۹۹۴ء

''مخزن'' لاہور۔۲۰۰۱ء تا حال۔

اعزازات:

نیاز فتح پوری میڈل۔۱۹۸۴ء

طفیل ایوارڈ۔۱۹۸۶ء

ہمدرد وثیقہ اعزاز

صدارتی تمغہ حسن کارکردگی، حکومت پاکستان۔۱۹۹۴ء

اقبال ایوارڈ، حکومت پاکستان۔۲۰۰۳ء

(ان کی ادبی کارگزاریوں کی یہ مختصر تفصیل ہماری ضرورت کے مطابق ہے۔ ادارہ)

کلماتِ سپاس وانحراف ــــ ڈاکٹر وحید قریشی کی خدمت میں

سیّد محمد ابوالخیر کشفی

ڈاکٹر وحید قریشی کثیر الجہات آدمی اور ادیب ہیں۔ بنیادی طور پر انھیں ایک ادبی محقق کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے۔ انھوں نے تحقیق کے میدان میں اہم نقوش قائم کیے۔ وہ ایک اچھے نقاد بھی ہیں۔ ادبی کتابوں کی تدوین اور ترتیب کو بدقسمتی سے اردو کی ادبی دنیا میں اہمیت نہیں دی جاتی، لیکن یہ ایک بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ وحید قریشی نے اس میدان میں بھی اپنی نظر اور تنقیدی شعور کا ثبوت دیا ہے۔ وہ پاکستانیات کے بھی عالم ہیں۔ پاکستان کی تاریخ اور مسائل پر انھوں نے اچھے مطالعے پیش کیے۔ قریشی صاحب ایک خوش گو شاعر بھی ہیں۔ اپنی علالت کو انھوں نے بے کاری کا وقفہ نہیں بننے دیا، بلکہ اپنے تاثرات کو شعر کے قالب میں ڈھالتے رہے۔ اردو کے علاوہ وہ فارسی زبان وادب پر گہری نظر رکھتے ہیں اور ان کی تحریریں اس پر شاہد ہیں۔

ان کی ادبی تدوین وترتیب میں ان کی کتاب ''اردو کا بہترین انشائی ادب'' میری رائے میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ہمارے عہد میں اہلِ قلم کے ایک گروہ نے انشائیہ کو اس عہد کی صنف قرار دیا ہے، بلکہ ان کے ادعا کے مطابق اس صنفِ ادب نے ان کی کاوشوں سے جنم لیا ہے۔ یہ ایک انتہا پسندانہ نقطۂ نظر ہے۔ جریدوں، مقالوں اور ادبی وتاریخی مطالعوں کے علاوہ وہ مضامین ہماری زبان میں مدت سے موجود ہیں جن کا مقصد قاری کو ادبی مسرت عطا کرنا ہے۔ ایسے ہی مضامین کو عہدِ حاضر میں انشائیہ کا نام دیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے بڑی ژرف نگاہی سے اردو ادب میں ایسی تحریروں کا مطالعہ کیا ہے۔ انشائیہ میں انسانی تخیل کو بڑی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ اس کی ترتیب منطق کی نہیں بلکہ مشاہدے اور ادبی ذوق کے طابع ہوتی ہے۔ ایک ڈھیلی ڈھالی ترتیب ہی انشائیے کی روح ہے۔ وحید قریشی نے رجب علی بیگ سرور، عبدالغفور شہباز کی تحریروں میں انشائیہ کے عناصر تلاش کیے ہیں۔ سرسید کے عہد سے انشائیہ ایک مستقل صنف کی حیثیت سے نظر آتا ہے۔ ''بحث وتکرار''، ''امید کی خوشی''، ''گزرا ہوا زمانہ'' جیسی تحریریں انشائیہ کے نمونے ہیں۔ محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی، عبدالحلیم شرر، ان سب کے ہاں انشائیہ کا جذبہ نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ صاحب طرز ادیب نظر آتے ہیں جنھوں نے ڈاکٹر وحید قریشی کے خیال کے مطابق جدید انشائیہ ادب کے ابتدائی دور کی تخلیق کی، اس میں بہت سے اہل قلم شامل ہیں۔ ناصر نذیر فراق، ہوش بلگرامی، مولوی عزیز مرزا، سید احمد دہلوی، باقر علی داستان گو، راشد الخیری، ان ہی اہل قلم کے

مابعد وہ ادیب نظر آتے ہیں جو آج بھی انشائیہ کے باب میں اہمیت رکھتے ہیں۔ فرحت اللہ بیگ، خواجہ حسن نظامی، سجاد حیدر یلدرم، سجاد انصاری، رشید احمد صدیقی، خلیقی دہلوی وغیرہ۔ وحید قریشی نے ان سب اکابرین کی تحریریں اپنی تالیف ''اردو کا بہترین انشائی ادب'' میں جمع کر دی ہیں، ورنہ ان میں سے بہت سوں کو آج کا قاری تو درکنار، نقاد بھی بھول چکے ہیں۔ سجاد انصاری کی شگفتہ بیانی کے اعتراف کے بغیر اردو کی نثری تاریخ مکمل نہیں ہوتی۔ اس ضمن میں وحید قریشی، مہدی الافادی کو بھول گئے۔ ایسی فروگذاشتیں بڑے کاموں کے سلسلے میں ہو جاتی ہیں۔ لیکن ان کی اس تالیف کے طفیل کئی نام محفوظ ہو گئے ہیں۔ ایسے اہل قلم کے نام جو مختلف ادوار میں اہمیت رکھتے تھے اور جنھوں نے انشائیہ کی صنف کو روح دار بنانے میں حصہ لیا۔ مثلاً خاتون اکرم، میاں بشیر احمد، سلطان احمد وجودی، محمود رضویہ۔ وحید قریشی صاحب کے اس انتخاب میں سید امجد حسین، داؤد رہبر، وزیر آغا، انتظار حسین، مشکور حسین یاد اور مشتاق احمد یوسفی بھی شامل ہیں۔ میرے نزدیک ''اردو کا بہترین انشائی ادب'' ادبی انتخاب میں سمت نمائی کا درجہ رکھتا ہے۔

حالی کے ''مقدمہ شعر و شاعری'' کو اردو تنقید کا عہد نامۂ جدید قرار دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اس اہم کتاب کو اس طرح مرتب کیا ہے کہ یہ اپنا معیار آپ بن گئی ہے۔ مقدمہ شعر و شاعری ان کی تنقید اور تحقیق سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب انگریزی تنقید اور اس کی تاریخ سے بخوبی آگاہ ہیں۔ ان کا یہ خیال بھی درست ہے کہ ''حیات سعدی (۱۸۸۱ء) میں شاعری کے بارے میں حالی نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ۱۸۹۳ء میں 'مقدمہ شعر و شاعری' میں مکمل شکل میں نظر آتے ہیں۔''

وحید قریشی صاحب نے بعض موضوعات پر تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ میر حسن اور ان کے عہد پر ان کا کام کلاسیکی اہمیت حاصل کر چکا ہے۔ وحید قریشی صاحب کے ''مقالات تحقیق'' میں ''مثنوی کدم راؤ پدم راؤ''، ''دیوان شوقی''۔ ''سحر البیان'' پر اچھے مضامین موجود ہیں۔ بعض کتابوں پر بھی مضامین شامل ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ وحید قریشی جیسا محقق بھی شخصی تعصبات سے دامن نہ بچا سکے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب کے سلسلے میں ان کا لہجہ اکثر نازیبا ہو جاتا ہے اور شخصی تعصب چھپائے نہیں چھپتا۔

وحید قریشی صاحب نے پاکستان اور اسلام سے متعلق جو مضامین تحریر کیے ہیں ان میں علم کے ساتھ ساتھ تفہیم اور خلوص کے عناصر پوری طرح موجود ہیں۔ وہ اس دولت بیدار کو اگلی نسل تک منتقل کر دینا چاہتے ہیں۔

جو کچھ عرض کیا گیا وہ قریشی صاحب کے عالمانہ مرتبے کے ساتھ انصاف نہیں کرتا۔ وہ ہمارے عہد کی تحقیق اور تنقید کے اہم نقش گر ہیں۔ ''گوشۂ وحید قریشی'' میں شامل ہونا میرے لیے خوشی کی بات ہے اور ان کی اہمیت کا اعتراف دیانت داری کا تقاضہ ہے کاش میرے پاس ان کی کتابیں ہوتیں تو میں تفصیل سے کچھ عرض کرتا۔ ان سطور کو ادائے فرض سمجھیے۔

☆☆☆

ڈاکٹر وحید قریشی کی نفسیاتی تنقید

ڈاکٹر انور سدید

ایک طویل عرصے تک ڈاکٹر وحید قریشی کی تنقید کو بت شکنی کا عمل قرار دیا جاتا رہا ہے اور یہ بات کچھ غلط بھی نہیں تھی کہ انھوں نے جو تنقید نگاری کا آغاز کیا تو اس سفر کے پہلے قدم پر ہی شبلی نعمانی جیسے قد آور ادیب کے ذہنی محرکات کی تلاش شروع کر دی اور اس سیاحت میں ڈاکٹر وحید قریشی داخل کے نادریافت جزیروں میں بہت دور تک بلا رکاوٹ نکل گئے۔

ڈاکٹر وحید قریشی کے پیش نظر یہ بات تھی کہ فن شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے اور ظاہری الفاظ اور پیش پا افتادہ معانی کے پردے میں حقیقی معنی اور اس معنی کا پس منظر پوشیدہ ہوتا ہے اور کلیہ ہاتھ آ جائے تو ایسے تمام شخصی اور اجتماعی محرکات تک رسائی ممکن ہوتی ہے جو انسان کے لاشعور میں نیم مدہوش حالت میں پڑے رہتے ہیں لیکن کسی خود فراموشی کے لمحے میں ایک زقند لگا کر تخلیق میں شامل بھی ہو جاتے ہیں۔ بلاشبہ یہ عمل شعوری ہے لیکن ادبی تخلیق کا بہت سا حسن اس لاشعوری عمل میں ہی پنہاں ہے۔ اہل نظر اس پارۂ فن کے جمالیاتی زاویوں کو سراہتے ہیں لیکن نفسیات کا علم رکھنے والے نقاد انھیں وسیلوں سے تخلیق کار کی شخصیت کے داخلی محرکات اور پوشیدہ گوشوں تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی ہمارے ان اوّلین نقادوں میں سے ہیں جنھوں نے جدید نفسیات کو ادب میں کامیابی سے استعمال کیا اور بعض ادبی عقائد کی منہاجی تبدیلی کر دی۔ ان کا مقالہ 'شبلی کی حیات معاشقہ' ادبی دنیا میں ایک ایٹم بم کی طرح گرا اور بحث و نظر کا طغیان پیدا کر دیا۔ لیکن اب جب کہ پل کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہے اور فرائیڈ کے نظریات پر نئے نظریات نے سبقت حاصل کر لی ہے تو ڈاکٹر صاحب کے متذکرہ بالا معرکہ آرا مقالے کے بارے میں بھی آرا کی نوعیت تبدیل ہو گئی ہے۔ ابتدا میں اس مقالے کو شبلی کی ذات پر ایک خوفناک حملہ شمار کیا گیا تھا لیکن اب یہ حقیقت متعدد بار تسلیم کی گئی ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی نے شبلی کو ایک صحت مند انسان کی نظر سے دیکھا اور ان کے ہاں ایک فطری انسان کے جنسی رد عمل کی نشاندہی کی۔ چنانچہ ریاض احمد نے لکھا:

"شبلی کی حیات معاشقہ میں اگرچہ تحلیل نفسی کے اعتبار سے کوئی خاص رجحان مولانا شبلی کے ہاں تلاش نہیں کیا گیا لیکن ایک معمولی اور صحت مند جنسی رد عمل کو جس طرح اس مقالے میں اجاگر کیا گیا

ہے وہ نفسیاتی سوجھ بوجھ کی مثال ہے۔"

ہمارے ہاں تنقید میں نفسیات کو استعمال کرنے کی ایک رسم سلیم پڑ چکی ہے۔ کہ پہلے فرائیڈ کے نظریات کو اپنی خام صورت میں پیش کر دیا جاتا ہے اور بعد میں شخصیت اور فن پارے کی تفہیم میں فرائیڈ کے نقوش پا کو بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ بعض ناقدین نے نفسیات کی چند مقبول عام اصطلاحات سے اپنی سنکیت کو تسکین دیتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی کی نفسیاتی تنقید میں نفسیات عقبی دیار کی شخصیت رکھتا ہے۔ انھوں نے فرائیڈ کو حوالہ بنائے بغیر شخصیت اور فن پارے کی تفہیم کی کاوش کی ہے۔ چنانچہ ان کے ہاں علامتوں اور استعاروں کی تجزیہ کاری کا عمل چنداں مرعوب خاطر عمل نہیں تھا۔ انھوں نے نفسیات کو اپنا ذہن وسیع کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔

چنانچہ ایک عام انسان تو حقیقت کی صرف ایک سطح پر ہی رسائی حاصل کر سکتا ہے اور یہ ظاہر کی سطح ہے لیکن ڈاکٹر صاحب نے نفسیاتی ذہن کی معاونت سے داخل کے جزیروں کی سیاحت بھی کی ہے اور ایک کشادہ نقطۂ نظر کو بروئے کار لا کر نئے نتائج بھی دریافت کیے ہیں۔

اس ضمن میں اہم بات یہ بھی ہے کہ انھوں نے صرف فرائیڈ اور ایڈلر کے نظریات سے ہی استفادہ نہیں کیا بلکہ انھوں نے معنوی طور پر ژنگ کے نظریات کو بھی اپنے فکر کے عقبی دیار میں جاگزیں ہونے کی اجازت دی ہے۔ چنانچہ جب وہ ادب اور تاریخ کے مختلف ادوار کا تجزیہ کرتے اور اصناف ادب کی داخلی ماہیت کو منکشف کرتے ہیں تو ان کے اجتماعی لاشعور کا عمل دخل نمایاں نظر آتا ہے۔ عہد سرسید کا تجزیہ اردو میں مزاح نگاری کی اہمیت کا یقین کرنے، پاکستانی قومیت، تشکیل نو، پنجابی اردو کے لسانی اور تہذیبی رابطے اور پاکستان میں اردو ادب، فنون لطیفہ اور اسلام جیسے مضامین میں بھی انھوں نے ملک، قوم، ادب کی اور ادیب کے اجتماعی شعور سے ربط قائم کیا ہے اور ایسے نتائج دریافت کیے جن میں ماضی کی دھڑکن بھی موجود تھی اور حال کا آہنگ بھی سنائی دیتا ہے۔ ان کا یہ طریقہ اتنا غیر روایتی ہے اور یوں نظر آتا ہے کہ نفسیات سے کوئی استفادہ نہیں کیا ہے۔ لیکن درحقیقت نفسیات کا تمام تر اثر اور رد عمل ان کی تنقید میں معلوم ہوتا ہے۔

مجھے یہ بات کہنے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ بعض لوگوں نے اب یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ وحید قریشی کے ہاں نفسیات کا استعمال ابتدائی دور تک محدود ہے اور شبلی پر معرکہ آرا مضمون کے بعد انھوں نے اس علم سے استفادہ ترک کر دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی نفسیات کی جدید تحقیق سے اب بھی استفادہ کر رہے ہیں لیکن اس علم سے صرف شخصی یا اجتماعی محرکات تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نفسیات ہمیں نیچے تک پہنچنے کا راستہ دکھاتی ہے لیکن ادبی فیصلے میں انھوں نے اپنے ذوق جمال کو ہی رہنما بنایا اور نقاد کے بنیادی کردار کو نفسیات میں گم نہیں ہونے دیا۔ ان کی یہ عطا بے حد اہم ہے۔

☆☆☆

خاکہ

صاحبِ صدر ڈاکٹر وحید قریشی

ممتاز مفتی

ڈاکٹر وحید قریشی نئے نئے اسلام آباد آئے تو میں نے ان کے ایک دوست سے پوچھا کہ یہ ڈاکٹر وحید قریشی کیا چیز ہے۔

وہ مسکرایا، کہنے لگا، ''مفتی! ڈاکٹر وحید قریشی دیکھنے کی چیز نہیں، برتنے کی چیز ہے۔''

میں نے کہا، ''بھئی یہ بھی بتا دو کہ اسے کیسے برتتے ہیں۔''

بولا، ''اسے ادبی محفلوں میں دور سے نہ دیکھو۔ پاس بٹھاؤ۔ گپ شپ کرو۔ اسکینڈل سناؤ پھر دیکھو۔''

ذرا ڈاکٹر کی جانب دیکھیے۔ معززیت کا ایک ڈھیر لگا ہے۔ گھبرائیے نہیں یہ صرف باہر کی بات ہے۔ اندر جھانکو تو ایک معصوم بچہ رنگین بنٹے کھیل رہا ہوگا۔ بات کرتے ہوئے سنو تو معقولیت ہی معقولیت تانتا بندھ جائے گا۔ اندر کان لگاؤ تو تاریں لگی ہیں۔ سولہ سال کی ایک دوشیزہ گنگنا رہی ہے۔ الھڑ جذبات، کومل آواز، مدھر گیت، بے برجستہ سریں۔ ساتھ خالص لاہوری بھاماما جھا سنگت کر رہا ہے۔ دھن دھا گے تن تا گے۔

صاحبو! ڈاکٹر وحید قریشی پانی سمان ہے۔ صراحی میں ڈالو تو صراحی بن جائے گا، مٹی کے پیالے میں ڈال لو تو پیالہ بن جائے گا۔ اسلام آباد پنڈی کی علمی ادبی محفلوں میں، میں نے اسے مرصع صراحی بنے ہوئے بھی دیکھا ہے اور جامِ سفال بھی۔ پھر ڈاکٹر وحید قریشی کی نگاہ میں، میں ایک ایسی چمک بھی دیکھتا ہوں جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ آنکھوں میں رنگ پچکاری چھپائے بیٹھا ہے۔ اب کوئی گوپی زبان کھولے تو راز کھلے۔

ایک ڈاکٹر وحید کی ہی بات نہیں۔ یونیورسٹیوں میں جتنے سینئر پروفیسر ہوتے ہیں سب پچکاری کے دولہے ہوتے ہیں۔ اور کیوں نہ ہوں۔ جنھیں ہر وقت پچاس ساٹھ نوجوان آنکھوں کے جوڑے تحسین و احترام کی پنکھیاں جھلاتے رہیں، بھلا کیسے ہو سکتا ہے کہ ان کی آنکھوں میں رنگ پچکاریاں نہ ہوں۔

ڈاکٹر وحید قریشی کو صدر بنا دو تو سولہ آنے صدر بن جائے گا۔ پہلے تولے گا پھر منہ سے بولے گا۔ حاضرین میں آخری بنچ پر بٹھا دو تو ہوٹ کرنے سے نہیں جھجکے گا۔ بحث میں لگا دو تو عالمانہ موشگافیاں نکالے گا یوں جیسے علم ہی اوڑھنا بچھونا ہو۔ چار یاری میں بٹھا دو تو یوں باؤنڈریاں مارے گا جیسے بوجھ سے عاری ہو۔

ڈاکٹر وحید قریشی جب نیا نیا اسلام آباد آیا تھا تو ہم ڈر گئے تھے۔ ڈرنا تو تھا ہی جب اس جثے کا نقاد

میدان میں اتر آئے تو میرے جیسے منشی لوگ دوڑ کر اپنے اپنے بلوں میں جا گھستے ہیں۔ لیکن یہ خوف کا سم چند روز ہی رہا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے آتے ہی ہم پر ایک بہت بڑا احسان کیا۔ چنڈی اسلام آباد کے ادبی حلقوں کی سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ ادبی محفلوں میں صدر کسے بنایا جائے۔ اس نے یہ مشکل مستقل طور پر حل کر دی۔ پھر پریشان خٹک کی آمد پر مہمان خصوصی کا مسئلہ بھی احسن طور پر حل ہو گیا۔

پرانے زمانے میں ایک کہاوت تھی ان تینوں سے بچ کر رہیو، کالے، چھوٹے، موٹے سے۔ آج کل اس کہاوت میں ترمیم ہو گئی ہے، کہتے ہیں ان تینوں سے بچ کر رہیو، عالم، عاقل، ناقد سے۔

عالم کے متعلق سیانے کہتے ہیں Masters are Monsters۔ پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے مگر ایسا ہوتا ہے کہ جوں جوں آپ عالم بنتے جاتے ہیں توں توں آپ کی میں میں پھونک بھرتی جاتی ہے۔ اول تو عالم اکٹھے بیٹھتے ہی نہیں۔ جہاں اکٹھے بیٹھیں میں میں کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ رہے عاقل تو وہ خود تو اپنی زندگی جذبے کے زور پر گزارتے ہیں۔ دوسرا بات کرے تو عقل کا چھنکنا چھنکانے لگتے ہیں۔ ناقد آڈیٹر کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کی انگلی آپ ہی آپ غلطی پر جا رکتی ہے۔

پھر وہ بات:

ع نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے

ہم عام بندے تو اس بات کے خواہاں ہیں کہ کوئی غم دل سننے والا ہو۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے یہ بھید پا لیا ہے کہ علم اور عقل بوقت ضرورت استعمال کرنے کی چیزیں ہیں، خود پر طاری کرنے کی نہیں۔ ڈاکٹر نے علم اور عقل کو خود پر طاری نہیں ہونے دیا۔ طاری کر لیتا تو راون بن جاتا۔

نہیں کیا تو رام بن گیا ہے۔

علم اور عقل کو استعمال کر کے پھر پوٹلی میں باندھ کر الماری میں رکھ دیتا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی بنیادی طور پر ایک کامی ہے۔ اتنی بوجھل ڈگری، اتنا اونچا گریڈ اور مسند نشیں ڈزگنیشن (Designation) کے باوجود ذات کا کامی ہے۔ وہ اردو قومی زبان کا ڈھنڈورا پیٹے جا رہا ہے، پیٹے جا رہا ہے۔ یوں پیٹے جا رہا ہے جیسے سننے والے سن رہے ہوں۔

سننے والے نہیں سن رہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کا مقصد خود سننا نہیں عوام کو سنانا ہے کہ انھیں تسلی رہے کہ کام ہو رہا ہے۔

تقسیم کے بعد جب مجید ملک کو لاہور اردو بورڈ کا ڈائرکٹر بنایا گیا تو میں نے کہا "لو بھئی اب تو موج ہو گئی۔" کہنے لگا "کیوں؟" میں نے کہا "اطمینان سے اردو نافذ کرو۔" وہ ہنسا، بولا "مفتی! تو نہیں سمجھے گا۔ تو سیاست میں کورا ہے۔ یہ بورڈ اس لیے نہیں بنایا گیا کہ اردو نافذ کرے بلکہ اس لیے کہ اردو کے نفاذ میں التوا پیدا

کرے، لوگوں کو تسلی دے کہ کام ہو رہا ہے۔ مقصد کام کرنا نہیں تسلی دینا ہے۔''

سرکار بھی کیا شے ہے۔ کچھ محکمے اس لیے بناتی ہے کہ کام ہو اور کچھ اس لیے کہ کام ہوتا نظر آئے لیکن ہو نہیں۔ کچھ اہلکاروں کو چھوٹے گریڈ دے کر ہاتھ میں ہنٹر پکڑا دیتی ہے کچھ لوگوں کو صدر نشین بنا کر ہاتھ میں جھنجھنا تھما دیتی ہے۔ اللہ کے فضل سے اس وقت ہمارے ہاں دو صدر نشیں بیٹھے ہیں۔ ایک اردو زبان کا، دوسرا اردو اکادمی کا۔

صرف ڈاکٹر وحید قریشی ہی نہیں اب تو عوام بھی جانتے ہیں کہ سیاسی مصلحت کی وجہ سے اردو زبان ابھی تک پاکستان میں سرکاری طور پر رائج نہیں ہو سکتی۔

لیکن اس وجہ سے کیا نتائج پیدا ہو رہے ہیں اس کے بارے میں کسی نے نہیں سوچا۔ میں ان تمام اداروں کی خدمت میں اپیل کرتا ہوں، جو نفاذ اردو کے لیے کام کر رہے ہیں کہ صاحبو! مجھ پر ترس کھاؤ میں وہ بدقسمت فرد ہوں جس کی کوئی پہچان نہیں۔

میں انگریزی میں سوچتا ہوں۔ اردو لکھتا ہوں۔ پنجابی بولتا ہوں۔
میں پنجابی پڑھ نہیں سکتا۔ اردو بول نہیں سکتا۔ انگریزی لکھ نہیں سکتا۔
گھر میں پنجابی بولتا ہوں۔ میری بیٹیاں اردو بولتی ہیں۔ میرے پوتے انگریزی بولتے ہیں۔
سبحان اللہ کیا کھچڑی پک رہی ہے میرے گھر میں۔
کسی مسخرے نے میرے گھر کو تماشا بنا دیا ہے۔

بیٹیوں سے پوچھتا ہوں کہ بی بی تم اردو کیوں بولتی ہو۔ ہماری ماں بولی تو پنجابی ہے۔ وہ جواب دیتی ہیں، ''ابو ہر جگہ اردو بولی جا رہی ہے۔ اسکولوں میں، کالجوں میں، دفتروں میں، بازاروں میں، محفلوں میں۔''

پوتوں سے پوچھتا ہوں کہ میاں تم گھر میں انگریزی کیوں بولتے ہو۔ وہ جواب دیتے ہیں کہ ہمیں اے لیول پاس کر کے بڑا افسر بننا ہے۔ کیوں نہ بولیں انگریزی۔

میرے پوتے دوڑے دوڑے میرے پاس آتے ہیں پوچھتے ہیں بابا، چوہتر کا کیا مطلب ہے۔ میں کہتا ہوں سیونٹی فور اور وہ چوہتر کے معنی سمجھ کر خوش خوش چلے جاتے ہیں۔

میں سوچتا ہوں کہ جب وہ بڑے افسر بنیں گے تو کب چاہیں گے کہ اردو نافذ ہو جائے۔ نافذ ہو گئی تو وہ کس سے پوچھیں گے کہ چوہتر کا کیا مطلب ہے۔ وہ خوف زدہ ہیں کہ انھیں چوہتر کا مطلب اپنے پی اے سے پوچھنا نہ پڑے۔

یہ کالا صاحب فرنگی بہادر کا تحفہ ہے۔ جو برصغیر سے وداع ہوتے وقت اس نے ہمیں بخشا تھا۔

صاحبو! جب فرنگی بہادر رخصت ہوا تھا اس وقت لاہور میں صرف تین انگلش اسکول تھے۔ اب تین

ہزار سے زائد ہیں۔

اکثر وحید قریشی صاحب سے میں پوچھتا ہوں آپ کس امید پر کتابوں پر کتابیں لکھے جا رہے ہیں۔ کیوں اپنی جان عذاب میں ڈال رکھی ہے۔ اپنا تخلیقی کام تیاگ رکھا ہے۔ اپنی راہ کھوٹی کر رکھی ہے۔

کالا صاحب بہت سیانا ہے۔ کائیاں ہے۔ اس نے اپنے تحفظ کے لیے قومی زبان کو سیاسی مسئلہ بنا دیا ہے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ اور اب حکومتیں چاہے فوجی ہوں یا جمہوری اس مسئلے سے خوف زدہ ہیں۔ بے چاری حکومتیں، مجھے ان پر ترس آتا ہے۔

آج کل اسلام آباد میں اردو کی ادبی محفلوں پر بہار آئی ہے۔ آئے دن فائیو اسٹار ہوٹلوں میں محفلیں جمتی ہیں جن کی صدارت ڈاکٹر وحید قریشی کرتے ہیں اور بڑے بڑے وزیر مہمان خصوصی کی حیثیت سے ان محفلوں میں زینت افروز ہوتے ہیں اور بڑے خلوص اور جذبے سے اردو ادب سے اظہار عقیدت کرتے ہیں۔

اور میرے ادبی ساتھیو آپ، میں، ہم سب مکھ پر سہرے سجائے ڈائس پر کھڑے ہو کر بڑی ٹمن سے اپنے اپنے مضامین پڑھتے ہیں۔ آپ تالیاں بجاتے ہیں۔ اس وقت میرے اندر سے ایک آواز ابھرتی ہے۔ یہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ میرا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ یہ ہم کیا سن رہے ہیں۔ ہماری زبان تو سکریٹریٹ سے باہر دھتکاری ہوئی، پھٹکاری ہوئی، شرمندگی کی ماری، منھ چھپائے کھڑی ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی سا ہمت اور حوصلہ میں نے بہت کم اشخاص میں دیکھا ہے۔ ان کے گرد بہت سے حریفوں نے گھیرا ڈال رکھا ہے۔ لیکن ڈاکٹر نے حوصلہ نہیں ہارا۔ وہ حریفوں سے چومکھیہ لڑائی لڑ رہے ہیں۔

حریف ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکے۔

اونچا گریڈ ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکا

صدر نشینی ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکی

علم و فضل دم دبائے بیٹھے ہیں۔

بڑھاپا اور اس کی جملہ بیماریاں ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکے۔

لائف سیونگ ڈرگز کا مسلسل استعمال ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکا۔

روزمرہ کی ادبی محفلوں کی صدارت ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکی۔ الٹا انھوں نے صدارت میں بڑا نام پایا ہے۔ لوگ انھیں سولہ آنے صدر کہتے ہیں۔

اس لیے کہ ڈاکٹر وحید قریشی میں زندگی کے لیے بے پناہ ''اودھ'' ہے اور زندگی سے محظوظ ہونے کی بے پناہ صلاحیت ہے کہ فروعی رکاوٹیں ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتیں۔

میں اکثر ڈاکٹر سے کہا کرتا ہوں۔ ڈاکٹر چھوڑ اب نقد و نظر کو بہت ہو لیا۔ کوئی تخلیقی کام بھی کر لے۔

جواب میں وہ ہنس کر کہتا ہے کہ وہ بھی حاضر ہے۔
ملاحظہ ہو:

ریچھوں کے ساتھی شیر اور ہاتھی
دفتر میں بیٹھے گپ کر رہے تھے
اور سوچتے تھے محفوظ گھر ہے
اور گھر کے باہر فوجوں کے افسر
کرتے ہیں پل پل رتے مسلسل
بھوتوں کا جنگل، جنگل میں منگل
منگل منائیں اور گیت گائیں
بستی کے لوگو بستی کے لوگو

☆☆☆

ادب کا مردِ آہن ۔ ڈاکٹر وحید قریشی

پروفیسر اکبر حمیدی

پروفیسر ڈاکٹر وحید قریشی سے میری دو طویل ملاقاتیں ہوئیں۔ ہر ملاقات تین چار برسوں پر محیط ہے۔ دونوں ملاقاتوں میں وہ مجھے ایک جیسے دکھائی دیئے۔ صحت مندی کے اعتبار سے بھی اور عادات وخصائل کے اعتبار سے بھی۔ معلوم ہوتا ہے وہ خود بہت کم تبدیل ہوئے۔ زیادہ زور دوسروں کو تبدیل کرنے پر صرف کرتے رہے۔ ان کے رزم حق وباطل کی بنیاد ان کے ایسے ہی مزاج پر استوار ہے۔

ڈاکٹر صاحب ۱۹۲۵ء میں گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد صاحب بھی اپنے باپ کے اکلوتے بیٹے تھے اور خود ڈاکٹر صاحب بھی والدین کے اکلوتے بیٹے ہیں۔ اکلوتا بیٹا ہمارے ماحول میں کس انداز سے تربیت پاتا ہے اور کیا مزاج لے کر جوان ہوتا ہے یہ دونوں سوال جواب کے محتاج نہیں ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ ڈاکٹر صاحب کے دادا بھی پولیس افسر تھے اور والد بھی پولیس افسر۔ سو اندازہ ہوتا ہے کہ ”گلیاں ہو جان سنجیاں وچ مرزا یار پھرے“ کے سے ماحول میں ڈاکٹر صاحب نے بچپن اور عہد جوانی گزارا۔ ظاہر ہے ایسے ماحول میں پرورش پانے والا بچہ نہ صرف خود بے پناہ احساس برتری کا مالک ہوتا ہے بلکہ دوسروں کو احساس کمتری میں مبتلا کر دینے کا خواہش مند بھی ہو سکتا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب بھی دراصل پولیس ہی کے آدمی تھے بس راستہ چھوڑ کر تعلیم میں آ نکلے۔ یہ دونوں رجحانات ایسے ہیں جنھوں نے آگے چل کر ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے میدانوں کا تعین کیا۔ غیر معمولی خود اعتمادی کے ذریعے انھوں نے تعلیم کی اعلیٰ ترین ڈگریاں حاصل کیں۔ اور اسی خود اعتمادی کے دوسرے اظہارات کے ذریعے انھوں نے زندگی بھر حریفوں سے زبردست پنجہ آزمائی جاری رکھی۔ وہ حریفوں کے خلاف تھانے میں رپٹ لکھوانے کے قائل نہیں بلکہ انھیں سر میدان للکارنے کے قائل ہیں۔

انھوں نے ہسٹری اور فارسی میں ایم۔ اے کیے۔ پی ایچ ڈی فارسی ادبیات میں اور ڈی۔ لٹ اردو ادبیات میں۔ ان رنگارنگ ڈگریوں سے ڈاکٹر صاحب کی محنت اور جگر کاری کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے۔

میں جب اسلامیہ کالج گوجرانوالہ میں داخل ہوا اس وقت ڈاکٹر صاحب یہاں ہسٹری کے پروفیسر تھے۔ ان کے ہم عصروں میں پرنسپل ملک احمد حسن تھے جو شیکسپیئر کے اسکالر تھے۔ ہمیں شیکسپیئر کا ڈرامہ پڑھاتے

تھے۔ پڑھاتے کیا تھے ڈراما اسٹیج کر دیتے تھے۔ دوسرے قابلِ ذکر ہم عصر مظفر علی سید صاحب تھے جو ہمیں انگریزی نثر پڑھاتے تھے۔ کلاس میں کھڑے ہو کر پڑھاتے۔ دائیں ہاتھ میں کتاب اور بائیں ہاتھ میں پہلی دونوں انگلیوں میں جلتی ہوئی سگریٹ۔ کش لگاتے، کھانستے اور پڑھاتے جاتے۔ صوفی محبوب الٰہی صاحب انگریزی شاعری پڑھاتے۔ ایک اسٹینزا پڑھتے اور حوالے دینا شروع کرتے۔ یہاں تک کہ آخر میں محمد رفیع کے گانوں کے حوالے بھی دیتے۔ کہتے دیکھو تا منگیشکر نے بھی یہی کہا اور پھر لتا کا گایا ہوا کوئی گانا سنا دیتے۔ کبھی موڈ میں ہوتے تو لتا کی دھن میں بول الاپ بھی دیتے۔ پروفیسر اسرار احمد خان سہاروی فارسی کے استاد تھے اور استاد بے بدل تھے۔

ڈاکٹر وحید قریشی اپنی بھاری بھرکم، رعب دار بلکہ گرج دار شخصیت کے باعث سب پر بھاری تھے۔ ہمیشہ کھڑے ہو کر لیکچر دیتے۔ بولتے اتنی اونچی آواز میں کہ ساتھ والے کمروں میں بیٹھے ہوئے طلبا بھی مستفید ہو جاتے۔ ایک روز بڑے زور و شور اور دھوم دھام سے اپنی روایتی بلند آہنگی میں لیکچر دے رہے تھے کہ ایک لڑکے سے نہ رہا گیا۔ وہ پہلی ہی صف میں بیٹھا تھا۔ اچانک اٹھ کھڑا ہوا اور بولا ”سر آواز نہیں آ رہی، ذرا بلند آواز سے بولیے۔“ سارا کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی لطف اٹھایا۔

اسلامیہ کالج گوجرانوالہ میں، ہمارے سینئر طلبا مثلاً ارشد میر، امین ملک اور رزاز کاشمیری وغیرہ نے مل کر کالج میں ”بزمِ ادب“ قائم کر دی تھی۔ اس کے ہفتہ وار اجلاس ہوتے جن میں زیادہ تر ڈاکٹر وحید قریشی، مظفر علی سیّد، پروفیسر اسرار احمد خان سہاروی اور صوفی محبوب الٰہی جیسے اساتذہ شریک ہوتے۔ یوں تو گفتگو سب میں ہوتی مگر اصل معرکے ڈاکٹر صاحب اور سیّد صاحب میں برپا ہوتے۔ ڈاکٹر صاحب اور سید صاحب میں زہریلے تیروں کا تبادلہ ہوتا۔ جب جنگ زور پکڑتی اور میدان کارزار گرم ہوتا تو یوں لگتا کہ دونوں جنگجو بڑھ بڑھ کر غنیم پر حملہ آور ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کا انداز بعض اوقات مار دھاڑ کے قریب پہنچ جاتا۔ یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی جانباز اپنی فتح کے بے پناہ یقین کے ساتھ دشمن پر آخری ضربیں لگا رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی آنکھوں میں معمول کی چمک بھی غیر معمولی ہوتی ہے مگر ایسے موقعوں پر ان کی آنکھیں پھیل کر دو چند ہو جاتی ہیں اور ان کی چمک میں بجلی کے کوندے شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ کوندے آج بھی اس طرح لپکتے دکھائی دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے جملوں میں دھماکہ خیز مواد کی فراوانی ہوتی...... یہی دھماکہ خیزی ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا نمایاں جوہر بن گئی جس نے پھر زندگی بھر ان کی شخصیت کو چار چاند لگائے رکھے۔

غالباً ۱۹۵۷ء میں ڈاکٹر صاحب اسلامیہ کالج لاہور چلے گئے۔ پھر جلد ہی یہاں سے اورینٹل کالج لاہور میں منتقل ہوئے اور یوں یہ روشن سیارہ وسیع اور بلند تر مدار میں گردش کرنے لگا۔

بقدرِ شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل　　کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

ڈاکٹر صاحب کے اصل جوہر لاہور جا کر ہی کھلے۔ گوجرانوالہ تو ان کے لیے ایک درس گاہ یا تربیت گاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ ویسے تو یہاں بھی ان کے معرکوں کی کئی داستانیں سنائی دیتی ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب کا شمار ایسے لوگوں میں ہوتا ہے جو جہاں بھی جاتے ہیں داستانیں چھوڑ جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا زیادہ حصہ گوجرانوالہ اور لاہور میں گزرا یا پھر کچھ حصہ اسلام آباد میں، سو تینوں جگہوں پر ان کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔

اورینٹل کالج لاہور میں ان کے حریف عبادت بریلوی صاحب تھے۔ جمیل الدین عالی صاحب سے بھی ڈاکٹر صاحب کا معرکہ رہا جس کی یادگار کے طور پر یہ شعر ریکارڈ پر ہے:

مرد سے عورت بنا عورت سے مرد
میں جمیل الدین عالی ہو گیا

ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب سے ڈاکٹر صاحب کے معرکے وہاں کے کالج کی داستانوں میں شامل ہیں جنھیں اس کالج کا کوئی داستان گو ہی بیان کرے گا۔ لیکن کالج سے باہر کے معرکے سب کو سنائی دیے۔ قتیل شفائی صاحب سے بھی ڈاکٹر صاحب کی ٹھنی رہی۔ اس رجز خوانی میں یہ بھی ہوا کہ دونوں جوانب سے ایک دوسرے کے نام بگاڑے گئے اور فضا علمی و ادبی معرکہ آرائی سے نکل کر ذاتی حملوں تک آ گئی۔ احمد ندیم قاسمی صاحب سے بھی ڈاکٹر صاحب کی رزم آرائی رہی چنانچہ اب بھی ڈاکٹر صاحب کی زبان پر ندیم صاحب کا نام اسی ضمن میں آتا ہے۔ اس کی وجہ یا تو قتیل صاحب سے معرکہ آرائی ہے یا پھر مجلس ترقی ادب اور اس کا رسالہ "صحیفہ" ہے جس کا چارج پہلے ڈاکٹر صاحب کے پاس تھا اور پھر ندیم صاحب نے لے لیا۔ بہر حال وجہ کچھ بھی ہو ندیم صاحب ڈاکٹر صاحب کی نثری شاعری میں ٹیپ کا مصرع ضرور ہیں۔ ویسے بھی ڈاکٹر صاحب کی شاعری زیادہ تر ایسے ہی کاموں میں صرف ہو گئی۔

ڈاکٹر صاحب رزم کے ہی نہیں بزم کے بھی مرد میدان ہیں۔ محفلیں ان کے برمحل جملوں سے کشت زعفران بن جاتی ہیں لیکن اس زعفران کا ذائقہ قدرے مختلف ہوتا ہے۔ اکثر مخاطب کو تھوڑی سی چینی منہ میں ڈالنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ گو ڈاکٹر صاحب کے جملوں میں فریق مخالف کو مسمار کر دینے کا رجحان غالب ہوتا ہے۔ پھر بھی یہ جملے لطف دیتے ہیں۔

ایک محفل میں اردو افسانے میں طوائفوں کے کرداروں کا ذکر چل نکلا۔ ایک صاحب نے اس سلسلے میں منٹو کا ذکر کیا۔ قریب ہی ایک ناول نگار بیٹھے تھے جنھوں نے بہت سے تاریخی ناول لکھے ہیں، بولے "طوائفوں کے موضوع پر میں نے بھی تین ناول لکھے ہیں۔" ڈاکٹر صاحب کی رگ ظرافت پھڑکی، کہا "بہت اچھی بات ہے۔

حقوق ہمسائیگی بھی ادا کرنے چاہئیں۔"

غالباً ۱۹۸۵ء میں ڈاکٹر صاحب مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد میں صدر نشین ہو کر آئے اور آتے ہی یہاں کی ادبی محفلوں کی صدارت سنبھال لی۔ ہر طرف سے شور بلند ہوا کہ اسلام آباد کی ادبی محفلوں کو مستقل صدر مل گیا۔

"مقتدرہ" میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے خصوصی اختیارات کے ذریعے بہت سے ادیبوں مثلاً ڈاکٹر اعجاز راہی، ڈاکٹر انعام الحق جاوید، ڈاکٹر عطش درانی، ڈاکٹر بشیر سیفی کو ملازمت دے دی۔ کوئی صاحب ڈاکٹر وحید قریشی صاحب سے ملنے آئے تو دورانِ گفتگو شاید ڈاکٹر صاحب کو خوش کرنے کی نیت سے کہا:

"ڈاکٹر صاحب آپ نے اپنے دفتر میں بے شمار ہیرے جمع کر لیے ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب نے بلا تامل کہا، "جی ہاں۔ ہیرے اتنے جمع ہو گئے ہیں کہ اب یہ دفتر اچھی خاصی ہیرا منڈی نظر آنے لگا ہے۔"

ڈاکٹر صاحب میں جملہ کہنے کی صلاحیت بھی ہے اور ہمت بھی۔ ان کا شمار اردو کے چوٹی کے جملہ بازوں میں ہوتا ہے۔ شاید اتنے بڑے محقق، نقاد اور ماہر تعلیم کے لیے جملہ بازی وجہ افتخار نہ ہو لیکن مجھے بہر حال ان کی اس بے پناہ خداداد صلاحیت کا اظہار ضرور کرنا ہے جو خدا نے بہت ہی کم لوگوں کو ودیعت کی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی خوبی یہ ہے کہ وہ جملہ آتا ہے تو روکتے نہیں بلکہ کہہ دیتے ہیں، بلکہ مار دیتے ہیں۔ شاید وہ اس بات کے قائل ہیں کہ بندہ ہاتھ سے جائے تو جائے مگر جملہ ہاتھ سے نہ جائے۔ یہ چند جملے تو مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی حس مزاح اور خصوصاً جملہ چست کرنے کی غیر معمولی صلاحیت کا ذکر کیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب کو بذلہ سنج نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ان کی ساری شگفتگی جملے اور برمحل جملے میں ہے۔ ورنہ عام زندگی میں وہ خاصی سنجیدہ باتیں کرتے ہیں اور دوستوں کو مخلصانہ اور پر حکمت مشورے دیتے ہیں جن میں دور اندیشی کا اور خیر خواہی کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ مجھے ڈاکٹر صاحب کے ان مخلصانہ مشوروں سے مستفید ہونے کا کئی بار موقع ملا۔

مثلاً جب ڈاکٹر صاحب "مقتدرہ" کے صدر نشیں کے طور پر اسلام آباد آئے تو میں انھیں ملنے گیا۔ اس سے دو سال قبل حلقۂ ارباب ذوق اسلام آباد کے انتخابات میں میرے اور اختر امان کے درمیان اختلاف ہو گیا تھا۔ چنانچہ بات اخبارات تک پہنچی اور کئی ماہ تک اس سلسلے میں پنڈی، لاہور اور کراچی کے روزناموں میں بیان بازی ہوتی رہی جو خاصی شدید تھی۔ اس سلسلے میں بہت سے بیان میری طرف سے بھی شائع ہوئے۔ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب لاہور میں بیٹھے یہ سب کچھ پڑھ رہے تھے اور ساری صورت حال سے پوری طرح آگاہ تھے۔ اب جب اسلام آباد آئے اور میں ان سے ملنے گیا تو ڈاکٹر صاحب نے مجھے بحیثیت استاد کے بہت سی قیمتی نصیحتیں بھی

کیں۔ فرمایا ''جب تک آدمی کو نوے فی صد اپنی فتح کا یقین نہ ہو اس وقت تک کسی سے محاذ آرائی نہیں کرنی چاہیے۔ پھر کہا کہ ''ایسے معاملات میں وقت بھی ضائع ہوتا ہے اور صلاحیتیں بھی...... اور اکثر دوست نما دشمن ایسے وقتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔''

ایک اور ملاقات میں بھی اس موضوع پر ہدایات دیں اور کہا ''جب وقت ساز گار نہ تو کچھ دیر کے لیے پس پردہ چلے جانا چاہیے کیونکہ لوگوں کا اخلاقی معیار یہاں تک گر چکا ہے کہ بعض اوقات ملازمت کے لالے پڑ جاتے ہیں...... اور شاید ادب کے لیے ہم اتنی دور تک نہ جاسکیں۔''

ڈاکٹر صاحب کے خلوص کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ایک اور ملاقات میں بھی انھوں نے مجھے ایسی ہی نصیحتیں کیں۔ تب مجھے شبہ ہوا کہ شاید ڈاکٹر صاحب مجھے کوئی جانباز قسم کا آدمی سمجھتے ہیں۔ تب میں نے صورت حال کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ''ڈاکٹر صاحب جنگ و جدال میرا مزاج نہیں ہے مجھے اس کے لیے مجبور کر دیا گیا تھا۔''

اس پر کہا ''یہ سب درست ہے مگر آپ کو احتیاط کی ضرورت ہے۔'' پھر قدرے توقف سے کمرے کی فضا میں گھورتے ہوئے بولے ''ہم نے ساری عمر جنگیں لڑیں مگر حاصل کیا ہوا۔ شاید اس میں بہت کچھ کھویا ہی۔'' یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔ محرومیوں کے ذکر سے شاید وہ بچنا چاہتے تھے...... اسی طرح نجی زندگی کی محرومیوں کا بھی انھوں نے کبھی ذکر نہیں کیا۔

ڈاکٹر صاحب جیسے تیز طبع اور جلد معاملے کی تہہ تک پہنچ جانے والے لوگ بہت کم ہوں گے۔ وہ بے حد ذہین شخص ہیں اور انتہائی طور پر خیر خواہ بھی۔ ایک ملاقات میں، میں نے عرض کیا ''ڈاکٹر صاحب آپ کے دوسرے شاگردوں نے آپ سے اٹھارہ گریڈ کی نوکریاں لیں لیکن ہمارے حصے میں صرف آپ کے لکھے ہوئے فلیپ آئے۔ کہا ''تمھاری کالج لیکچرار کی سترہ گریڈ کی مستقل نوکری ''مقتدرا'' کی عارضی اور دفتری اٹھارہ گریڈ کی نوکری سے بدرجہا بہتر ہے۔ کالج کا استاد تو بادشاہ ہوتا ہے اور دفتر میں تو اٹھارہ گریڈ کا افسر بھی کلرکی کرتا ہے۔ تاہم اگر تم چاہو تو 'مقتدرا' تمھیں خوش آمدید کہے گا...... لیکن میری نصیحت ہے کہ ہرگز دفتری نوکری میں نہ آنا۔''

ڈاکٹر صاحب کے بارے میں لکھنے والوں نے زیادہ تر ان کی جملے بازی کو اچھالا ہے لیکن اس ہمدرد، غم گسار اور دوستوں کے دوست بلکہ یاروں کے یار اور قانونی ضابطوں کا انتہائی طور پر احترام کرنے والے شخص کو نظر انداز کر دیا ہے جو ڈاکٹر وحید قریشی کی ذات میں چھپا ہوا ہے۔ انھوں نے اپنے دفتر میں سخت قسم کا ڈسپلن نافذ کر رکھا تھا۔ اکثر وہ دوسروں کے کمروں میں جا کر بیٹھتے...... لیکن اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے بھی وہ دفتر میں ہونے والی ایک ایک بات سے آگاہ ہوتے۔ سب کام قانون ضابطے کے مطابق کرواتے...... اس لیے بعض لوگوں کو ان سے شکایات بھی پیدا ہوئیں۔ یہ بھی ہے کہ خود وہ جس کام کو جس طرح چاہتے کر جاتے۔ انھوں نے اپنے کئی ادبی

حلیفوں سے کتابیں لکھوائیں اور کھڑے کھڑے انھیں کنٹریکٹ دے دیے اور ان کے لیے انھیں بہت معقول معاوضے بھی ادا کیے۔

ڈاکٹر صاحب میں کام کرنے اور کام کروانے کی غیر معمولی صلاحیتیں ہیں۔ ان کے زمانے میں ''مقتدرا'' کی طرف سے کئی درجن کتب شائع ہوئیں۔ بہت سارے اہل قلم نے ملازمتیں حاصل کیں۔ جو کوئی ڈاکٹر صاحب سے ملنے دفتر جاتا اسے ترجمے کی فائل تھما دیتے۔

کام اور اہمیت پر ان کا ایمان پختہ ہے۔ یہ دونوں خوبیاں ان کی ذاتی زندگی میں بھی بہت نمایاں ہیں۔ کام کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ تحقیق، تنقید، شاعری اور تراجم وغیرہ پر مشتمل ان کی کتب کی تعداد چالیس سے زائد ہو چکی ہے۔ وہ ساری مصروفیتوں، بزم آرائیوں اور رزم پیمائیوں کے درمیان بھی لکھنے کے لیے وقت نکال لیتے ہیں۔ یہی ان کے کام کا راز ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اصل چیز انسان کا کام ہے۔ کل مورخ عہدے نہیں، کام کو سامنے رکھ کر رائے قائم کرے گا۔ ڈاکٹر صاحب کا سارا تعلیمی اور تحقیقی کام اس حالت میں ہوا کہ وہ ایک طویل عرصے سے سانس اور دوسرے عوارض کا شکار چلے آ رہے ہیں۔ بعض اوقات یہ تکالیف اتنی بڑھ جاتی ہیں کہ وہ آرائشِ بستر نظر آنے لگتے ہیں۔

ایک ملاقات کے دوران میں ڈاکٹر صاحب نے اس موضوع پر طویل گفتگو کی اور کام کی اہمیت پر زور دیا۔ میں یہ سوچ سوچ کر ہمیشہ حیران ہوتا رہا کہ وہ اب بھی مجھے اس طرح پیش آتے ہیں، اسی طرح باتیں کرتے ہیں جس طرح استاد اپنے شاگرد سے پیش آتا ہے۔

اس ملاقات میں انھوں نے کہا کہ ''ایک وقت تھا جب لاہور کا کوئی ادبی جلسہ تاثیر، عابد اور سالک کے بغیر اہمیت ہی اختیار نہیں کرتا تھا۔ لاہور ان لوگوں کی باتوں، جملوں اور پھبتیوں سے گونج رہا تھا۔ لیکن ان لوگوں نے اپنی عمریں محض باتوں میں بسر کر دیں اور کوئی قابل ذکر کام نہیں کیا۔ آج ان کے نام محو ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ مولانا مہر نے تھوڑا سا کام کر لیا سو اس کا حوالہ ادب میں آتا رہے گا۔''

پھر ڈاکٹر صاحب نے عہد حاضر کے ان نامور لوگوں کے نام گنوائے، ان میں ایک دو خود ان کے اپنے قریبی دوست ہیں (میں یہاں نام لکھنا مناسب نہیں سمجھتا) جو محض باتیں کر کے عمریں گزار رہے ہیں اور ابھی تک ان کی کوئی کتاب شائع ہو کر سامنے نہیں آئی۔ کل کا مورخ انھیں بھی تاثیر، عابد اور سالک کے خانے میں ڈال دے گا۔ کل کا مورخ تو صرف کام دیکھے گا۔

''مقتدرا'' کے صدر نشیں کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب نے بہت سی کامیابیاں بھی حاصل کیں۔ بہت سے جلسے، جلوس، سیمینار کروائے، کتابیں شائع کروائیں۔ سرکاری دفاتر میں نفاذ اردو کا محاذ گویا یہاں کی بیورو کریسی کے خلاف محاذ آرائی کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ اس حالت میں کہ ڈاکٹر صاحب کی ملازمت کنٹریکٹ پر تھی، ڈاکٹر

صاحب نے نفاذِ اردو کے لیے محاذ پوری شدت سے کھولا اور اس سلسلے میں زوردار بیانات دیتے رہے۔ بعض بیانات میں تو صاف صاف کہہ دیا کہ نفاذِ اردو کا معاملہ یہاں کی بیوروکریسی کی وجہ سے لٹکا ہوا ہے۔ اس مسئلے کو ڈاکٹر صاحب نے اس وقت کی پارلیمنٹ میں بھی پیش کروایا۔ اس ضمن میں اگرچہ زیادہ کامیابیاں حاصل نہ ہوسکیں، پھر بھی وزارتِ اطلاعات اور وزارتِ مذہبی امور میں وہ اردو نافذ کروانے میں کامیاب ہو گئے۔ ان حالات میں یہ بھی غنیمت تھا اور پھر اتنا بھی اور کس سے ہو سکا!

نفاذِ اردو کی جنگ ہر شخص جانتا ہے کہ یہاں کی بیوروکریسی کے خلاف جنگ ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے یہ تحریک بڑی شدومد سے شروع کر رکھی تھی۔ آئے دن ان کے بیانات اس ضمن میں اخبارات میں شائع ہو رہے تھے......

یہ سب کچھ ڈاکٹر صاحب اپنی ملازمت کی قیمت پر کر رہے تھے۔ ان کے کنٹریکٹ کی میعاد جب ختم ہوئی تو بڑے تذبذب کے بعد اس میں اضافہ کیا گیا اور وہ بھی بہت کم عرصے کے لیے کیا گیا۔

میں حیران تھا کہ مجھے نصیحتیں کرنے والے اور مصلحت کوشی کا سبق پڑھانے والے خود اپنے ہی بتائے ہوئے اصولوں کی نفی کر رہے تھے۔ مگر سوال ملازمت بحال رکھنے کا نہیں تھا اس ملازمت اور اس عہدے سے وابستہ فرائضِ منصبی ادا کرنے کا تھا سو انھوں نے حکومت کی پالیسیوں اور نفاذِ اردو کے سلسلے میں بیوروکریسی کی مخالفت کرنے کی مہم اپنی روایتی شدت سے جاری رکھی۔ دوسری بار کنٹریکٹ کی تجدید بڑی مشکل سے ہوئی اور تیسری بار تو صورتِ حال خاصی مخدوش نظر آ رہی تھی...... لیکن یہ سب کچھ دیکھ کر بھی ڈاکٹر صاحب اپنا رویہ تبدیل کرنے پر آمادہ نہ ہوئے اور بیانات اور جلسوں کے ذریعے میدان کارزار گرم رکھا۔

آخر صاحبانِ اقتدار کی قوتِ برداشت جواب دے گئی اور ملازمت کا کنٹریکٹ ختم کر دیا گیا۔

دل چاہا کسی روز جاؤں اور ڈاکٹر صاحب کو مرزا غالب کا یہ شعر سناؤں:

دل لگا کر آپ بھی غالبؔ مجھی سے ہو گئے
عشق میں آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

مگر وہ تو بغیر کوئی وقت ضائع کیے لاہور جا چکے تھے۔ وہ کئی ماہ پہلے ہی اپنی کتابیں اور دوسرا سامان لاہور پہنچانے میں لگے ہوئے تھے۔ شاید انھیں انجامِ کار کا اندازہ ہو چکا تھا۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنے عرصہ کار میں اس ادارے کو بہت وسعت دی۔ اس کے بہت سے الگ الگ شعبے قائم کیے۔ اس دفتر میں بعض حضرات کو اس وجہ سے شکایتیں بھی پیدا ہوئیں کہ انھوں نے انھیں کچھ گنجائشیں نہ دیں مگر جو شخص اپنے کردار کی تعمیر میں اپنے مفادات کو پس پشت ڈال دینے کا عادی ہو وہ بھلا دوسروں

کے لیے اپنی اخلاقیات کو کیوں مجروح کرے!

ڈاکٹر وحید قریشی نے اس ادارے کو مضبوط بنیادوں پر استوار کر دیا۔ اسے قابل توجہ بنایا، اعتماد بخشا اور اپنے دوسرے تمام ہم عصر اداروں میں ممتاز کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب کی موجودگی میں "مقتدرا" کے مقابلے میں ان کے تمام ہم عصر ادارے ماند پڑ گئے۔

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت میں حملہ کرنے کی بے پناہ قوت دست قدرت نے ہی رکھ دی تھی۔ سو زندگی بھر اس مرد آہن نے اس قوت کا بھرپور مظاہرہ کیا اور حالات وواقعات سے کبھی مرعوب نہ ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب اگر چاہتے تو ملازمت بچا سکتے تھے۔ کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا۔ صرف محاذ کو تھوڑا سا ٹھنڈا کرنے کی ضرورت تھی۔ میں جانتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی ملازمت کی قربانی دے کر اپنے جانشیں کے لیے ایک اچھی مثال قائم کی ہے...... مگر پھر بھی میں چاہتا تھا کہ یہ فتح نصیب جرنیل یوں پسپا ہو کر میدان سے واپس نہ جاتا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ بیوروکریسی کے خلاف محاذ کھول کر ہماری کئی حکومتیں تک پسپا ہوئی ہیں...... مگر پھر بھی......!

اس صورت حال میں یہ بات بڑی حوصلہ افزا تھی کہ ایک جواں مرد کٹتا تو ہے جھکتا نہیں۔
اور جو جھکتا نہیں وہ اپنے آپ کو بچا لے جاتا ہے...... پھر کسی موقع کے لیے!

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب "مقتدرہ قومی زبان" سے فارغ ہو کر لاہور چلے گئے تھے۔ ان کے جانے کے کئی دن بعد تک میں اس صورت حال کو سوچ سوچ کر ناخوش رہا۔ تاہم اس ضمن میں ان کا کردار دل کو تسلی دیتا تھا۔

کوئی ایک ہفتہ اس کیفیت میں گزرا کہ ایک روز ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کا فون آیا۔ انھوں نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب نے لاہور پہنچتے ہی "بزم اقبال" کو فتح کر لیا ہے اور اب وہ فتح کا جشن منانے میں سرتاپا مصروف عمل تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹر وحید قریشی

ڈاکٹر شمس الدین صدیقی

ڈاکٹر وحید قریشی محقق کی حیثیت سے معروف ہیں۔ وہ اردو کے علاوہ فارسی اور تاریخ میں بھی بڑی وسیع نظر رکھتے ہیں۔ تحقیق و تدقیق کے سلسلے میں انھیں اعتراف ہے کہ محمود شیرانی، مولوی محمد شفیع اور ڈاکٹر محمد اقبال نے اورینٹل کالج لاہور میں ریسرچ کا جو نہج قائم کیا تھا، وہ اس سے متاثر ہیں۔ بعد میں وہ ڈاکٹر سید عبداللہ سے بھی متاثر ہوئے۔ یہ محققین ادبی تحقیق کے سلسلے میں تاریخ کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ مختلف علوم اور مختلف زبانوں کے مطالعے کو بھی ضروری قرار دیتے ہیں اور معاشرتی علوم کے وسیلے سے ادب کے مختلف رشتے دریافت کرتے ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ یہ لوگ بنیادی طور پر مورخ ہیں۔ قریشی صاحب بھی اسی دبستان کے ایک فرد ہیں، بنیادی طور پر وہ بھی ایک مورخ ہیں۔ ادب سے حاصل شدہ واقعات اور سنین اور حالات و کوائف کو تاریخ کی مدد سے دریافت شدہ مواد کے ساتھ تطبیق دینا ان کی مخصوص تحقیقی تکنیک ہے۔ سید عابد علی عابد نے ان میں تنقید کا ذوق بھی بیدار کیا اور:

> ''میں نے اپنے لیے جدا راستہ بنالیا۔ فارسی ادب کے شوق اور اردو کی لگن نے نہ پوری طرح تحقیق کی طرف جانے دیا، نہ میں پوری طرح تنقید ہی کا ہو سکا۔ آئندہ میرا مطالعہ ان دو راستوں پر تھا۔ میں نے دونوں نقطہ ہائے نظر کے امتزاج سے اپنی راہ نکالنے کی کوشش کی ہے۔''
>
> (وحید قریشی، ڈاکٹر، مطالعۂ حالی، ص: ۱۵، ۱۹۔ لاہور ۱۹۶۱ء)

قریشی صاحب کے تحقیقی کاموں میں ''شبلی کی حیاتِ معاشقہ''، ''میر حسن اور ان کا زمانہ''، ''مطالعۂ حالی''، ''باغ و بہار (ایک تجزیہ)'' اور ''نذرِ غالب'' کے علاوہ ''کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ'' قابلِ ذکر ہیں۔ آخر الذکر کتاب میں فورٹ ولیم کالج کے چند مصنفین پر تحقیقی روشنی ڈالی ہے اور مثنوی چندر بدن ماہیار اور قاضی سراج الدین احمد کے بارے میں بڑی چھان بین کے بعد معلومات مہیا کی ہیں۔ علامہ اقبال کی تعلیمی زندگی کی بعض تفصیلات بھی فراہم کی ہیں۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی بعض تحقیقی غلطیوں کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ قریشی صاحب اپنی تحقیقات میں تمام معلومہ ادبی و تاریخی مواد اور وسائل تک براہِ راست پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں اور

واقعات وحقائق کا معروضی مطالعہ جن جن نتائج تک پہنچاتا ہے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔اس ضمن میں وہ کسی مصنف، کسی شاعر یا ادیب اور کسی محقق کی شہرت سے مرعوب نہیں ہوتے اور اپنے نتائج کے بارے میں بے باکی اور صاف گوئی سے کام لیتے ہیں، بلکہ بعض اوقات ان کے لہجے میں تندی اور قلم میں اس قدر شوخی آجاتی ہے کہ پڑھنے والوں کو گمان گزرنے لگتا ہے کہ اکابر کی کمزوریوں، کمیوں، غلطیوں اور عیبوں کو روشنی میں لاتے ہوئے قریشی صاحب کو بڑا مزہ آتا ہے لیکن اپنی مدافعت میں قریشی صاحب کہتے ہیں:

''مجھے بتایا گیا ہے کہ میرے قلم کی شوخی اور لہجے کی تندی عام پڑھنے والے کے معتقدات کو چھیڑنے اور اسے اشتعال دلانے کا سبب بھی بنتی ہے۔یہ عام پڑھنے والے کے بارے میں ممکن ہے صحیح ہو، محتاط قاری اس سے کبھی ہراساں نہیں ہوتا...... کہنے والے کہتے ہیں کہ مجھے معائب کی تلاش ہوتی ہے۔محاسن سے سروکار نہیں ہوتا۔حالانکہ یہ درست نہیں۔معائب کے بیان میں رو رعایت اور مصلحت اندیشی کو میں پسند نہیں کرتا اور کٹتے ہوئے جملوں کو بھی بے تکلف استعمال کرتا ہوں۔اس سے قاری کی نظر میں معائب کا حصہ زیادہ ابھر آتا ہو تو قاری کو محتاط ہو کر میری تحریریں پڑھنی چاہئیں۔ انھیں مضامین میں محاسن بھی دکھائی دیں گے۔''

(وحید قریشی، ڈاکٹر، مطالعۂ حالی۔ص:۱۶)

ڈاکٹر وحید قریشی اپنی تنقیدوں میں مصنفین کی تحریروں سے ان کی نفسیات کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔اس معاملے میں وہ انگریزی کے مشہور نقاد آئی۔اے۔رچرڈز سے متاثر ہیں جو تاثراتی تنقید کے خلاف تھا۔ ادب میں تعین قدر کو ایک قطعی سائنسی شکل دینا چاہتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ ادب کا مقصد قاری کے ذہن میں متوازن نفسیاتی کیفیات پیدا کرنا ہے۔اس نے یہ بھی تحقیق کی کہ ادب میں مستعملہ الفاظ کا فرداً فرداً کیا مفہوم ہوتا ہے اور الفاظ کے باہمی تعلق کی کیا نوعیت ہوتی ہے۔اس طرح اس نے تنقید میں Semantics کے مطالعے کو تنقیدی تجربے کی تکنیک سے مربوط کر دیا۔قریشی صاحب بھی وہی کچھ اردو میں کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو رچرڈز نے انگریزی میں کیا ہے۔قریشی صاحب کے اسلوب میں صحت وقطعیت اور علمیت کے عناصر نمایاں ہیں وہ جابجا طنز کے تیر ونشتر بھی استعمال کرتے ہیں جس سے ان کے طرز ادا کی خشکی تو ایک حد تک کم ہو جاتی ہے لیکن شگفتگی بھی پیدا نہیں ہو پاتی۔

قریشی صاحب کی تنقید کا نمونہ یہ ہے:

''ان کی (یعنی حالی کی) مسکین نہاد وضع دل کو لبھانے والی ہے۔ان کی غزل کے بعض شعر بڑے پُر لطف ہیں۔ان کا مرثیۂ غالب اردو کے بہترین مراثی میں شمار ہونا چاہیے۔مسدس حالی کے بعض بند

خاصے کی چیز ہیں۔ لیکن نثار حالی اور شاعر حالی میں بڑا فرق ہے۔ اشعار میں تو وہ نظریہ شعر کے بارے میں بھی خاصا سلجھا ہوا فکری نظام رکھتے ہیں لیکن نثر میں آ کر یہی باتیں الجھی ہوئی بے ترتیب ہو کر رہ جاتی ہیں۔ پھر نقاد حالی اور محقق حالی میں بھی فرق ہے۔ حالی کی تحقیق بھی ہر جگہ قابلِ ستائش نہیں ہے۔ ان کی کتابوں میں 'حیاتِ سعدی' سب سے اہم ہے اور یہی کتاب قابلِ تعریف بھی ہے۔ اس کے مقابلے میں 'حیاتِ جاوید' اور 'یادگارِ غالب' اس اعتبار سے ناقص کتابیں ہیں۔ ان میں معلومہ مواد سے بھی پورا پورا فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ اگر یہ استدلال صحیح ہے (اور بظاہر اس کے صحیح ہونے میں شبہ نہیں ہونا چاہیے) تو پھر حالی کی تحقیق ہر جگہ قابلِ اعتبار نہیں ہے۔"

(وحید قریشی۔ ڈاکٹر، مطالعۂ حالی۔ ص: ۱۷، ۱۸، ۲۰)

☆☆☆

ڈاکٹر وحید قریشی سے متعلق ایک گفتگو

روزینہ فاروق/انور سدید

روزینہ فاروق: ڈاکٹر وحید قریشی سے آپ کی پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی اور ان کے بارے میں اولین تاثر؟

انور سدید: ڈاکٹر وحید قریشی سے میرا پہلا تعارف نریش کمار شاد کے رسالہ ''چندن'' میں ہوا تھا۔ اس پرچے میں ان کا ایک تنقیدی مضمون شائع ہوا تھا جس کے کاٹ دار لہجے نے میرے طالب علمانہ ذہن کو بہت متاثر کیا۔ ان سے زیادہ تفصیلی تعارف ان کی کتاب ''شبلی کی حیاتِ معاشقہ'' سے ہوا جو چھپتے ہی متنازعہ بن گئی تھی۔ اس کتاب میں شبلی کو نفسیات کے حوالے سے پرکھا گیا تھا اور وحید قریشی صاحب نے جو دوٹوک نتیجے نکالے تھے، ان سے یہ ثابت کرنے کی مخلصانہ کوشش کی گئی تھی کہ سیرۃ النبیؐ کے مصنف مولانا شبلی انسانوں کی جملہ خوبیوں اور جبلی خواہشات سے متصف تھے اور ان کے باطن میں بھی ایک جمال پرست انسان موجود تھا۔ لیکن مولانا شبلی نعمانی کی شخصیت کے گرد تقدس کا منور حلقہ گردش کر رہا تھا۔ اس کتاب نے اس حلقے کو توڑنے کی جسارت کی تھی۔ چنانچہ ایک ہنگامہ برصغیر کے طول و عرض میں شروع ہوگیا جسے ڈاکٹر وحید قریشی نے بڑی جرأت مندی سے برداشت کیا۔ اب یہ کتاب خود ڈاکٹر صاحب نے ممنوع اشاعت قرار دے دی ہے۔ تاہم نفسیات کی نئی روشنی میں جب ڈاکٹر ابن فرید نے شبلی نعمانی کا نفسیاتی مطالعہ کیا تو وہ بھی انہیں نتائج پر پہنچے جو ڈاکٹر وحید قریشی نے اخذ کیے تھے۔ قیوم نظر کے رسالہ ''کتاب'' میں ان کی ایک پیروڈی نے بھی انہیں دنوں شہرت حاصل کی تھی۔ چنانچہ ان کے بارے میں مشہور ہوگیا کہ وہ صداقت کو جرأت مندی سے پیش کرنے والے نقاد ہیں۔ اس قسم کی ایک مثال ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی مشہور زمانہ کتاب ''لکھنؤ کا دبستان شاعری'' پر ڈاکٹر وحید قریشی کا محاکمہ اور الطاف حسن قریشی کے ہفت روزہ ''زندگی'' میں ''ترقی پسند تحریک کے مصنفین'' پر ان کا سلسلہ مضامین ہے۔ اول الذکر مقالے پر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ناراض ہوگئے، موخر الذکر سلسلہ مضامین پر ترقی پسند ادبا ان کی ذاتی مخالفت پر اتر آئے۔ اردو ادب میں منافقانہ تنقید کا چلن عام ہے۔ اس دور کے متعدد نقاد چھوٹے سروں پر بڑے عمامے رکھ رہے تھے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے چند بڑے ادیبوں کو تنقید کے صحیح پیمانے سے ناپنے کی کوشش کی تو ان کے

قد چھوٹے ہو گئے۔ ان کی انا کے غبارے سے ہوا نکل گئی۔ بہت سے ادبائے کرام ان کے دشمن بن گئے لیکن مولانا صلاح الدین احمد جیسے صداقت پسند ادبا ان کی بہت قدر کرتے تھے اور ان کے مضامین ''ادبی دنیا'' میں نمایاں طور پر چھاپتے تھے۔ میں اس زمانے میں ادب کا معمولی طالب علم تھا اور ڈاکٹر وحید قریشی کے مضامین نہ صرف تلاش کر کے پڑھتا بلکہ ان کی جرأت مندی کا پختہ نقش بھی میرے دل میں موجود تھا۔ لیکن میں چونکہ لاہور سے بہت دور میانوالی کے صحراؤں میں ملازمت کی خاک پھانک رہا تھا، اس لیے ملاقات نہ ہوئی۔

ڈاکٹر وحید قریشی سے میری پہلی ملاقات ۱۹۶۸ء کے لگ بھگ ہوئی۔ میں نے ایم اے اردو کا امتحان ایک پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت میں شوقیہ دیا تھا اور قسمت کی خوبی دیکھیے کہ میں اس امتحان میں پنجاب یونیورسٹی میں اوّل آ گیا۔ کانووکیشن پر ڈگری کے لیے لاہور آیا تو ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی اور یہیں معلوم ہوا کہ وہ میرے غائبانہ محسن تھے۔ متذکرہ امتحان میں ایک پرائیویٹ گم نام امیدوار کے اوّل آ جانے سے کہ جس کا نام محمد انوار الدین سدید تھا، شاید یونیورسٹی کا وقار مجروح ہو رہا تھا۔ سیّد وقار عظیم کی پوری کوشش تھی کہ یونیورسٹی کے اس اعزاز کو برقرار رکھا جائے اور دوسرے نمبر پر آنے والے طالب علم کو جو اتفاق سے امجد اسلام امجد صاحب تھے، اوّل قرار دے دیا جائے۔ ڈاکٹر وحید قریشی اس ممکنہ اقدام کے خلاف سدِ سکندری بن کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ زیادہ نمبر حاصل کرنے والے حق دار سے اس کا حق نہ چھینا جائے۔ چنانچہ میری اوّلیت قائم رہی، مجھے دو گولڈ میڈل عطا کیے گئے۔ بیرونی طلبا میں میرا ریکارڈ تا حال قائم ہے۔ مجھے جب اس واقعے کا علم ہوا تو میرے دل میں ڈاکٹر وحید قریشی کی عزت بہت بڑھ گئی۔ اب تک ان سے نیاز مندی کا یہ تاثر قائم ہے۔ ان کے احسانات کا سلسلہ جاری ہے۔

میری آخری بات کا بھی ایک مخصوص پس منظر ہے۔ آپ نے بات چھیڑی ہے تو بتا دینے میں کوئی ہرج نہیں۔ واقعہ یوں ہے کہ ایم اے کرنے کے بعد وزیر آغا نے مجھے پی ایچ ڈی کرنے کی راہ دکھائی۔ انھیں دنوں ''ماہِ نو'' میں میرا مقالہ ''اردو کی فکری تحریکیں'' شائع ہوا تھا۔ آغا صاحب نے اس موضوع پر مجھے طویل مطالعہ کرنے اور پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے کا مشورہ دیا اور اجازت حاصل کرنے کے لیے سیّد وقار عظیم صاحب کے پاس لے گئے۔ سیّد صاحب نے اس موضوع کو بہت وسیع اور بسیط قرار دیا اور فرمایا کہ ''گہری تحقیق کے لیے موضوع مختصر ہونا چاہیے۔'' ان کے بعد ڈاکٹر عبادت بریلوی صدر شعبہ بنے تو انھوں نے متذکرہ موضوع پر میرا خاکہ قبول کر لیا۔ لیکن خاکے کی بدقسمتی دیکھیے کہ پانچ مرتبہ گم ہو جاتا رہا اور تین چار سال تک بورڈ آف اسٹڈیز کے سامنے پیش نہ ہو سکا۔

ڈاکٹر وحید قریشی، صدر شعبہ بنے تو انھوں نے دفتر سے یہ خاکہ تلاش کروالیا اور مجھے مقالہ لکھنے کی منظوری دلا دی۔ علمی اور تحقیقی رہنمائی میں ڈاکٹر وحید قریشی نے میری بہت معاونت کی۔ انھوں نے مجھے اپنی لائبریری استعمال کرنے کی اور بہت سی قیمتی اور نایاب کتابیں سرگودھا لے جانے کی اجازت دی۔ انھوں نے مجھے یہ قیمتی مشورہ بھی دیا کہ میں پی ایچ ڈی کے مقالے کی تحقیق کے دوران میں دوستوں کو خط لکھنا بھی موقوف کر دوں اور ساری توجہ اور تمام قوت اس مقالے پر صرف کروں۔ ''اردو ادب کی تحریکیں'' کے ممتحن ڈاکٹر سید عبداللہ تھے۔ انھوں نے اس مقالے پر مجھے بے پناہ داد دی۔ بعد میں جب کتاب چھپی تو اسے ہجرہ قومی ایوارڈ بھی عطا کیا گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ زندگی کی چند غیر معمولی مسرتیں ہیں جو مجھے ڈاکٹر وحید قریشی نے عطا کیں۔ ان سے ملاقات نہ ہوتی تو میں ان سے ضرور محروم رہتا۔

روزینہ فاروق: ڈاکٹر وحید قریشی نے طویل علمی اور ادبی زندگی گزاری ہے اور ادب کے مختلف شعبوں میں اپنے تحریری، تحقیقی اور تنقیدی کام سے اضافہ کیا ہے اور کچھ اثرات مرتب کیے ہیں، اس سلسلے میں آپ کا تاثر کیا ہے؟

انور سدید: میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی مجموعی طور پر ایک فیض رساں شخصیت ہیں۔ ایک استاد کی حیثیت میں ان سے ہزاروں طالب علموں نے فیضِ تلمذ حاصل کیا اور اب اس فیض کو آگے اپنے طالب علموں میں تقسیم کر رہے ہیں۔ ایک ادیب، نقاد اور محقق کی حیثیت میں ان کی کتابوں سے ہزاروں لوگ راہنمائی حاصل کرتے اور اپنے ذوق کو سیراب کرتے ہیں۔ ان کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ محنت اور لگن سے کام کرنے والے طلبا کی نہ صرف سرپرستی کرتے ہیں بلکہ ان میں طلب و جستجوئے صداقت کا جذبہ بھی پیدا کر دیتے ہیں اور ان طلبا کی تخلیقی قوت میں حوصلہ افزائی کا عنصر بھی شامل کر دیتے ہیں۔ انھوں نے میرے علمی منصوبوں میں ہمیشہ میری راہنمائی کی۔ جن دنوں وہ ''صحیفہ'' کے مدیر تھے تو ''غالب نمبر'' مرتب کر رہے تھے۔ غالب پر کام کرنے کا مشورہ انھوں نے ہی مجھے دیا۔ مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین تھے تو انھوں نے ''اردو ادب کی مختصر تاریخ'' اور ''اردو ادب میں سفرنامہ'' لکھنے کی تحریک دی۔ چنانچہ یہ کہنا درست ہے کہ وہ نہ صرف ادیب ہیں بلکہ محرکِ ادب بھی ہیں۔ میں انھیں ادیب گر بھی شمار کرتا ہوں۔ میں نے تنقید میں بہت سے مثبت اثرات ان سے حاصل کیے ہیں۔ وہ خود محنت کرتے ہیں، دوسروں میں محنت کی خو پیدا کرتے ہیں۔

روزینہ فاروق: تحقیق، تنقید، تدوین، غالبیات، اقبالیات، تحریکِ پاکستان وغیرہ میں سے کس یا کن شعبوں میں ڈاکٹر وحید قریشی کا کام نسبتاً زیادہ وقیع ہے اور کس حوالے سے؟

انور سدید: روزینہ! آپ نے انتظار اور ابلاغ کی جو اصناف شمار کی ہیں اگر چہ یہ سب مختلف النوع ہیں لیکن ان سب پر کام کرنے والی مرکزی شخصیت ایک ہے یعنی ڈاکٹر وحید قریشی، وہ جس صنف اظہار کو مس کرتے ہیں اس میں ان کی پوری شخصیت سما جاتی ہے اور جو کام ان سے موسوم ہوتا ہے وہ بے حد وقیع ہوتا ہے۔ مثلاً میں انھیں بنیادی طور پر محقق سمجھتا ہوں۔ وہ تحقیق میں محمود شیرانی کے دبستان کے نمائندہ ہیں۔ یہ دبستان صداقت کو گہرائی سے تلاش کرتا اور سابقہ غلط مبحث کی تصحیح کرتا ہے۔ وطنیت کے زاویے سے وہ پکے پاکستانی ہیں۔ اس وابستگی کو تحریک پاکستان اور مطالعہ اقبال نے زیادہ پختگی عطا کی ہے۔ لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ وہ صداقت کو دلیری اور جرأت مندی سے پیش کرتے ہیں اور اس خاصیت ہی سے ادب اور تاریخ اور تعلیم میں ان کی انفرادیت قائم ہوتی ہے۔ اس اساس پر ہی انھیں وقیع قرار دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر وحید قریشی کو جزوی طور پر نہیں بلکہ کلی طور پر دیکھیے۔ آپ کو ان کی تحریریں مطالعے کی باطنی روشنی سے منور نظر آئیں گی اور ان کے تنقیدی دلائل میں وزن محسوس ہوگا۔ وہ "یوں بھی ہے اور یوں نہیں بھی ہے" قسم کے نقاد یا ادیب نہیں ہیں، وہ دوٹوک فیصلہ دیتے ہیں اور اپنی رائے کا اثبات اور دفاع کرتے ہیں۔ یہ خوبی اس دور کے بہت کم ادیبوں اور نقادوں میں نظر آتی ہے۔ بلاشبہ وہ "خیال خاطر احباب" سے گریز نہیں کرتے لیکن وہ اپنے قریبی دوست کی تعریف میں مبالغہ آرائی کے قائل نہیں اور اس کی کوئی حقیقی خوبی ضرور تلاش کر لیتے ہیں۔ ان کے تنقیدی پیمانے پر پورا اترنا آسان نہیں ہے۔

روزینہ فاروق: ڈاکٹر وحید قریشی بہت سے انتظامی عہدوں پر بھی فائز رہے، صدر شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی، پرنسپل اورینٹل کالج، ناظم اقبال اکادمی پاکستان، صدر نشین مقتدرہ قومی زبان، ناظم بزم اقبال لاہور، ناظم مغربی پاکستان اردو اکیڈمی وغیرہ۔ ایک منتظم کی حیثیت سے ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

انور سدید: میں ان تمام انتظامی حیثیتوں میں ڈاکٹر وحید قریشی کا دور کا شناسا ہوں۔ یعنی ان عہدوں پر میں نے ان کے ساتھ کبھی کام نہیں کیا لیکن میرا دور کا مشاہدہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب بہت کڑے اور کڑوے منتظم ہیں۔ وہ دفتری نظام کو قواعد و ضوابط کے عین مطابق چلاتے ہیں اور پہلے قانونی ضابطوں پر خود عمل کرتے ہیں، مثلاً جب وہ مقتدرہ قومی زبان کے سربراہ تھے تو لوگوں کو شدید شکایت تھی کہ ڈاکٹر صاحب معینہ وقت سے تین منٹ پہلے آکر بیٹھ جاتے تھے اور نصف گھنٹے کے بعد حاضری کا رجسٹر اپنے پاس منگوا لیتے تھے۔ شام کو دیر تک بیٹھتے، لیکن دفتری اوقات کے بعد کوئی رخصت ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی دوسری بڑی خوبی ان کی مالی امور میں دیانت داری ہے۔ کرپشن کے اس دور میں

انھوں نے کسی کو ایک ٹیڈی پیسے کی خیانت نہیں کرنے دی تاہم اگر کچھ لوگ انھیں بھی جُل دے گئے ہوں تو یہ ان لوگوں کی عیاری ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب اخلاقی ضابطوں کی پابندی کی ہر شخص سے توقع کرتے ہیں۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ ایک ادارے میں ان کے دفتر کا ایک کلرک اخلاقی بے راہ روی کی طرف مائل تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک لمحے کا توقف کیے بغیر اس کی جواب طلبی کی اور اس کے ''اعتراف گناہ'' کے بعد اسے ادارے سے فارغ کر دیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی جس ادارے میں بھی فائز ہوئے اس کی کارکردگی میں اضافہ ہو گیا۔ ان کے رخصت ہو جانے کے بعد ان اداروں میں طویل عرصے تک ان کے بنائے ہوئے منصوبوں ہی پر کام ہوتا رہا۔ ''مقتدرہ قومی زبان'' اور اقبال اکادمی کی مثالیں سب کے سامنے ہیں۔ وہ بنجر اداروں کو زرخیز بنا دیتے ہیں۔ ان کا ٹھوس کام ان کی کارکردگی کی شہادت دیتا ہے۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ اس دور کے تن آسان اور تساہل پسند نوجوان اور دیگر اہل کار اور افسران جب اتنا کام نہیں کر سکتے جتنا ڈاکٹر وحید قریشی بڑھاپے، ضعیف العمری اور مختلف امراض کی یورش میں کر رہے ہیں تو وہ نہ صرف ان کے دشمن بن جاتے ہیں بلکہ سازشوں کے تانے بانے بھی بننے لگتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ وحید قریشی جب مقتدرہ قومی زبان سے رخصت ہو رہے تھے تو ان کے ''نیاز مند'' کہنے لگے ''اس بلا سے تو جان چھوٹی ہے۔'' بزمِ اقبال میں عملہ محدود تھا اس لیے یہاں اس نوعیت کی شکل پیدا نہیں ہوئی لیکن ایک اور ادارہ اس بات پر معترض تھا کہ وحید قریشی صاحب نے اتنے کم عرصے میں اتنی زیادہ ''اقبالیاتی کتابیں'' کیوں چھاپ دی ہیں؟ اور ''مجلہ اقبال'' کو باقاعدہ کیوں کر دیا ہے؟ وہ ''اقبال اکادمی'' میں آئے تو ایک صاحب کہنے لگے ''مقتدرہ قومی زبان کی بلا ہمارے سر پر آن ٹپکی ہے۔'' ڈاکٹر صاحب نے اس ادارے کے فالتو اخراجات اور بے مقصد مراعات کم کرنے کا سلسلہ شروع کیا تو سابقہ دور کے بعض ملازمین چلا اٹھے، آخری دور میں ان کے خلاف پمفلٹوں کی مہم چلائی گئی۔ پمفلٹوں کے لکھنے والے حلف اٹھا کر بری الذمہ ہونے اور سازش میں عدم شرکت کا یقین دلاتے اور پھر اپنی معصومیت میں سر کلر چھاپتے۔ ایک سازش میں تو ڈاکٹر وحید قریشی کے ساتھ مشفق خواجہ کو بھی ملوث کرنے کی کوشش کی گئی۔ ایک دفعہ ایک اخبار نویس ان کے پاس ''بدعنوانیوں'' کا پلندہ لے کر پہنچ گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے کہا کہ ''آپ یہ سب الزامات چھاپ دیجیے لیکن یاد رکھیے کہ انھیں ثابت کرنے کے لیے آپ کو عدالت میں آنا پڑے گا۔'' اس پر وہ صحافی رفوچکر ہو گئے۔ اس قسم کی بہت سی باتوں کا میں عینی شاہد ہوں۔ ڈاکٹر ملک حسن اختر نے ''تاریخ ادب اردو'' میں ڈاکٹر وحید قریشی کی تنقید کو جارحانہ اور بے رحمانہ قرار دیا ہے۔ تنقید کا عمل ان کی پوری زندگی پر حاوی ہے اور ان دفتری اور انتظامی

صلاحیتوں کی پرورش بھی دیانت داری کی جراحت اور صداقت کی ''بے رحمی'' سے ہوئی ہے۔

روزینہ فاروق: ڈاکٹر وحید قریشی کا جو ذخیرہ علمی و ادبی آپ کی نظر سے گزرا ہے آپ ان کی کتابوں میں سے کسے بہترین کتاب قرار دیتے ہیں اور اس طرح آپ کے خیال میں ان کا سب سے اچھا تنقیدی اور تحقیقی مضمون یا مقالہ کون سا ہے؟

انور سدید: ڈاکٹر وحید قریشی کی ایک کتاب نہیں بلکہ متعدد کتابیں معرکہ آرا ہیں۔ انھوں نے اپنی بیشتر تصانیف میں مضبوط حزب اختلاف کا کردار ادا کیا ہے اور موضوعات اور مصنفین کے مثبت اور منفی زاویے تلاش کرنے کی سعی کی ہے۔ ''میر حسن اور ان کا زمانہ'' تحقیق کا ایسا نمونہ ہے جسے آج بھی نظیر بنایا جا سکتا ہے۔ غالب، حالی اور اقبال ان کے مرغوب ترین مصنفین تھے۔ چنانچہ ''مطالعۂ حالی''، ''نذر غالب'' اور ''اساسیات اقبال'' بھی ان کی معروف کتابیں ہیں جن میں ان مصنفین کو روایتی زاویوں سے ہٹ کر موضوع بنایا گیا ہے۔ ''مثنوی چندر بدن ماہیار'' پر ان کا تحقیقی کام اس موضوع کے راستوں کو منور کرنے والا کام ہے۔ ترقی پسند تحریک پر ان کا سلسلۂ مضامین اب تک لوگوں کے ذہنوں پر نقش ہے۔ علی سردار جعفری، سجاد ظہیر، ڈاکٹر صادق، ڈاکٹر قمر رئیس اس تحریک کے وکیل بھی تھے اور منصف بھی اور قافلہ سالار بھی۔ وحید قریشی صاحب نے اس تحریک کے بارے میں وہ مواد پیش کیا جس کے حوالے اولی الذکر مصنفین کی کتابوں میں نہیں ملتے۔ ان کی مرتبہ کتاب ''انشائی ادب'' کا دیباچہ اور مقدمہ شعر و شاعری کے ماخذات پر ان کا مقالہ مجھے بہت پسند ہے۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ کسی مصنف کو اس کی ایک کتاب یا ایک مضمون سے دیکھنے کے بجائے اس کی ادبی شخصیت کی کلیت کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے بارے میں وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ادب کو پرستار کی حیثیت سے کم اور نقاد کی حیثیت سے زیادہ دیکھتے ہیں۔ ان کے مضامین میں کہیں نہ کہیں ایسا نقطہ ضرور آ جاتا ہے کہ سارا مضمون جگنو کی طرح اچانک چمک اٹھتا ہے اور پھر یہ چمک قاری کے ذہن کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ ''کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ'' اور ''تنقیدی مطالعے'' جیسی کتابوں میں ان کے متعدد نادر مضامین شامل ہیں اور بہت سے مضامین ابھی غیر مدون پڑے ہیں۔ حال ہی میں جدید شاعری اور افسانے پر ان کی کتابیں چھپی ہیں جن میں صحت، علمیت اور قطعیت کی کرنیں موضوعات کو منور کرتی ہیں۔

روزینہ فاروق: ڈاکٹر وحید قریشی کے بارے میں کوئی اور قابل ذکر بات؟ کوئی یادداشت؟ یا کوئی ملاقات؟

انور سدید: بی بی آپ نے ڈاکٹر وحید قریشی کی شاعری کا ذکر ہی نہیں کیا حالانکہ ان کی شاعری کی دو کتابیں ''نقد جاں'' اور ''الواح'' چھپ چکی ہیں۔ تیسری کتاب تسنیم احمد تصور کے ادارہ ''سورج پبلی کیشنز'' میں

زیر اشاعت ہے۔ بلاشبہ ان کی پوری ادبی شخصیت پر تحقیق اور تنقید حاوی ہے لیکن ان کے باطن میں ایک خوش فکر شاعر موجود ہے جو تخلیقی سطح پر اپنا الگ اظہار چاہتا ہے۔ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کی کتاب ''الواح'' کا پیش لفظ میں نے لکھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب عمدہ مزاح نگار بھی ہیں۔ روزنامہ ''جنگ'' میں ادبی صفحے پر ان کے طنزیہ اور مزاحیہ کالم چھپتے رہے ہیں اور یہ بہت مقبول ہوئے تھے۔ پچھلے دنوں وہ حج پر گئے تو ارضِ حجاز میں کئی نعتیں ان پر اتریں۔ ان کی ایک حیثیت ادبی مدیر کی بھی ہے۔ اورینٹل کالج کے رسائل کے علاوہ انھوں نے مقتدرہ قومی زبان سے ''اخبار اردو'' کو پروان چڑھایا۔ مجلس ترقی ادب کے رسالہ ''صحیفہ'' کا منور اور تاباں زمانہ عابد علی عابد کا دورِ ادارت شمار ہوتا ہے لیکن ڈاکٹر وحید قریشی نے ''صحیفہ'' کو خالص تحقیقی رسالہ بنا دیا۔ ''امتیاز علی تاج نمبر'' اور ''عابد علی عابد نمبر'' اس کی دو یادگار اشاعتیں ہیں۔ ''غالب نمبر'' کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ بزمِ اقبال کا رسالہ 'اقبال'' اور اقبال اکادمی کا جریدہ ''اقبالیات'' بھی ان کے زمانے میں اقبالیات کے دو معروف رسائل تھے جن میں نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کی جاتی تھی۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے بعد مجلس ترقی ادب کے رسالہ ''صحیفہ'' کا جو حال ہوا ہے وہ اب کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

مجھے ڈاکٹر وحید قریشی کے ساتھ سفر کرنے اور دہلی میں ایک ہوٹل میں قیام کرنے کا موقع بھی ملا ہے۔ میں ان کے طرزِ غریبانہ سے خاص طور پر متاثر ہوا۔ ایک دن جوگندر پال ہمیں ''ہجرت نائیم'' کی ایک محفل میں لے جانا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب اس رقص میں جانے پر آمادہ نہ تھے لیکن جوگندر پال اور کرشنا پال کے اصرار کو ٹال نہ سکے۔ واپس آئے تو بولے ''صاحب واقعی! رقص، اعضا کی شاعری ہے۔''

میں نے یہ واقعہ ڈاکٹر وحید قریشی کی زندہ دلی کے ضمن میں بیان کیا ہے۔ ان کا بلند قہقہہ اور لطیفے کے غبارے میں نوک خار چبھونے اور لطف اندوز ہونے کا منظر جن لوگوں نے دیکھا ہے وہ ان کی اس بات سے اتفاق کریں گے کہ:

''مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں''

☆☆☆

ڈاکٹر وحید قریشی سے مکالمہ

عمران قریشی

س: ڈاکٹر صاحب! آج کل تو آپ مکمل طور پر فارغ ہیں۔ کوئی سرکاری ذمہ داری نہیں۔ کہیے کیسی گزر رہی ہے؟

ج: ریٹائرمنٹ کے بعد انسان کی زندگی میں باقاعدگی نہیں رہتی، جبکہ دوران ملازمت ایک روٹین بنی ہوتی ہے۔ آدمی ٹائم ٹیبل کے مطابق چلتا ہے۔ آج کل زیادہ تر گھر پر ہی رہتا ہوں۔ کچھ نامکمل مسودے تھے جنہیں دوبارہ دیکھا ہے۔ خود کو مصروف رکھنے کے لیے کالم نگاری شروع کی ہوئی ہے۔ فائلوں میں سے ۲۷ کے قریب مسودے ملے ہیں۔ کچھ تذکرے ہیں، کچھ Edit کی ہوئی کتابیں ہیں۔ اس کے علاوہ بکھرے ہوئے مضامین بھی یکجا کیے ہیں۔ فارسی میں بھی بہت سا کام ہے جسے مکمل کرنا ہے۔ فارسی کی سات کتابیں ایڈٹ کی ہوئی ہیں۔ شاعری کے مجموعے کی پیسٹنگ ہو چکی ہے جس کا نام ''ڈھلتی عمر کے نوحے'' ہے۔ اس میں غزلیں کم، نظمیں زیادہ ہیں، البتہ نئی چیزیں کچھ خاص نہیں لکھیں۔ اخباری کالم باقاعدہ پلاننگ کے تحت لکھے تھے، اب وہ کتابی صورت میں آرہے ہیں، عنوان ہے ''پاکستان کا موجودہ فکری بحران اور اس کا حل۔''

س: آج کل ہمارے سینئر ادبا، بیان بازی کی طرف بہت توجہ دے رہے ہیں۔ کوئی رسالہ یا اخبار اٹھا کر دیکھ لیں، بہت سنسنی خیز بیانات پڑھنے کو ملتے ہیں۔ اس رجحان کی بنیادی وجہ کیا ہے؟

ج: پہلی وجہ تو یہ ہے کہ ماہانہ ادبی رسائل تقریباً ختم ہو گئے ہیں۔ یوں ادیبوں کے لیے کوئی فورم نہیں رہا۔ ادیب پی آر کے چکر میں پڑ گئے ہیں۔ اکثریت کالم نگار بن گئی ہے۔ اس وقت جو لوگ زیادہ چمک رہے ہیں ان میں سے دس فی صد بھی زندہ نہیں رہیں گے۔ ادب اب اخبارات میں آگیا ہے۔ جس کی بنیاد پر نت نئے اسکینڈلز آرہے ہیں۔

س: اردو تنقید کی مجموعی صورت حال سے آپ مطمئن ہیں؟

ج: اس وقت سنجیدہ تنقید کی کوئی مارکیٹ نہیں ہے اس لیے سنجیدہ تنقید لکھی ہی نہیں جا رہی۔ تنقید کی تھیوری پر لکھی گئی کتابیں انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں، عملی تنقید زیادہ لکھی جا رہی ہیں۔ انعامات نے زیادہ خراب کیا ہے۔ کتابوں کی اکثریت انعامی مقابلوں میں شمولیت کے لیے چھپتی ہے۔

س: لمحہ موجود میں کسی نئی ادبی تحریک کی ضرورت محسوس کرتے ہیں؟

ج: یہ الیکٹرانکس اور کمپیوٹر کا دور ہے۔ کمپیوٹر ہی سب کام انجام دیتا ہے۔ ہم نے خود کچھ سوچنے کا عمل چھوڑ دیا ہے۔ ہم نے دماغ کے ان حصوں کو ہی سلا دیا ہے۔ سیاسی صورت حال یہ ہے کہ آگے کوئی راستہ ہی نظر نہیں آرہا۔ ہم جو نصب العین لے کر چلے تھے اسی پر Attack کرنا شروع کر دیا۔ اس کی ایک صورت تو صوبائیت کا پرچار ہے، پھر قومیت کے علم بردار بھی پیدا ہو گئے۔ کچھ لوگ مذہبی فرقوں کے رہنما بن گئے۔ ایسی حالت میں سوچ کے دھارے بن نہیں پائے کیونکہ یکجہتی کی فضا موجود نہیں ہے۔ پھر یہ بھی ہوا کہ ہم دوسروں کی تقلید میں لگ گئے۔ Long term پلاننگ ہم نے نہیں کی، اس لیے کہ کوئی تحریک بن نہیں رہی۔ اس وقت معاشرے میں ادب کی کیا حیثیت ہے؟ ادیب خود کتاب چھاپتا ہے اور لوگوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ ادب ہماری ترجیحات میں کہیں Exist نہیں کر رہا۔ کمرشل ازم کا دور دورہ ہے۔ اقبال کی شاعری بکتی ہے یا پھر اسلامی موضوعات پر لکھی گئی کتابیں۔ شعری مجموعے نہیں بکتے۔ پچاس فی صد ایسے مجموعے چھپ رہے ہیں جو وزن سے بالکل خارج ہیں۔ حکومت کوئی ادبی ادارہ بناتی ہے تو وہ سرکاری محکمہ بن جاتا ہے، اکادمی ادبیات کی مثال آپ کے سامنے ہے۔

س: کیا وجہ ہے کہ اردو تحقیق کو بڑے تخلیق کار میسر نہیں آئے؟

ج: بیسویں صدی میں تحقیق اور تنقید کے دھارے الگ الگ ہو گئے۔ نقاد تحقیق سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے اور محقق تنقید سے نا آشنا تھے، بلکہ تحقیق سے مراد محض خشک طریق کار اور قبریں کھود کر ہڈیاں نکالنے کا عمل لیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع نے جب اورینٹل کالج میگزین ۱۹۲۷ء میں شروع کیا تو پہلے اداریے میں صاف لکھا کہ ہم محقق گورکن ہیں ہمارا کام صرف حقائق کا کھوج لگانا ہے۔ ان کی تعبیر وتشریح ہمارے فرائض میں شامل نہیں۔ ان الگ الگ دھاروں کی وجہ سے اردو تنقید کو بہت نقصان پہنچا۔ اردو نقاد حقائق کی تلاش کے بعد ہی اس کی تعبیر کر سکتے تھے اس لیے ان سے بعض غلطیاں ہوئیں، مثلاً عام طور پر نقادوں نے لکھا کہ غالبؔ نے مندرجہ ذیل غزل ۱۸۵۷ء کے واقعہ سے متاثر ہو کر لکھی:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں غالبؔ صریر خامہ نوائے سروش ہے

تحقیق سے ثابت ہے کہ غالب نے یہ غزل ۱۸۳۲ء سے پہلے کہی تھی اور اس کا ۱۸۵۷ء سے کوئی تعلق نہیں۔ جن نقادوں نے اسے ۱۸۵۷ء پر منطبق کیا اور تنقیدی نتیجے نکالے وہ غلطی پر تھے۔ اسی طرح ڈاکٹر ابواللیث صدیقی مرحوم نے جرأت پر ایک کتاب لکھی ہے جس میں اس کی پیدائش کو نادر شاہ کے حملے کے وقت قرار دے کر جرأت کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے۔ یہ ساری باتیں غلط ہیں۔ نادری حملے

کے وقت جرأت کے والد پیدا ہوئے تھے، جرأت تو اس حملے کے بائیس تئیس برس بعد عالم وجود میں آئے تھے۔ اس لیے یہ پوری کتاب غلط ٹھہرتی ہے اور اس کے تنقیدی تجزیے محلِ نظر ہیں۔ اردو تحقیق کو اعلیٰ درجے کے تخلیق کار اس لیے میسر نہیں آئے کہ ہمارے ہاں تحقیق کو محض دو اور دو چار کی گردان سمجھا گیا ہے۔ اسے تخلیقی عمل کا حصہ نہیں سمجھا گیا۔ اکا دکا مثالیں ملتی ہیں مثلاً حافظ محمود شیرانی اچھی نثر بھی لکھتے تھے اور اعلیٰ پائے کے محقق بھی تھے۔ انھوں نے تحقیق کو تخلیق کا درجہ دیا اس لیے ان کی تحریریں پڑھتے ہوئے مزہ بھی آتا ہے اور زبان کے وہ جھول بھی نہیں ملتے جو مثلاً قاضی عبدالودود کے ہاں پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے تحقیق کو ریاضی کی شاخ بنا کر رکھ دیا ہے اور زبان کا چٹخارہ اور حسن کاری کا کوئی پہلو ان کے ہاں دکھائی نہیں دیتا۔

س: صرف ایک حافظ محمود شیرانی؟

ج: جی ہاں۔ باقی لوگ محض گورکن تھے اور قبر ہی کھودتے رہے۔ تعبیر و تشریح اور تخلیقی حسن کاری ان کے ہاں ناپید ہے۔ پاکستان بننے کے بعد تنقید تو کسی نہ کسی طرح پھیلتی رہی لیکن تحقیق پر زوال آ گیا۔ تحقیق جان ماری کا کام ہے۔ محنت کا کام ہے۔ موجودہ نسل محنت سے جی چراتی ہے اور کتاب دوستی بھی ان کے ہاں روز بروز کم ہوتی چلی جا رہی ہے، اس لیے تحقیق کی طرف لوگوں نے کم توجہ کی ہے اور تنقید میں مانگے تانگے کے خیالات سے دکانیں سجائی ہیں۔ ہمارے ہاں تنقید بھی مغرب سے اثر لے کر زندگی حاصل نہیں کرتی، نمو پذیر نہیں ہوتی بلکہ مغرب کی مرعوبیت کے زیر اثر اکثر نقاد نقال ہو کر رہ گئے ہیں۔ انھوں نے مغربی افکار کو اپنے فن اور اپنی ذات کا متحرک حصہ نہیں بنایا اس لیے فکر و احساس میں وہ تازگی اور وہ قوت نہیں ملتی جو مغرب کی تنقید کا حصہ ہے۔ سبب شاید یہ ہے کہ ہمارے ہاں ادب عمومی زوال کا شکار ہو گیا ہے۔ ہماری ترجیحات بدل گئی ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی طرف اچھے ذہن چلے گئے اور ادب کی سرزمین بنجر ہوتی چلی گئی۔ پوری اردو تحقیق محض گورکنی ہے۔ پاکستان بننے کے بعد بھارت میں امتیاز علی عرشی، مسعود حسن رضوی، قاضی عبدالودود جیسے لوگ تحقیق میں اپنی صلاحیتوں کا اظہار کر رہے تھے، پاکستان میں لے دے کر ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، نجم الاسلام اور مشفق خواجہ کے نام آتے ہیں۔ پھر پچاس سالوں میں اکا دکا نخلستان اور معاملہ ختم۔ بھارت میں تحقیق کی روایت مستحکم بھی رہی اور مضبوط بھی، اور تحقیق کے میدان میں اکابرین کے بعد ایک پوری نسل نمودار ہوئی۔ اس کے مقابلے میں پاکستان میں مجموعی طور پر تحقیق کا زوال ہی زوال ہے۔

س: اردو میں کوئی مکمل نقاد آپ کو نظر آتا ہے؟

ج: مجھے ایسا کوئی آدمی نظر نہیں آتا۔ معیار کو نیچے لے آئیں تو کچھ نام گنوائے جا سکتے ہیں۔ تنقید میں جو کام بھی ہوا ہے، وہ عملی تنقید میں ہے۔ اصول تنقید پر تک کر کام کرنے والے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ عسکری کا نام لیجیے، مظفر علی سید کا شمار کر لیجیے یا ڈاکٹر وزیر آغا کا تذکرہ کر جائیے، لیکن سچی بات یہ ہے کہ ہر لحاظ سے مکمل یا اعلیٰ پائے کا نقاد اردو میں ابھی پیدا نہیں ہوا۔ اعلیٰ تنقیدی صلاحیت کے لیے تحقیقی ذہن، کثیر مطالعہ اور دوسروں کے نظریات کو دیکھنے اور پرکھنے کی جو صلاحیت ہونی چاہیے وہ بہت کم ملتی ہے۔ صحافت نے ہمیں اور بھی اپنے مرکز سے ہلا دیا ہے۔ پی آر کے دور نے تنقید کو بھی متاثر کیا ہے۔ تحقیق دوسروں کی پگڑی اتارنے اور تنقید اپنوں کی پتنگ اڑانے میں ضائع ہو گئی۔ اب محض اسکینڈلز کا نام تنقید اور تحقیق بنتا جا رہا ہے۔ یہ افسوس ناک صورت حال ادبی صحافت کے بعض منفی رجحانات کا نتیجہ ہے، جس سے تخلیقی عمل رک رک کے چل رہا ہے۔

س: اس کا مطلب کہیں یہ تو نہیں کہ اردو تنقید کی زبان ہی نہیں ہے؟

ج: یہ بات نہیں ہے۔ تنقید کی روایت اردو میں موجود ہے لیکن اس کی آبیاری نہیں ہوئی حتیٰ کہ تنقید کی زبان بھی ابھی تک وجود میں نہیں آئی۔ ہم تاثراتی اور جذباتی زبان استعمال کرنے کے عادی ہیں اس لیے ہمارے ہاں تنقیدی زبان نے Grow نہیں کیا۔ ہم انگریزی تنقید اور مغربی تنقید کا مقابلہ نہیں کر سکتے، اس لیے کہ وہاں علوم کی جو ترقی ہوئی ہے اس کا پورا فائدہ اردو تنقید نہیں اٹھا سکی۔ ہم کہیں کہیں ڈنڈی مارتے ہیں۔ کلیم الدین احمد تنقید میں بہت صاف ہیں لیکن اسے عملی شکل دینے میں محض تعصبات کا شکار ہو گئے ہیں۔ عسکری علمی سطح سے نیچے اتر کر جذباتی چھکو بازی میں گرفتار ہوئے اور ذاتی محرومیوں کا بدلہ چکایا۔ مظفر علی سید میں ایک خاص طرح کی سنک ہے کہ وہ صرف اعلیٰ درجے کی چیز کی تعریف کرتے ہیں، اس سے کمتر کی گنجائش نہیں رکھتے اور فقرے بازی پر اتر آتے ہیں۔ وزیر آغا ایک لحاظ سے تنقید کی قلمرو میں اب تک چل رہے ہیں اور مغرب سے آنے والے نئے افکار کو اردو تنقید میں جذب کرنے میں کوشاں ہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ وہ عملی تنقید کے علاوہ اردو ادب کو نظری تنقید کا سرمایہ بھی دے رہے ہیں اور اسے غنیمت سمجھنا چاہیے۔

س: سلیم احمد، جیلانی کامران، انیس ناگی؟

ج: آپ نے یہ تین نام لیے ہیں۔ یقیناً یہ وہ لوگ ہیں جو باہر کا ادب پڑھتے ہیں اور جدید ترین تحریکات کو اردو میں روشناس کراتے ہیں۔ ان کی یہ اہمیت مسلم ہے لیکن آج کے دور میں نقاد کی کچھ محرومیاں اور کچھ تعصبات اس کا راستہ روکتے ہیں۔ اردو ادب کے جن نمونوں کا تجزیہ انھوں نے کیا ہے اس میں اعلیٰ درجے کا ادب ابھی تخلیق نہیں ہوا، اس لیے ان نقادوں میں خوب صورت تحقیقی سفر کی کچھ

مثالیں تو ملتی ہیں لیکن ابھی وہ مرحلہ نہیں آیا کہ ہم اردو کی طرف کھلنے والے ان نئے دریچوں سے پوری طرح ہوا کے خوشگوار جھونکے وصول کر سکیں۔ سلیم احمد اب ہم میں نہیں، اپنی روایات کو جہاں تک آگے لے جانا تھا وہ لے گئے لیکن عسکری کی طرح بعض تعصبات ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ سماجی زندگی کے حوالے سے جیلانی کامران نے ہمیں ایک نیا ادبی رویہ دیا لیکن ان کی توجہ تنقید سے زیادہ شاعری کی طرف ہو گئی اس لیے وہ تنقید کو کوئی عظیم کارنامہ نہیں دے پائے۔ انیس ناگی جدید تر نسل میں ایک اہم نام ہے جس کی تخلیقی صلاحیتیں شب و روز سرگرم عمل ہیں۔ کہیں کہیں جذباتی ہو کر ایک ''تھڑچھٹ'' نقاد کا روپ اختیار کر لیتے ہیں تو ان کا قاری سہم جاتا ہے۔ اگر وہ لاٹھی چارج کرنا کم کر دیں تو ان میں جو صلاحیتیں موجود ہیں وہ ادب کو بہت کچھ دے سکتے ہیں، اس لیے کہ دوسرے نقادوں کے برعکس انھوں نے لکھنا پڑھنا ترک نہیں کیا اور نئے رجحانات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی سکت رکھتے ہیں۔ شاعری، افسانہ اور تنقید تینوں میں ان کا قلم پوری طرح رواں ہے۔

س: ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر وحید قریشی؟

ج: ڈاکٹر انور سدید، ناگی کی طرح بے پناہ صلاحیتوں کے مالک ہیں لیکن صحافت نے اب کچھ عرصے سے انھیں ادب سے دور کر دیا ہے۔ ان کی واپسی کی توقع رکھتا ہوں۔ ڈاکٹر سلیم اختر بڑی تنقیدی صلاحیتوں کے مالک ہیں، خاص طور پر اردو ادب میں نفسیات کے حوالے سے انھوں نے جو تجزیے پیش کیے ان میں ایک ندرت اور تازگی ملتی ہے لیکن اب کچھ عرصے سے وہ کمرشل ازم کا شکار ہو گئے ہیں اور یہ صورت حال تشویش ناک بھی ہے کہ وہ معیار کو چھوڑ کر مقدار کی طرف زیادہ جھکتے دکھائی دیتے ہیں۔ کاش وہ قلم روک کر لکھیں اور سنبھل کر لکھیں ورنہ اردو تنقید انھیں بہت جلد بھلا دے گی۔ وحید قریشی نے اپنا کام شاعری سے شروع کیا۔ پھر تنقید سے تحقیق کی طرف نکل گئے۔ دلچسپی کے دائرے ایک سے زیادہ تھے۔ اردو ادب، پنجابی ادب، فارسی ادب، تاریخ، ابلاغیات اور فنون لطیفہ...... اس آوارہ خرامی کی وجہ سے کہیں ایک جگہ جم کر کام نہیں کیا۔ ہر اہم کام ملتوی رکھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد کروں گا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد غم روزگار نے مہلت نہ دی کہ کچھ کر پاتے۔

س: اقبال کے بعد کوئی بڑا شاعر؟

ج: اقبال کے بعد اس پائے کا کوئی شاعر اردو ادب میں دکھائی نہیں دیتا۔ یہ صورت حال افسوسناک ہے لیکن کیا کیا جائے۔ تنقید اور تحقیق کے مقابلے میں شعری روایت میں زیادہ اور اہم اضافے ہوئے ہیں۔ اقبال کے بعد اس سے کم تر درجے میں راشد، میرا جی، اختر الایمان، فیض اور احمد ندیم قاسمی کے بعد منیر نیازی اور ظفر اقبال کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ دوسری بڑی ترقی فکشن میں ہوئی ہے۔

پریم چند کے بعد سب سے بڑا نام منٹو کا ہے۔ پھر سیڑھیاں اترتے ہوئے ممتاز مفتی، بانو قدسیہ اور قرۃ العین حیدر چند نام ہیں لیکن اس میدان میں اردو ادب نے بہت ترقی کی ہے۔ غلام عباس اور کئی دوسرے اہم لکھنے والے ایک سے ایک اہمیت کے حامل ہیں۔ اردو ادب میں افسانے اور شاعری میں جو پیش رفت ہوئی ہے، اس کا مقابلہ دنیا کے بڑے سے بڑے لکھنے والوں سے کیا جا سکتا ہے۔

س: مجید امجد، شہزاد احمد، قتیل، فراز، اشفاق احمد، انتظار حسین؟

ج: ان میں سے میں انتظار حسین کو فکشن میں اہم حیثیت دیتا ہوں۔ اسی طرح مجید امجد کو باقی شاعروں کی نسبت بہت بڑا شاعر تسلیم کرتا ہوں۔ ادب کا لمبا span ہونے کی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ کچھ اور اہم نام بھی رہ گئے ہوں تاہم مجھے اس وقت اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ لکھ کر ادیبوں کا حاضری رجسٹر تو تیار نہیں کرنا ہے، سوائے اس کے کہ جو زندہ نام رہ گئے ہیں حافظے کی کمزوری کا سہارا لے کر ان سے معافی مانگ لوں۔ میرے استاد ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم نے سو سال کے جدید ادب کا جائزہ لیتے ہوئے آخر میں ادیبوں سے ایک گزارش کی تھی کہ جس کا نام رہ گیا ہو وہ اپنا نام خود شامل کر لے یا مجھے اطلاع دے دے تاکہ اگلے ایڈیشن میں تلافی کر سکوں۔

س: اردو طنز و مزاح بھی تو لکھا جا رہا ہے؟

ج: افسانے اور شاعری کے بعد تیسرے نمبر پر جس صنف میں خاصی کنٹری بیوشن ہوئی ہے وہ طنز و مزاح کا میدان ہے۔ پطرس بخاری سے لے کر ضمیر جعفری تک ناموں کی ایک لمبی کہکشاں ہے۔ رشید احمد صدیقی، کرنل محمد خاں، شفیق الرحمن، مشتاق احمد یوسفی۔

س: ان سے آگے جائیں تو.....؟

ج: چند اور ناموں کا اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ حاجی لق لق سے لے کر عطاء الحق قاسمی تک ایک لمبی فہرست ہے۔ طنز، مزاح اور پھکڑپن کے درمیان اتنا کم فراق ہے کہ لکھنے والوں کو اپنا آپ سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے لیکن اردو ادب کے اہم مزاح نگاروں نے یہ پل صراط عبور کیا ہے اور کامیابی سے عبور کیا ہے۔ ہمارے ہاں مزاح کو پھکڑپن اور جگت بازی کا ہم معنی سمجھا جانے لگا ہے جس سے آئندہ کے لیے کچھ اندیشے پیدا ہو رہے ہیں۔ خدا کرے کہ میرا احساس غلط ہو۔ مزاح نگاروں میں ایک نام مشفق خواجہ کا بھی آتا ہے۔ جس نے 'خامہ بگوش' کے قلمی نام سے مزاحیہ کالم لکھے، شاعری بھی کی اور تحقیق میں بھی نام کمایا اس کی یہ تینوں حیثیتیں اسے ایک بڑا تخلیق کار ثابت کرتی ہیں لیکن وہ اپنا قوال ہے جس کے طائفے میں تالیاں بجانے والے موجود نہیں۔ اس لیے ممکن ہے اردو ادب کا طالب علم اسے وہ مقام نہ دے جس کا وہ مستحق ہے۔

☆☆☆

نمونہ تحریر

عصری موضوعات (ایک پیش لفظ)

ڈاکٹر وحید قریشی

ادب کے عصری تقاضے اس لحاظ سے اہمیت رکھتے ہیں کہ اس سے لکھنے والے کے بنیادی سماجی حوالوں کا پتہ چلتا ہے۔ ادب میں شاعر اور نقاد کا سرمایۂ ادبی مجرد ادبی نکات تک محدود نہیں ہوتا۔ وہ معاشرے سے کچھ لیتا بھی ہے اور اسے کچھ دیتا بھی ہے۔ اس لین دین کا بلاشبہ ایک رُخ ادبی مسائل کے اس تار و پود سے بھی ہے جسے ادب برائے ادب کے شیدائی عموماً بیان کرتے ہیں، جس میں سماجی عوامل پس منظر میں ادبی مسائل و افکار پیش منظر میں رہتے ہیں۔ اور واضح طور پر پتہ نہیں چلتا کہ کس حوالے کا سماجی پس منظر کیا ہے۔ حسیات اور اعصاب کی کارکردگی پس منظر کو دھندلا دیتی ہے۔ یہ فکری رویہ بعض اوقات گرد و پیش سے غافل کر دیتا ہے اور انسان جذبات و احساسات کے سہارے تخیل کی وادیوں میں گھومنے لگتا ہے۔

ادب کو دیکھنے کا دوسرا رویہ ادب برائے زندگی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ادب زندگی کا عکاس ہے۔ ادب حقیقت پسندی کا مظہر ہے۔ ادیب اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس طرح کے بہت سے کلیے ہمارے ہاں رواج پا گئے ہیں جس سے ادب کو بیرونی نقالی تک بھی محدود کر دیا گیا اور ادب کا جو رشتہ فرد سے ہے اسے عموماً فراموش کیا گیا اور اب محض دکانداری ہو کر رہ گیا ہے۔ اس سوچ کے کچھ مثبت پہلو بھی ہیں۔ یہ سوال کہ ادب کیا محض ''بیرونِ در'' کی عکاسی ہے؟ بہت اہم ہے۔ کیا فرد کا رشتہ ماحول کے ساتھ اتنا ہی میکانکی ہے جتنا مذکورہ بالا نظریئے بیان کرتے ہیں؟ کیا ادب کا کام محض گرد و پیش کو من و عن بیان کرنا ہے یا اس میں تخلیق کار کا ذاتی حصہ بھی شامل ہوتا ہے؟ کیا فرد محض داخلی دنیا کا باشندہ ہے اور بحیثیت فرد معاشرے سے اس کا کوئی رشتہ ہے یا نہیں؟ کیا ادیب و شاعر کی حیثیت صرف ادبی ہے یا وہ کسی معاشرے کا انسان، کسی ملک کا شہری اور کسی دور کا حساس فرد بھی ہے؟ کیا فن کار کی داخلی زندگی اور اس کی خارجی زندگی دو الگ الگ دنیائیں ہیں جن میں باہمی تعلق کہیں بھی نمودار نہیں! کیا صاحبِ فن صرف عکاس ہے یا وہ معاشرے کو شعوری سطح پر کچھ دیتا بھی ہے؟

اس ''کچھ دیتا بھی ہے'' کی بھی کئی شکلیں ہیں۔ کیا وہ صرف دیتا ہے یا کچھ لیتا بھی ہے؟ دیتا ہے تو اس میں معاشرے کو بدلنے کی صلاحیت بھی ہے یا وہ محض ایک مبصر ہے؟ سرسید اور ان کے معاصرین معاشرے کو بدلنے والے کردار پر زیادہ زور دیتے تھے۔ رومانی دور کے لکھنے والے معاشرے کو ثانوی اور ذات کو بنیادی مانتے تھے اور کوئی

پیغمبرانہ تعین غیر ضروری جانتے تھے۔ ترقی پسند تحریک کے نام لیوا ادیب کو سماجی کھونٹے سے ساتھ ذرا زیادہ کس کر باندھتے رہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ادب اور پروپیگنڈے میں کوئی فرق نہ رہا۔ تخلیقی عمل جسے سماجی عوامل کا ضروری جز ہونا تھا اسے نظر انداز کر دیا گیا۔ ادیب اور سماجی لیڈر کے فرائض ایک ہو گئے جس سے کھوکھلے نعرے اٹھے اور "زندہ باد" "مردہ باد" سے ادبی فضا گونج اٹھی۔ اس سے بھی شاعر، افسانہ نگار، نقاد بھی متاثر ہوتے چلے گئے۔ ادب سے زیادہ "ادبی منشور" اہم ہو گئے اور ہم ایک دوسری انتہا پر جا نکلے۔ اس سماجی صورت حال میں نقاد سب سے زیادہ مشکل میں رہا۔ اب یہ سوال اہم ہو گیا کہ نقاد کی ادبی حیثیت اور اس کی سماجی کارکردگی کا تعین کس طرح ہو۔ ادب میں کمٹمنٹ کا مسئلہ، ادیب اور ملک سے وفاداری کا مسئلہ، ادیب کی غیر ممالک سے غیر ادبی رشتہ داریاں، یہ سارے سوال جہاں صاحب فن کے لیے اہم ہیں وہاں نقاد کے لیے سوہانِ روح رہے۔

نقاد، ادیب، افسانہ نگار، ڈرامہ نویس، شاعر کا اپنے ملک کے ساتھ کیا رشتہ ہے؟ کیا اس رشتے کی تعبیر ان سے بطور ایک شہری کے ہوگی یا ان کے فن سے بھی اسی طرح کا مطالبہ ممکن ہے۔ یہ سوالات "ازموں" (isms) کے طوفانی چکر میں کچھ زیادہ ہی تند و تیز رہے۔ اگر شہری اور ملک کا ہر باشندہ ملکی سالمیت کا نگراں و محافظ بھی ہے تو کیا یہ مطالبات فن کار اور نقاد سے بھی کیے جا سکتے ہیں یا نہیں؟ مسائل کی ان ڈوریوں کے لچھے خاصے الجھ جاتے ہیں۔ جب معاشرہ ایک طرف جا رہا ہو اور ادب بالکل دوسری سمت روانہ ہو چکا ہو۔ ملکی تقاضے کچھ اور ہوں اور ادبی منظر نامہ کچھ اور کہانی بیان کرنے لگے۔ تضادات، منافقت کے درجے پر جا پہنچیں تو پھر یہ سوال کہ معاشرے کا حق کیا ہے اور عام شہری کا کردار کیا ہے اور ادیب و شاعر کا الجھن کیا بنے گا؟؟ یہ ڈھیر سارے سوالات فکر و نظر کے ایک سے زیادہ زاویے پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید کے "عصری موضوعات" ان کے دوسرے مضامین میں بیان کردہ مسائل سے اپنی نوعیت کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ عصری مضامین میں انھوں نے ادبی مسائل کو فنی اور تکنیکی حوالوں سے بیان نہیں کیا بلکہ ملکی و مسائل کے حوالوں سے بیان کیا ہے۔ انھوں نے صرف ان مسائل پر قلم اٹھایا ہے جو ہر پاکستانی کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں اور ہر ادیب سے ان کا جواب مانگتے ہیں۔ ادیب، ادیب ہونے کے ناطے معاشرے کا حصہ بھی ہے تو پھر نقاد کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ ان مسائل کو بھی بیان کرے جن سے گریز عموماً اس لیے کیا جاتا ہے کہ "کبوتر" اس لیے اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے کہ اسے بلی دکھائی نہ دے۔ منافقت کے معاشرے میں حق گوئی جان جوکھوں کا کام ہے اور حق گوئی کو ادبی اور فنی اقدار کے ساتھ مربوط کرنے کا عمل تو اور بھی زیادہ کٹھن ہوا کرتا ہے۔

عصری مقالات کا رشتہ انور سدید کے دوسرے مقالات سے کیا ہے؟ دوسرے مضامین میں بیان کردہ صداقتوں کا سماجی پس منظر تو اس کتاب میں اجاگر ہوا ہے مگر اب تو ان کے سارے علمی اور ادبی سرمائے کو ان حقائق کے حوالے سے از سر نو دیکھنا پڑے گا کیونکہ ان کی دوسری کتب میں بعض ضمنی اور ذیلی اشارے جس تناظر پر مشتمل تھے وہ تو

واضح طور پر یہی کتاب مہیا کرتی ہے۔

انور سدید نے ان مضامین میں پاکستانی ہونے پر کسی شرمساری کا اظہار نہیں کیا۔ وہ کھل کر بات کہتا ہے اور قاری سے بھی توقع کرتا ہے کہ پاکستان جن علمی و ادبی اور سماجی معاملات سے دوچار ہے، ان پر کسی منافقت کے بغیر غور و فکر کیا جائے۔ نتائج سے اختلاف ممکن ہے لیکن جو بنیادی فکری رویہ بیان ہوا ہے، اس کی صداقت کو تسلیم کیے بغیر فرد اور معاشرے کے رشتے کی وضاحت ممکن نہیں۔

ہر ملک کی سالمیت کا انحصار اس کے وجود کی صداقت پر منحصر ہے جہاں ادیب اور معاشرے میں بُعد نمایاں ہو چکا ہو اور خود ملکی سالمیت اور ملکی تشخص کا مسئلہ بھی اختلاف رائے کی زد میں آ جائے وہاں حق گوئی کے بیان کے لیے نعرۂ مستانہ کی بھی ضرورت بہر حال رہتی ہے۔ انور سدید کے عصری مضامین ادبی سطح پر ایک نعرۂ مستانہ ہی تو ہیں۔

پاکستان کا مطالبہ کن عوامل پر مبنی تھا، حصول پاکستان کے بعد کی صورت حال ملکی تشخص اور ملکی مسائل کی تعبیریں سوچ کے کون کون سے نئے راستے سامنے لائی...... بعض اوقات کثرت تعبیر سے بھی اصلی تصویر دھندلا سکتی ہے اور ادیبوں نے اب تک اس ڈگر پر چل کر مسائل کو سلجھانے کی بجائے اُلجھانے کی سعی کی ہے۔ اس سے فکری دنیا ''آگاہی'' سے زیادہ ''ناآگاہی'' کی دنیا بنتی چلی جا رہی ہے۔ ہمارے ادیب نے خارج سے رشتہ قائم کرنے میں جس تساہل سے کام لیا ہے اس سے من حیث المجموع ادب کو بھی نقصان پہنچا ہے اور معاشرے کو بھی۔ فرضی مسائل اور فرضی حقائق کی مدد سے جو ''یوٹوپیا'' تعبیر کیا گیا اس کا اصل سے دور کا تعلق بھی نہیں تھا۔ ہمارے اکثر ادیب ''کتابی علم'' کے ذریعے جیتے رہے اور یہ کتابی علم، علم و تقلید غیر کا علم تھا۔ اس میں گرد و پیش کے نقوش خاصے مدھم رہے۔ اس لیے اخذ کردہ نتائج بھی فرضی اور قیاسی بن گئے۔ انور سدید پاکستانی معاشرے کے داخلی کرب سے آشنا ہیں۔ انھیں حقائق کی تلاش و جستجو ہے۔ وہ پاکستان کے بنیادی فکری رجحانات کے حوالے سے ادب کو جانچنے کی سعی کرتے ہیں اس لیے روایتی ترقی پسندوں کے مقابلے میں ان کے بیان کردہ حقائق اصل سے زیادہ قریب ہیں اور ان مقالات کا جواز بھی ہے۔

اس طرز کی بنیادی لہر ایک پاکستانی کی ہے۔ انور سدید پاکستان کے وجود کو جغرافیائی سطح پر ہی نہیں، فکری اور جذباتی سطح پر بھی قبول کرتے ہیں اور اس کا رشتہ عصری تقاضوں سے ملاتے ہیں۔ وہ پاکستان کی سرحد کو ایک عارضی دیوار اور اس کے وجود کو دو حصوں میں تقسیم کرنے والی حد بندی کو عارضی قرار نہیں دیتے۔ وہ اسے مستقل اور قطعی تسلیم کرتے ہوئے ادب اور سماجی منظر نامے کو بیان کرتے ہیں۔ پاکستان کو قومی زبان اور اس کے مسائل انھیں لسانی اور تکنیکی امور تک لے جاتے ہیں۔ عصری تقاضے، عصری آگاہی، ادیب اور نظریۂ پاکستان، جدید ادب میں پاکستانیت کے مضمرات اور تخلیقی عمل سے ان کا رشتہ ...... یہ وہ فکری دھارے ہیں جو اس کتاب کا

اساسی موضوع ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی ابتدائی کتابوں میں یہ نقوش دھندلے تھے لیکن جیسے جیسے ان کے ہاں ادب و وسیع تر تناظر میں دیکھنے کا شعور بڑھا ہے اس سے ان کی پاکستانیت بھی گہری ہوتی چلی گئی ہے۔

انور سدید ادب کا طالب ہے، اسے معلوم ہے کہ جغرافیائی حدود سے باہر بھی اردو زبان دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی زندہ و سلامت ہے۔ وہ اس ادب کو رد کر کے قومی قطب مینار تعمیر کرنے کا قائل نہیں۔ اس نے ادب کے ان دھاروں کو بھی تسلیم کیا ہے اور ان سب کے درمیان قومی تشخص کے حوالے سے اردو زبان و ادب کی اہمیت کو بھی اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔ اس سے اردو ادب کے وہ رشتے ابھرے ہیں جن کا تعلق جغرافیے اور نظریاتی حقائق کے ساتھ ہے۔ وہ حقائق کو ان کے اصل حوالوں ہی سے دیکھتا ہے۔ "مانگے تانگے کے اجالے" اس کے ہاں زیادہ پر کشش نہیں۔ وہ نقاد ہے اور مسائل اور حقائق کی دوبارہ چھان بین کرتا ہے۔ وہ محض مسلمات پر بھروسہ نہیں کرتا۔ جہاں جہاں اسے کھانچے نظر آتے ہیں ان کا برملا اظہار کرتا ہے۔ جہاں جہاں اسے حقائق کی مسخ شدہ صورتیں دکھائی دیتی ہیں وہاں اس کا قلم زیادہ تند و تیز بھی ہوتا ہے۔ ایسے میں وہ فقرے بازی سے گریز نہیں کرتا لیکن عموماً اس کا لہجہ نرم اور انداز بیان سنجیدہ ہے۔ وہ پیشے کے اعتبار سے انجینئر ہے۔ اس سے اس کے ہاں دو ٹوک بات کہنے کا سلیقہ پیدا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ جذباتی بھی ہے۔ "بے پناہ توانائی" کے اُبلتے ہوئے چشمے کبھی کبھی تو آتش فشانی پر بھی اتر آتے ہیں، لیکن اب عمر کے ساتھ ساتھ اس کے ہاں اُبال کی کیفیت کم ہوتی جا رہی ہے۔ سبب شاید یہ ہے کہ اس "فاضل توانائی" کو اس نے اخباری کالموں میں ڈھال لیا ہے یا پھر تاریخ ادب کے وسیع تر مطالعے نے اس کی شخصیت کو نکھار دیا ہے اور اس میں وسعت و رفعت کے رنگ اُبھر آئے ہیں۔ بہر حال اس کا قلم توازن کی طرف تیزی سے رواں ہے جس سے پختگی فکر اور سنجیدگی نظر کا پتہ چلتا ہے۔

عصری موضوعات بلاشبہ انور سدید کی تنقیدی کارگزاری کا ایک اہم اور پائیدار رخ ہے۔

☆☆☆

نظمیں

ڈاکٹر وحید قریشی

خستگی

نہ جانے کون سی بستی میں جا کے دم لے گا
یہ رفعتوں سے اُبھرتا ہوا سیاہ دھواں
خمارِ نیم شبی ہر طرف ہے سایہ فگن،
ہر ایک سمت فضاؤں میں تیرگی ہے رواں

خموشیوں کے سلگتے ہوئے یہ آنچل
مہیب رات کے سینے پہ تار تار ہوئے
جمود وادیٔ تاریک میں ہوا مدغم
کبھی حیات کے آثار رہ سپار ہوئے

فلک کے سو گئے تارے فضا کے دامن میں
نظر کے سامنے بکھری ہوئی ہے کاہکشاں
خیالِ عارضِ تاباں نہ یادِ صحبتِ دوست
بھٹک رہا ہے نہ جانے مرا خیال کہاں

گئے وہ دن کہ محبت سے ہمکنار تھا میں
گئے وہ دن کہ تھی وابستہ ان کے نام سے زیست
گئے وہ دن کہ فسردہ تھی کائنات مری
کنارہ کش ہوئی آخر خیالِ خام سے زیست

مرا وجود سہارا بنا ہے میرے لیے
ہر ایک راہ پہ لذت کی بھیک مانگی ہے
فریبِ عشق نے بے تابیاں مجھے دی تھیں
ہر ایک شخص نے آسودگی عطا کی ہے

کچل کے رکھ دیا احساسِ دوستی میں نے
ترا خیال مگر پھر بھی جلوہ کار رہا
ترا خیال تھا، لذت تھی، انتقام بھی تھا
لٹا شباب تو یہ بھی طلسم ٹوٹ گیا

مری نظر میں ہیں اب تک مزارِ الفت کے
نہیں نہیں مجھے اب حسرتِ گناہ نہیں
سکوتِ عشرتِ ماضی پہ خندہ زن ہی سہی
فریب خوردہ نظر کو کسی کی چاہ نہیں

رقص

جل پری رقص کناں
ہلکا ہلکا سا فضاؤں میں سرور
عود و عنبر سے رچی خلوت میں
میرے جذبات کو سہلاتا ہوا اک طوفاں

آس کے پاؤں سرِ شام ہی بوجھل بوجھل
وادیٔ شوق میں اک گرم بہار
اور ترا جسم مہکتی گلزار

تو یہ کہتی ہے تو سچ کہتی ہے
اب یہاں میں نہ کبھی آؤں گی

تارِ حریرِ دو رنگ

ڈاکٹر وحید قریشی

۱

دور تا جوانی کا
عمر کی روانی کا
خود روی بہانہ تھی
حرف محرمانہ تھی
جب حال کی دنیا
ماہ و سال کی دنیا
جو گزرتی جاتی تھی
صبح مسکراتی تھی
زندگی کے میلے تھے
تند و تیز ریلے تھے
خواب کے جزیروں میں
عیش کے وطیروں میں
حوصلے نہیں ٹوٹے
سارے خوف تھے جھوٹے
خوف مٹتے جاتے تھے
جسم گنگناتے تھے

۲

سین پھر بدلتا ہے
وقت ہاتھ ملتا ہے
تیرگی ستاتی ہے
شام ڈھلتی جاتی ہے
اشک دیدۂ غم میں
کیا رہا ہے اب ہم میں
داغ داغ سینہ ہے
پھر بھی ہم کو جینا ہے
خوفِ مرگ ہے طاری
شاید آ گئی باری
وقت کا وفینہ کیا
یاد کا قرینہ کیا

☆

تنہائی

ڈاکٹر وحید قریشی

چھا رہا ہے غبارِ تنہائی
اے اسیرِ دیارِ تنہائی
دل بھی درد و الم سے نالاں ہے
جاں بھی ہے سوگوارِ تنہائی
کون ہوتا ہے اس اندھیرے میں
مونس و غم گسارِ تنہائی
آج سینے میں سر اٹھاتا ہے
شعلۂ بے قرارِ تنہائی
دل کے زخموں کو چاک کرتا ہے
دیدۂ اشک بارِ تنہائی
جاں کنی کا عذاب ہے پیہم
تلخیِ روزگارِ تنہائی
سوچتا ہوں کہیں اماں مل جائے
دل شکارِ فشارِ تنہائی
میری تنہائیاں پکارتی ہیں
تو کہاں ہے نگارِ تنہائی

☆☆

دوہے

ڈاکٹر وحید قریشی

☆

برہ اگن نے آئے کے، چھین لیا سکھ چین
پی پہنچے پردیس میں، میں روؤں دن رین

☆

باتیں کل من بھاونی، ہردے زہری ناگ
نگری کپٹ کرودھ کی، مورکھ پھوٹے بھاگ

☆

پی کی نگری آئے کے، من میں لاگے گھاؤ
ہم بیٹھے جی ہار کے، دھرے رہے سب چاؤ

☆

آشا جس سے جی اٹھے، ایسا حال سناؤ
ہاتھ کی ریکھا دیکھ کے، من کی بات بتاؤ

☆

چتون تیز کٹار سی، سندر کومل گات
جوبن سکھ کی سیج ہے، کون بڑھائے بات

☆

گیانی ہو گنوان ہو، ایسے شبد سناؤ
سلگے آگ شریر میں، دہکے من کا الاؤ

☆☆

ڈاکٹر وحید قریشی

اہلِ دنیا بدل گئے ہوں گے
قد سے آگے نکل گئے ہوں گے

بستیوں کے چراغ روشن ہیں
شام کے سائے ڈھل گئے ہوں گے

ان دنوں وادیٔ محبت میں
کتنے موسم بدل گئے ہوں گے

دل زندہ، دیارِ الفت میں
کتنے لمحے نکل گئے ہوں گے

تیرے سینہ فگار سوچتے ہیں
دن مصیبت کے ٹل گئے ہوں گے

دیکھ کر اہلِ دل کی سادہ دلی
جلنے والے تو جل گئے ہوں گے

آ پڑا جب کسی سے کام وحید
دوست آنکھیں بدل گئے ہوں گے

☆

ڈاکٹر وحید قریشی

زمانہ پھر نئے سانچے میں ڈھلنے والا ہے
ذرا ٹھہر کہ نتیجہ نکلنے والا ہے

ابھی ہجومِ عزیزاں ہے زیرِ تختِ مراد
مگر زمانہ چلن تو بدلنے والا ہے

ہوئی ہے ناقۂ لیلیٰ کو ساربان کی تلاش
جلوس شہر کی گلیوں میں چلنے والا ہے

ضمیر اپنی تمنا کو پھر اگل دے گا
سمندروں سے یہ سونا اچھلنے والا ہے

نیا عذاب، نئی صبح کی تلاش میں ہے
یہ ملک پھر نیا قاتل بدلنے والا ہے

صدائے صبح بشارت خبر سنائے گی
سلگ رہا تھا جو سینہ وہ جلنے والا ہے

نئے عذاب کی آمد ہے اور ہم ہیں وحید
عذاب دورۂ حاضر تو ٹلنے والا ہے

☆☆☆

ڈاکٹر وحید قریشی

ہم نے کچھ دن زندہ رہنے کا ارادہ کر لیا
یعنی فرطِ شوق میں کچھ کچھ زیادہ کر لیا

جن کی روپوشی سے قائم تھیں حکایاتِ وفا
اہلِ دنیا نے انھیں کو بے لبادہ کر لیا

جس کی خاطر ہم نے ساری زندگی برباد کی
طے سفر یاروں نے خود ہی پا پیادہ کر لیا

خود کو کر لیں گے اسیرِ جام و بادہ ایک دن
بیٹھے بیٹھے یار لوگوں نے ارادہ کر لیا

زندگی کو یوں بسر کرنا کوئی آساں نہ تھا
سوچتے ہیں کس لیے آخر زیادہ کر لیا

ہم حسابِ بیش و کم میں دیر تک اُلجھے رہے
کرنے والے نے تو پل بھر میں ارادہ کر لیا

زندگی نے سانس لینے کی ہمیں مہلت نہ دی
زندگی کو پیش کر ہم نے ارادہ کر لیا

☆

جفائے دوست کی ارزانیوں کی بات نہیں
مری وفا سے بھی خونِ جگر پیا نہ گیا

گلی گلی میں اصولوں کی جنگ جاری ہے
دریچے بند ہیں سارے کہ سنگ باری ہے

اٹھو ندائیں سناؤ سکوتِ شب ہے ابھی
کہ مومنوں کے لیے یہ بھی رات بھاری ہے

نئی بساط بچھی ہے، نئے نئے مہرے
سنا ہے شاہ کی گردش میں پھر سواری ہے

یہ کون آیا ہے تلوار لے کے بستی میں
پرندے پوچھ رہے ہیں کہ کس کی باری ہے

رُکو رُکو کہ ابھی تک قضا نہیں آئی
ابھی نہ جاؤ کہ دنیا ابھی ہماری ہے

چڑیلیں رات کے استھان پر ہیں نوحہ کناں
یہ کیسی شب ہے یہاں کیسی آہ و زاری ہے

ہر ایک شخص ہراساں یہ ظلمتِ شب ہے
ہر ایک شخص کے پردے میں خوف طاری ہے

جہانِ تازہ ہے اپنے سراب میں غلطاں
شبِ سیاہ کا ظلم و ستم تو جاری ہے

ابھی تو محملِ گل ہے طلسمِ زارِ حیات
نتیجہ آپ ہی نکلے گا پاؤں بھاری ہے

اُداس بچے جو بیٹھے ہیں تنگ گلیوں میں
انھیں بھی اپنے عزیزوں کی انتظاری ہے

ڈاکٹر وحید قریشی

غم کے ہاتھوں (شکر خدا ہے) عشق کا چرچا عام نہیں
گلی گلی پتھر پڑتے ہوں ہم ایسے بدنام نہیں

وہ بھی کیا دن تھے جن روزوں بے فکری میں سوتے تھے
اب کیسی افتاد پڑی ہے چین نہیں آرام نہیں

دل کے اجڑتے ہی آنکھوں نے حیف یہ عالم دیکھ لیا
جلوہ سر رہ کوئی نہیں ہے کوئی بروئے بام نہیں

جس کے اثر سے بے خود ہو کر اپنے تئیں ہم رسوا ہوں
موجِ مے گل کے ہاتھوں میں ایسا کوئی جام نہیں

دل کا رونا دل کا کھونا لاکھ عذاب الیم سہی
ہمت ہار کے بیٹھ ہی جائیں ہم ایسے ناکام نہیں

بھول گئے الفت کے ترانے
آخر ہار گئے دیوانے

موسمِ گل ہو یا کہ خزاں ہو
دونوں ہیں رونے کے بہانے

زیست میں وہ لمحہ بھی آیا
دل آباد آنکھیں ویرانے

کب تک ساتھ ہمارا دیں گے
خوابوں کے یہ تانے بانے

غم کی گھڑیاں کیف بداماں
خوشی کے لمحے جھوٹے بہانے

تین شعر

لوگ ماتھے پہ لکھ کے لائے ہیں
داستاں اپنی پارسائی کی

دشمنوں کے کفن اتار لیے
دوستوں نے بڑی کمائی کی

سر سلامت رہے امیدوں کا
خیر ہو کاسۂ گدائی کی

فارسی غزلیں

ڈاکٹر وحید قریشی

تو چه می دانی چه طرز شاعری داریم ما
در رگ هر شعر نبض زندگی داریم ما

تو چرا از چشم ما مستور می مانی بیا
با تو ربط خاص ای سرو سهی داریم ما

ما نمی خواهیم بر رویت نقاب تیره رنگ
جلوه های بی محابا را خریداریم ما

ما ز وصل تو بسی گل های لذت چیده ایم
تا نه پنداری که دامان تهی داریم ما

ذوق ما را آب و رنگ تازه بخشیده است
آن بت سیمین که در آغوش می داریم ما

☆☆

سخنی که شعله ریزد به مذاق پخته کاران
عجب این که در نه سازد به رضای شهریاران

بجمال مه جبینی نرسم گرفته رنگی
نه بذوق هم نشینان نه بذوق دوستداران

سزد این که خویشتن را به عذاب کشته باشی
که دلت اثر نگیرد ز جمال گلعذاران

بشود که درد هجران سر و سینه را بسوزد
گل نغمه گر نیابم ز منتهی بهاران

مگر این که می نه تپید که ز بزم رفته باشم
چه کنم که خوش نیاید ره و رسم خامکاران

☆☆

دوہے

ڈاکٹر وحید قریشی

ملک کا کیا انجام ہو، رکھو بات کو گول
پوری کر لو حسرتیں، ہاتھ میں لے کشکول

پھیلے ہوئے ہیں دور تک، عمر رواں کے کھیت
لپٹ رہی ہے پاؤں سو، صحراؤں کی ریت

چاندنگر میں دور تک، گہرے گہرے غار
کالی ٹھنڈی ریت پر، چاندی کے کچھ تار

نیند کے جھونکے لے گئے، خواب نگر کے پار
دیکھی دنیا اور ہی، جادو روپ نکھار

پہلے تو انکار تھا، پھر دھیما اقرار
بیچ میں حائل ہو گئی، مذہب کی دیوار

اپنے گھر کی زندگی، سکھ کا سانس اور پیار
کیف و سرور کی نعمتیں، خوشیوں کے انبار

رات کی ٹیڑھی شاخ پر، اٹک گیا مہتاب
سب نے یکجا کر لیے، اپنے اپنے خواب

آؤ کبڈی کھیل لیں، چٹیل ہے میدان
ایسے اجڑے دیس کا، ملنا نہیں آسان

اردو ادب میں آج کل، کہاں رہی ہے جان
شعر ظفر اقبال کے، میاں غنیمت جان

دنیا کے جنجال میں، الجھے رہے دن رات
لوٹے خالی ہاتھ ہم، خوب ملی سوغات

کی سرکار کی نوکری، رہے ہمیشہ داس
کہیں ضمیر نہ جاگ اٹھے، سدا رہا وسواس

فون پہ قیمت پوچھ لی، کتنے کا ہے کریٹ
پہنچے جب بازار میں، بدل چکا تھا ریٹ

نو سو چوہے کھائے کے، بلی چلی حجاز
نو سو دوہے کہہ چکے، چلو پڑھیں نماز

طوطے سارے ملک کے، بولیں ایک زبان
وہی کتھا دہرائیں وہ، جو بولے ججمان

عالی سرسی چھند میں، دوہے کہیں کمال
ہم نے دوہا چھند میں، کہہ دیا من کا حال

بھیجا ایسا پلپلا، سنے نہ کوئی دلیل
دل کا پتھر شخص ہے، جیسے سنگِ میل

تجھ کو ڈھونڈا ہر جگہ، اور لوٹے ناکام
تو جانے کس دیس میں، کرتا ہے آرام

بھاگڑ مچی ہے شہر میں، کون ہے کس کا یار
کاروبار ہے لوٹ کا، ہاتھ میں ہے تلوار

''زندہ ہوں تمھاری آواز کے ساتھ''

جرمن: JORG STEINER ترجمہ: شمیم منظر

اب میری ان سے جان پہچان ہو گئی تھی۔ مونیک ایک بورڈنگ اسکول سے گھر واپس آئی تھی۔ ڈوورپز اور ڈولی جنھوں نے بہ ظاہر ہاتھ اور ناخن کی صفائی کرنے والیوں کا روپ دھارا ہوا تھا لیکن حقیقت میں دونوں خواتین، مردوں کو خوش کرنے کے لیے وہاں رہتی تھیں۔ ایک رنگا بھرا جوڑا جو سیلویشن آرمی کے ہوسٹل میں رہائش پذیر تھا اور ایک معمر خاتون جس کے پاس کتے تھے جنھیں قریبی میدان میں رفع حاجت کے لیے پھرانے لے جاتا تھا اور وہ اپنے دانتوں کو بھینچ غراتے تھے۔ یہ میرا پہلا کام تھا وہاں۔

میرا روزانہ کا معمول یہی تھا۔ ایک مرتبہ گرٹ نے مجھے دروازے پر پکڑ لیا۔ اس کے ہاتھ میں بھیگا ہوا تولیہ تھا جسے وہ ہلا رہا تھا۔ ''وہ لوگ تمھیں تلاش کر رہے ہیں۔'' اس نے کہا۔ گرٹ عورتوں کے میک اپ کیا کرتا تھا اور عمر رسیدہ خواتین کی تنہائیوں کو دور کرتا تھا۔ وہ انھیں اپنی عریاں تصاویر بھیجتا اور خواتین جب اس کے سیلون میں آتیں تو مسز لیڈرمن انھیں دیکھ کر معنی خیز انداز میں سر ہلاتیں۔ ''وہ تمھیں تلاش کر رہے ہیں۔'' اس سے زیادہ اس نے کچھ نہیں کہا۔ اسے میری کہانی پر یقین نہیں آیا جو مسز لیڈرمن کے مطابق سب سے اچھی تھی۔ اسے روسیوں کے پاس سے فرار ہو جانے والے ہنگری کے طالب علم پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ آزاد سوئٹزرلینڈ میں میرا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ وہ مجھے ریڈیو پر آنے والی اس خبر کے بارے میں بتا رہا تھا جو میری تلاش کے بارے میں تھی۔ اسی لیے میرے یہاں رہنے کے بارے میں خاموش رہنے کے لیے کہا گیا تھا۔

اب میرے پاس کوئی راستہ نہیں تھا، سوائے اس کے کہ میں گرٹ سے سمجھوتہ کر لوں۔ سمجھوتے کے مطابق یہ طے ہوا کہ وہ اس وقت تک خاموش رہے گا جب تک میں اس کے کام کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کرتا رہوں۔ اس سمجھوتے کے بعد ہمارے درمیان دوستی کا رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ گرٹ کا تعلق کسی گروہ سے نہیں تھا جس میں میری شمولیت ہونے والی تھی۔ جب وہ مسز اوبرہاؤزن سے بنیے ڈانس کی کلاس لے کر گھر آتا تو سیڑھیوں کی صفائی کرنے، پالش کرنے اور قالین کی صفائی کرنے میں میری مدد کرتا تھا۔ اس نے شہر کی سیر بھی کرائی تھی۔ دوپہر کے وقت ہم خبروں میں تلاش گمشدہ کی اطلاعات سنتے تھے۔

لوگ میرے پیچھے لگے تھے۔ وائرلیس آپریٹرز کو میرے بارے میں معلوم ہو چکا تھا۔ زیورچ کے

پبلشنگ ہاؤس کے مالک نے مجھے کائی ڈے بیلر کے اسٹیشن پر گھومتے ہوئے دیکھا تھا۔ کشتیوں کے ملاح لمبے بانسوں کو پانی میں گہرائی تک ڈبو رہے تھے۔ غوطہ خور پانی کے اندر تلاش جاری رکھے ہوئے تھے۔ ابھی تک کسی انعام کا اعلان نہیں کیا گیا تھا۔ گاؤں کے رہنے والے ایک شخص نے کہا تھا کہ جب طوفانی موسم تھا تو اس نے نحیف آواز سنی تھی۔ کوئی مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ اس وقت وہ اپنے جال کی مرمت کر رہا تھا۔ لہٰذا وہ سمجھے کہ پانی میں میری موت واقع ہو چکی ہے۔

وہ ہفتے کا دن تھا جب میں نے ڈولی کو پیار کرنے کی کوشش کی تھی اور رات کے کھانے کے بعد اس کے پیچھے سیڑھی چڑھتے ہوئے اس کے کمرے میں گھس گیا تھا۔ میرے ہاتھ سرد پڑ چکے تھے۔

''بستر پر بیٹھ جاؤ۔'' اس نے کہا۔'' کیا یہ پہلی بار ہے؟''

یہ پوچھتے ہوئے وہ بالکل نہیں ہنسی۔ جیسا کہ مجھے یاد ہے مجھے کسی ہنسی یا مذاق اڑانے کا احساس نہیں ہوا تھا۔ اس کی آواز میں بھی نہیں۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ پانی بہہ رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ دھوئے۔ یہ ممکن ہو سکتا تھا کہ وہ ہنستی لیکن نہیں، اس نے تو بس یونہی پوچھ لیا تھا۔ پھر اس نے تولیہ ہاتھ میں لے لیا۔ وہ جب میرے قریب سے گزری تو میرا خوف غائب ہو چکا تھا۔ چھت کے بلب کی روشنی آنکھوں میں نہیں چبھ رہی تھی۔ سامنے پڑا آئینہ اور گھومنے والی کرسیاں اپنی اہمیت کھو چکی تھی۔ میں اس کے ساتھ بہت خوش تھا۔

میں نے کہا،'' کیا میں تمھیں دیکھ سکتا ہوں؟''

وہ میرے سامنے اپنے ہاتھوں کو ڈھیلا چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

''دیکھو۔'' اس نے کہا۔

''تم بہت خوبصورت ہو۔''

اس نے اپنے سر کو آئینے پر لگا دیا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ پھر وہ اچانک میری طرف متوجہ ہوئی۔

''کیا اب ہم ایک دوسرے کے ساتھ سو سکتے ہیں؟''

جواب کا انتظار کیے بغیر وہ بستر پر لیٹ گئی۔

''الماری میں ایک موم بتی ہے۔'' اس نے کہا،'' ضرورت پڑ جاتی ہے۔''

مجھے موم بتی اور ماچس مل گئی۔ لیکن تپائی پر لگا مسالہ گیلا تھا اور چپک رہا تھا۔ چینی کے بنے ہاتھی کی کمر پر سویڈش ماچس کی ڈبیہ پڑی تھی۔ اب موم بتی جل رہی تھی۔ میں نے ڈولی کو بھینچ لیا اور اس کے گرم جسم کو محسوس کرنے لگا۔ میں اس کی خوشبو سونگھ رہا تھا۔ وہ رات واحد رات تھی ..... ڈولی کے ساتھ۔

اگلے دن کوئی بھی گاہک نہیں آیا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیا تھا۔ میں دروازے پر دستک دیتا رہا۔ اس کے دروازے کو ہلاتا رہا، پکارتا چلاتا رہا تو اس نے صرف ایک بات کہی:

"چلے جاؤ۔"

جہاں تک میرا تعلق ہے، میں اس آواز کو پہچانتا ہوں۔ کوئی آواز۔ لوہے کا گلاس پر پڑتا ہے۔ تھما مٹی
یا ہوا انگور؟ جو گلاس پر گرتا ہے اور پھر شیشے کی کرچیوں اور اس کے گرد سے اٹھتی آواز۔

میں وہاں سے چلا آیا۔ اپنے بستر پر لیٹ گیا لیکن نیند دور بھاگ چکی تھی۔ میرے اندر غم و غصہ بھرا ہوا
میری سانسیں زور زور سے چل رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا میرا دم گھٹ جائے گا۔۔۔ ڈولی، میں تم سے تمھاری
واز سے پیار کرتا ہوں۔ پیار کرتا ہوں تمھیں چھو لینے کے احساس سے۔۔۔ تم کہاں ہو گی جب میں تمھیں تلاش
روں گا۔۔۔ کیا اسی طرح کسی جگہ پڑی ہو گی اپنے پھوہڑپن کے ساتھ جب کہ میرے پھوہڑپن کو تم برداشت نہ کر
تیں۔ حالانکہ تم جانتی ہو کہ تمھارے گلے پر جلنے کے نشان کو میں پہچان جاؤں گا۔۔۔ مجھے معلوم ہے تم ایسی نہیں
و گی جیسی کہ آج ہو۔ میں تمھیں دوبارہ کبھی حاصل کرنا نہیں چاہوں گا۔۔۔ پہچاننا نہیں چاہوں گا۔۔۔ تم سے محبت کرنا
ہیں چاہوں گا کیونکہ میں تم سے صرف اس وقت تک پیار کرتا ہوں جب تمھیں گرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ اس لمحے تک
ب کہ میں لکھ رہا ہوں۔ تمھیں موت کے منھ میں جاتے دیکھ رہا ہوں۔ تمھاری تصویر سخ ہوتے دیکھ رہا ہوں۔
رف تمھاری آواز میرے پاس ہے جو تمھاری یاد دلاتی ہے۔ لیکن تمھیں دوبارہ زندہ نہیں کر سکتی۔۔۔ میں جانتا ہوں
نے بھی مجھ سے پیار کیا تھا۔۔۔!!

اس لیے میں نے جو لکھا ہے اس پر خاموشی اختیار کی جائے تا کہ یہ بھی تمھارے خلاف شہادت کے
ور پر استعمال نہ ہو۔ ایسا نہیں ہے کہ میں اس تحریر سے آزادی چاہتا ہوں۔ انھوں نے ہمیں الگ کر دیا ہے۔ مجھے قید
یں ڈال دیا۔

اپنے ایک خط میں کوشش کروں گا تمھیں جو ایک خوشبو کی مانند ہے جس میں حرکت نہیں، اپنے
واسوں میں سمو لوں: پائپ سے آنے والی گیس کی بو، کپڑوں کے جوتوں سے نکلنے والی بو، میں اس روشنی کو بیان
روں گا، ٹی بی پیدا کرنے والی روشنی کو۔ میں تمھیں خط کیوں لکھوں؟ میں رپورٹ لکھوں گا اور تمھاری آواز کو اپنے
س رکھوں گا۔ جب میں اپنے آپ کو ایسی حالت میں پاؤں گا جس میں احساس الجھے ہوئے ہوں تو تمھاری آواز
سے زندہ ہو جاؤں گا۔

☆☆☆

ظہیر غازی پوری، اردو دوہے: ایک تنقیدی جائزہ کی روشنی میں

ڈاکٹر شمیم ہاشمی

ظہیر غازی پوری کی تصنیف ''اردو دوہے۔ ایک تنقیدی جائزہ'' کے پہلے پانچ ابواب نہایت ہی اہم اور معلومات افزا ہیں اور پورے نظم و ضبط کے ساتھ تحریر کیے گئے ہیں۔ ان ابواب کو اس کتاب کا مغز کہا جا سکتا ہے۔ چھٹا باب بعنوان ''چند متنازعہ فیہ دوہے'' کی نوعیت تحقیقی ہے۔ بقول ڈاکٹر انور سدید:

> ''چند متنازعہ فیہ دوہے'' کے عنوان کے تحت ظہیر غازی پوری صاحب نے خوب داد تحقیق دی ہے اور تلاش حقیقت و جستجوئے صداقت کے لیے انھوں نے عملی طور پر محنت بھی بہت کی۔''
>
> (سبق اردو۔ فروری/مارچ ۲۰۰۶ء)

اور اس کے بعد جمیل الدین عالیؔ، بھگوان داس اعجازؔ، نذیر فتح پوری، فرازؔ حامدی، ڈاکٹر اُدے شنکر ارمانؔ اور شادؔ باگلکوٹی کی دوہا نگاری سے بحث کی گئی ہے۔

پہلے پانچ ابواب ''اردو دوہے۔ ایک تنقیدی جائزہ'' ''اردو دوہا فنی لسانی اور تاریخی تناظر میں''، ''دوہا اردو عروض کی میزان پر''، ''دوہا میں ہیئتی اور صنفی تجربوں کی اہمیت'' میں مصنف نے ابتدا سے آج تک دوہا کا تدریجی ارتقا، اس کے پیچ و خم، تاریخی حیثیت، عروضی نوعیت اور فنی عظمت کو اجاگر کرتے ہوئے اس سلسلے میں اپنی متنوع، متوازن اور جامع رائے پیش کی ہے اور اہم نکات سے روشناس کرایا ہے جس سے طلبا، اساتذہ، ناقدین، محققین، مورخین اور دوہا نگار مستفیض ہو سکتے ہیں۔ قائم کردہ سرخیوں کے تحت الگ الگ خانوں میں تقسیم کر کے تجزیہ کرنے سے ہر نکتہ واضح ہو گیا ہے جو بنیادی اور ضروری معلومات سے مملو ہے۔ پانچواں باب ''اردو دوہوں میں تغزل کی عکس تابی'' بڑا خوب صورت مضمون ہے۔ لفظ تغزل بذات خود وسیع معنی و مفہوم پر محیط ہے جس میں شاعری کا تمام تر حسن مضمر ہے بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ تغزل نہ صرف غزل بلکہ شاعری کی روح ہے۔ یہ ایک ایسا حسن ہے جس کو لفظوں کی تعبیر و تشریح میں قید کرنا محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ میرا خیال ہے کہ شاعری اور تغزل دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ یہ ایک ایسی صفت ہے جو شعری حسن میں محسوس کی جا سکتی ہے۔ شاعری کی کوئی بھی صنف ہو اس کے حسن کی ضمانت تغزل ہے اس لیے اسے صرف غزل کے ساتھ مختص کرنا اس کی وسعت کو محدود کرنے کے مترادف ہوگا۔ جناب ظہیر غازی پوری نے تغزل کا یہ حسن 'دوہا' میں تلاش کیا ہے اور اس کی وضاحت مثالوں سے کی

ہے۔ چونکہ بحیثیت شاعر وہ خود تغزل کی معنویت سے آشنا ہیں اس لیے وہ دوہا میں تغزل کی لذت کو محسوس کرنے اور اس کو منعکس کرنے میں کامیاب ہیں۔ چھٹا باب "چند متنازعہ دوہے" بھی بڑا اہم اور معلوماتی ہے۔ اس میں بڑی تلاش و جستجو اور تحقیق کے مرحلوں سے گزر کر دوہا کے اصل شاعر کا نام معلوم کرنے کی کامیاب کوشش ہے اور تاریخی و لسانی مطالعہ کی بنیاد پر اپنی رائے کو تقویت پہنچائی گئی ہے۔ انھوں نے اپنی کاوش سے بعض غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے اور ایک بڑی بات یہ ہے کہ نظیر اکبر آبادی کی دوہا نگاری کی حیثیت جو تاریکی میں تھی، اسے اجاگر کیا ہے۔ ساتویں باب میں "عالی کے دوہے، تنقید کی روشنی میں" بڑا دلچسپ مضمون ہے۔ عالی کی وہ شاعری جسے دوہا کہا جاتا رہا ہے، دوہے کی اصل تعریف اور قواعد و ضوابط کے زمرے میں نہیں آتی، بلکہ صنف دوہے سے الگ اس کی شاعرانہ حیثیت ہو سکتی ہے۔

ظہیر صاحب کی یہ کتاب اس لحاظ سے بھی بے حد اہم ہے کہ اردو عروض کے مطابق انھوں نے بارہ ایسے اوزان کی نشاندہی کی ہے جن میں دوہے کہے جائیں تو متعین وزن و آہنگ کے مطابق ہوں گے۔ ہندی میں لگھو اور گرو کی کمی بیشی کو اردو عروض میں ڈھالنا اس لیے ممکن نہیں کہ ہندی ماترک چھند کے مطابق لگھو کی جگہ گرو اور گرو کی جگہ لگھو ماتراؤں کے استعمال کی جو آزادی دسویں صدی میں تھی وہ بدستور جاری ہے۔

اس کے بعد کے ابواب میں چند مشہور و معروف دوہا نگار اور ان کے دوہے زیر بحث ہیں۔ ان مضامین کی حیثیت تبصرہ، تجزیہ اور تاثراتی تنقید کی ہے جو عام تبصروں اور تجزیوں کے اصولوں سے بلند تر ہے۔ ان میں بھی مصنف نے اپنی تمام تر تنقیدی بصیرتوں سے استفادہ کیا ہے اور اپنے منفرد اور خوب صورت انداز میں صنف دوہا نگاری میں ان شعرائے کرام کی دوہا نگاری کے مقام کا تعین کیا ہے اور ان کی انفرادیت کی توضیح و تشریح بھی کی ہے۔

ظہیر غازی پوری نے عصر حاضر کے بیشتر معروف اور معتبر دوہا نگاروں کے دوہوں کو بطور حوالہ اپنے مضامین "اردو دوہے۔ ایک تنقیدی جائزہ"، "اردو دوہوں میں تغزل کی عکس تابی" اور "اردو دوہے میں ہیئتی اور صنفی تجربوں کی اہمیت" وغیرہ میں پیش کر کے ان کی نمائندگی کی ہے جب کہ مسیح اللہ اشرف نے اپنی کتاب "اردو شاعری میں دوہے کی ضرورت" میں صرف ندا فاضلی کی مثالیں پیش کی تھیں۔ مختصر یہ کہ "اردو دوہے۔ ایک تنقیدی جائزہ" ایک کامیاب اور گراں قدر پیش کش ہے۔ بقول ڈاکٹر عبدالمنان طرزی وہ:

بے شبہ یہ سرمایہ گراں ہے اردو دوہے پر مصنف کی دروں بینی و محنت کا ہے جو مظہر

☆☆☆

محمد امین الدین اور ہمارا افسانوی ادب

آصف مالک

میرے نزدیک افسانے کی پہلی ضرورت یا بنیادی وصف readability ہوتا ہے، یعنی قاری افسانہ شروع کرے اور طبیعت کو بوجھل کیے بغیر پڑھتا چلا جائے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ امین الدین کے افسانوں میں یہ خوبی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ ۱۵۹ صفحات کی اس کتاب میں پندرہ افسانے ہیں اور میں تو انتساب کو بھی ایک افسانہ ہی شمار کروں گا جس میں انھوں نے تین صفحات میں اپنے شہر حیدرآباد کو یاد کیا ہے اور وہ ماحول بیان کیا ہے جس ماحول نے ان میں تخلیق کی جوت جگائی اور پھر اردو ادب کو ایک افسانہ نگار ملا۔ گیارہ سال میں افسانوں کے پانچ مجموعے اور ایک ناول "یار خدا" یہ تخلیقی متاع امین کو یقینا اردو افسانوی ادب میں اہم مقام عطا کرتی ہے۔ ان کی ہر کتاب کی طرح یہ کتاب بھی آپ ایک نشست میں پڑھ سکتے ہیں۔ بیان پر قدرت ان کا خاص جوہر ہے۔

Readability کے بعد افسانے کے مجموعی تاثر کی بات آتی ہے، یعنی قاری جب افسانے کی قرأت مکمل کر لیتا ہے تو اس پر کیا تاثر مرتب ہوتا ہے۔ اچھی کہانیاں وہ ہوتی ہیں جو حافظے میں محفوظ رہ جاتی ہیں۔ جن میں وحدت تاثر ہوتا ہے۔ حافظے میں محفوظ رہ جانے والی کہانیاں ہی ماسٹر پیس کہلاتی ہیں۔ اردو کا افسانوی ادب بھی ایسے ہی Master pieces سے مالا مال ہے۔ میں امین الدین کا مستقل قاری ہوں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی بیشتر کہانیاں حافظے کا حصہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ اس مجموعے میں بھی کئی ایسی کہانیاں ہیں۔ Readability اور مجموعی تاثر سے آگے بڑھیں تو پھر یہ دیکھا جاتا ہے کہ افسانے کا موضوع اچھوتا ہے یا پرانا، پلاٹ یا قصہ چست ہے یا ڈھیلا ڈھالا، کردار نگاری مضبوط ہے یا کمزور، منظر کشی کیسی ہے وغیرہ وغیرہ۔ جدید افسانے میں اگرچہ کہانی کے ان سارے Tools کا ہونا ضروری قرار نہیں پاتا، صرف وحدت تاثر کی شرط ابھی تک برقرار ہے۔ بعض بزرگ تو کہانی میں سے کہانی ہی غیر ضروری قرار دیتے ہیں اور اینٹی اسٹوری کا علم اٹھاتے ہیں لیکن یہ بات حوصلہ افزا ہے کہ افسانے میں سے کہانی بھی گئی تھی یا نہیں، یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن اب افسانے میں کہانی واپس ضرور آ گئی ہے اور تمام فقیہان ادب افسانے میں کہانی کی اہمیت پر اصرار کرتے ہیں۔

امین الدین کے افسانوی ہنر کا وصف یہ ہے کہ ان کا ہر افسانہ ایک بھرپور کہانی بیان کرتا ہے۔ وہ

تکنیک یا گرامر سے زیادہ بغاوت نہیں کرتے، اور انھیں ایسا کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے کیوں کہ ان کے پاس خیال اتنا پکا ہوا آتا ہے کہ انھیں تکنیک کے جھمیلوں میں پڑنے یا علامتی و تجریدی تڑکے لگانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ اگر کہانی کا مکمل ابلاغ ایک عیب ہے تو امین الدین اس عیب کے سزاوار ہیں۔

میں نے پہلے بھی لکھا ہے کہ امین الدین کا بنیادی مسئلہ کہانی بیان کرنا ہے۔ وہ بڑے تواتر سے مسلسل کہانیاں لکھ رہے ہیں اور ان کی کہانیاں کرداروں سے تخلیق پاتی ہیں۔ کردار ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں اور جب کردار آتے ہیں تو ان کے ساتھ ان کرداروں کی کہانیاں بھی خود چل کر آتی ہیں۔ امین تو بس ان کرداروں اور ان کی کہانیوں کو صفحۂ قرطاس پر نمایاں کر دیتے ہیں۔ ذہن کی یہ تخلیقی زرخیزی بڑے خوش قسمت لوگوں کو عطا ہوتی ہے۔ امین بھی اس لحاظ سے بڑے خوش قسمت ہیں۔ وہ بظاہر بڑے خاموش طبع اور سیدھے سادے آدمی ہیں۔ بلکہ گھنّے سے لگتے ہیں، لیکن گھنّے لوگ اندر سے بڑے گہرے ہوتے ہیں۔ امین کے مشاہدے کی آنکھ ہر وقت کھلی رہتی ہے۔ ان کے مشاہدے کی آنکھ پلک نہیں جھپکتی۔ اسی لیے روزمرہ زندگی میں سامنے آنے والا کوئی کردار ان کی گرفت سے نہیں بچتا۔ ان کی بعض کہانیاں گہرے مشاہدے ہی نہیں بلکہ تجربے کی گواہی دیتی ہیں اور جو کہانیاں ان کے تجربے کا حصہ ہیں وہ بڑی ہی پُر اثر کہانیاں ہیں جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ وہ ایک سرکاری افسر ہیں، اسی لیے ''گاڈوی''، اور ''موجود اور غیر موجود'' جیسی کہانیاں ہمارے سرکاری دفاتر میں پائی جانے والی کرپشن کو بڑی بے رحمی سے عریاں کرتی ہیں۔ اس مجموعے کی آخری کہانی ''الٹی کھوپڑی کا آدمی'' بھی ان کے حج کے تجربے سے برآمد ہوئی ہے۔ مجھے یہ کہانی خاص طور پر پسند آئی۔ اس میں انھوں نے بڑی بہادری سے مذہب کے نام پر پائی جانے والی بدعتوں اور منافقتوں کو بیان کیا ہے۔

امین کے ہاں زبان کا چٹخارہ تو نہیں ہے، نہ ہی وہ نثر میں شاعری کرتے ہیں جو بہرحال ایک عیب بھی ہے، ان کا اسلوبِ تحریر بہت سادہ ہے، لیکن سپاٹ ہرگز نہیں۔ چلتے چلتے بلیغ فقرے بھی سامنے آجاتے ہیں، جیسے ''موجود اور غیر موجود'' کا کردار مبارک شاہ جب یہ کہتا ہے کہ ''سائیں! مولا سائیں کی قسم، ہم پلا کھاتے ضرور ہیں لیکن ہم دریا کے الٹے رخ پر کبھی نہیں بہتے۔ بابا دریا جس طرف چلتا ہے، ہم بھی اسی طرف چلتے ہیں۔'' یہ فقرہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ہمارا مسئلہ ہی یہ ہے کہ ہم دریا کے رخ پر بہہ رہے ہیں، ہم میں کوئی الٹی کھوپڑی کا آدمی نہیں ہے، جب کہ ہمیں ہوا کے رخ پر چراغ جلانے والے سرپھروں کی ضرورت ہے۔

بعض کہانیاں امین کے صرف تصور کی پیداوار ہیں لیکن یہ کہانیاں بھی زندگی سے ماورا نہیں ہیں، جیسے ''مجسمہ۔'' اس افسانے میں انھوں نے فن کے احساس اور تخلیق کے کرب کو وجدان میں ڈھلتے ہوئے دکھایا ہے کہ فن کار پر اس کے وجود کی حقیقت اس طرح بھی منکشف ہو سکتی ہے۔

☆☆☆

ایک خوش رنگ مجموعہ

مشتاق شبنم

مشرق صدیقی کا مجموعہ کلام ''عکسِ شعور'' غزلوں کا مجموعہ ہے جس میں انھوں نے اپنے تین دہائیوں کے نجی، معاشرتی اور اجتماعی تجربات کو غزل کی مختصر اور مخصوص ہیئت میں نہایت خوش اسلوبی سے جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مشرق صدیقی نے زندگی کے گوناگوں مسائل کو مس کیا بلکہ مسائل کی مختلف پرتوں کو کھولنے اور تلخ حقیقتوں کو قاری تک پہنچانے کا فریضہ بھی انجام دیا ہے۔

''عکسِ شعور'' کے مندرجات سے یہ بات بڑی وضاحت سے سامنے آتی ہے کہ مشرق صدیقی نے اپنے علم و فضل کا پورا پورا فائدہ اٹھا کر اردو ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس مطالعے کی مدد سے مسائل حیات کو سمجھنے کی کوشش بھی کی ہے اور بہت حد تک اس کوشش کے ثمرہ سے مستفیض ہونے کی علامات بھی ملتی ہیں لیکن مشرق اس احتیاط کو نظر انداز کر گئے کہ تحقیق اور مطالعہ میں کتنا فاصلہ نامحسوس ضروری ہے جس سے خالق کے شناختی العباد کو نقصان نہ پہنچے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ایسا دیدہ و دانستہ ہوا ہو، ممکن ہے دامِ علائق کی مجبوری نے اس طرف توجہ دینے سے روکا ہو۔ بہر حال اتنا ضرور ہے کہ مشرق صدیقی کی غزلوں میں زندگی کی مختلف جہتوں کی آگہی ضرور ملتی ہے جس میں غمِ دوراں کی کڑوی کسیلی باتیں بھی ہیں اور غمِ جاناں کی میٹھی میٹھی لذت بھی، خوشگوار مسرتوں کا اشارہ بھی ہے اور کرب انگیز لمحوں کی تکلیف دہ صورت حال بھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ مشرق صدیقی نے جن حالات میں رہ کر ادب سے وابستگی کا ثبوت دیا ہے وہ قابلِ قدر اور قابلِ ستائش ہے۔ آیئے مشرق صدیقی کی فکر و نظر پر ایک نگاہ ڈالیں:

نشۂ زر آج کتنا عام ہے — سب کے ہاتھوں میں ہوس کا جام ہے

عجب حال زمانے کا ہو گیا مشرقؔ — ہر ایک شخص یہاں وقفِ زر پرستی ہے

گو تناور دکھائی دیتا ہے — یہ شجر کھوکھلا ہے اندر سے

جوشِ وحشت میں اپنے گلشن کا — ہر شگفتہ گلاب چھوڑ آیا

ساری شے ٹوٹی ہے باہر سے — آدمی ٹوٹتا ہے اندر سے

اس قدر عیش جو میسر ہے — کون سا کام آپ کرتے ہیں

روز ہوتا رہا قتال یہاں زیست کرتا ہوا محال یہاں

اپنی مٹی سے رابطہ ٹوٹا اب یہاں کون مجھ کو پہچانے

نہ جانے عکسِ رخ یار کب اُتر آئے مدام دل کو یوں ہی آئینہ کئے رکھنا

دو گھڑی میٹھی باتوں کی فرصت نہیں کیا عجب دوستو زندگی ہو گئی

وہ سامنے ہیں کسی بے زبان بت کی طرح نگاہِ شوق رہینِ صنم پرستی ہے

جل رہا ہے دیا جو چوکھٹ پر اس کے آنے کا آسرا ہے ابھی

رہا جو دل پہ تسلسل سے خواہشوں کا نزول میں اپنی ذات میں تقسیم روز ہوتا رہا

مشرق صدیقی کے کلام میں زندگی کے مختلف مسائل مختلف انداز سے جلوہ آراء ہوئے ہیں۔ کہیں گہری سماجیت کا احساس موجزن ہے، کہیں نری فردیت کے جذباتی رنگ نمایاں ہیں، کہیں تغزل کے قدیم رنگ کی آمیزش ہے اور کہیں ترقی پسندانہ رویے کا آہنگ غالب نظر آتا ہے۔ دراصل مشرق صدیقی کسی ایک نکتۂ نظر کے دلدادہ نہیں ہیں لیکن وہ مختلف نکتۂ نظر کی روح سے واقف ضرور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ''عکسِ شعور'' کے گلدستے کو ہر رنگ کے پھولوں سے سجا کر ایک ایسا خوش رنگ مجموعہ تیار کرتے ہیں۔ جس میں ہر ذوق کے لئے دلکشی اور ہر مشامِ جاں کے لئے خوشبو موجود ہے۔ میرے خیال میں کسی ایک مرکز سے ناوابستگی مشرق کی اس خواہش کا اظہار ہے کہ ''عکسِ شعور'' کے روشن مستقبل اور تائید کو وسیع تناظر میں رکھا جائے۔

میں ''عکسِ شعور'' کو ایک خوبصورت مجموعہ سمجھتا ہوں اور مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ مجھے قوی امید ہے کہ ''عکسِ شعور'' ادبی ذوق رکھنے والوں میں شوق سے پڑھا جائے گا۔

☆☆☆

کہانیوں کی کہکشاں

مترجم: احمد زین الدین
ضخامت: ۱۹۲صفحات
قیمت: ۲۵۰روپے
ناشر: زین پبلی کیشنز، A-8، ندیم کارنر، بلاک N، نارتھ ناظم آباد، کراچی۔74700
مبصر: نامی انصاری

احمد زین الدین اصلاً غازی پور (یوپی) کے باشندے ہیں۔ان دنوں کراچی سے ایک سہ ماہی ادبی جریدہ ''روشنائی'' شائع کرتے ہیں۔ابھی حال ہی میں اس کا ضخیم افسانہ نمبر تین جلدوں میں شائع ہوا ہے جس کی ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی ہو رہی ہے۔

زیرِ نظر کتاب ''کہانیوں کی کہکشاں'' میں ان کے سولہ افسانے شامل ہیں جو ہندوستان کی آٹھ مختلف زبانوں کے افسانوں اور تین غیر ملکی افسانوں کے تراجم پر مبنی ہیں۔شروع میں ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر انور سدید کی تحریروں نے گویا ان افسانوں کی اشاعت کا جواز فراہم کر دیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان میں انگریزی میں انڈین لٹریچر اور ہندی میں ''سم کالین بھارتی ساہتیہ'' نام کے دو ایسے رسالے شائع ہوتے ہیں جن میں ملک بھر کی تمام زبانوں کے منتخب افسانوں کے تراجم پڑھنے کو مل جاتے ہیں مگر پاکستان میں غالباً ایسا کوئی جریدہ شائع نہیں ہوتا جس میں برصغیر میں لکھے جانے والے افسانوں کی نمائندگی بھرپور انداز میں ملتی ہو۔شاید یہی وجہ ہے کہ ہندی اور دیگر ہندوستانی زبانوں میں تحریر کردہ فکشن کی پاکستان میں کافی اچھی مانگ ہے۔احمد زین الدین نے بیشتر ترجمے اوریجنل زبانوں سے نہیں کیے بلکہ ان کے انگریزی تراجم کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔''کہانیوں کی کہکشاں'' میں سب سے زیادہ موثر وہ پانچ کہانیاں ہیں جن کو مترجم نے براہِ راست بنگلہ زبان سے ترجمہ کیا ہے۔احمد زین الدین نے تقسیم ہند کے بعد اور سقوطِ ڈھاکہ سے پہلے کافی وقت بنگلہ دیش میں گزارا ہے اور وہ نہ صرف وہاں کے سماجی اور کلچرل تانے بانے سے واقف ہیں بلکہ افسانوں کا انتخاب بھی ایسا ہے جو وہاں کی سماجی زندگی کا حقیقی منظر نامہ پیش کرتا ہے۔غربت، بیروزگاری اور بھکمری کا جو طور ان افسانوں میں نظر آتا ہے اس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ سابق مشرقی بنگال کے عمومی حالات کتنے

انڈونیشیا تک تھے۔ جنوبی ہندوستان کی دیگر زبانوں کے افسانوں میں ان علاقوں کی سماجی زندگی کے ارتعاشات اور خصوصیات کو بہت خوبی سے سمیٹا گیا ہے۔

''امریکی لڑکی روم میں'' (اطالوی)، ''اسپرنگ بلوم کا شوہر'' (انگریزی) اور ''لمحوں کا سفر'' (آذر بائیجانی) اپنی اپنی طرز کے بہت عمدہ افسانے ہیں جن سے وہاں کی زندگی کے اسلوبیات اور ترجیحات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

کتاب کے آخر میں دس افسانہ نگاروں کے مختصر حالات درج ہیں۔ بعض تو اتنے مختصر ہیں کہ ان سے صحیح صورت حال بھی ابھر کر سامنے نہیں آتی۔ مثلاً اس کتاب کا ایک افسانہ ''اینٹوں کی کہکشاں'' جو Rainbow of Bricks کا ترجمہ ہے۔ اس کا عنوان ''اینٹوں کی دھنک'' ہونا چاہیے تھا۔ اس کے مصنف کا نام مدھورائے لکھا ہوا ہے لیکن فہرست میں گجراتی کہانی اور مصنف کا نام پارلیش نائیک لکھا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ پڑھنے والا اس سے کنفیوز ہوگا۔

کتاب کی کمپوزنگ اور طباعت قابلِ اطمینان ہے۔ بشیر موجد کا بنایا ہوا سرورق بہت دیدہ زیب اور معنی خیز ہے، ساتھ ہی بیک کور پر مترجم کی ایک دلکش تصویر بھی دعوتِ نگاہ دیتی معلوم ہوتی ہے۔ ترجموں کی زبان صاف ستھری اور معیاری ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب ادبی حلقوں میں پسند کی جائے گی۔

☆☆☆

''لاشعور'' ۔ غلام مرتضٰی راہی کا مجموعۂ کلام

''لاشعور'' غلام مرتضٰی راہی کی بیاسی غزلوں پر مشتمل پانچواں مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ''لامکاں''، ''لاریب''، ''حرفِ مکرر'' اور ''لاکلام'' کے عنوان سے غزل کے چار مجموعے شائع ہو کر غزل کے باذوق اور فہیم حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ راہی نے جدیدیت کے ابھار کے زمانے میں نظم گوئی سے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا تھا لیکن جلد ہی وہ غزل کی طرف مائل ہو گئے اور انھوں نے بہت جلد اپنی صلاحیت کی بدولت جدید غزل کے معماروں میں اپنے لیے ممتاز مقام حاصل کر لیا ہے۔ راہی صاحب علم شاعر ہیں، ذہن رسا پایا ہے، زندگی کے ہر جذبے کو شعر کے سانچے میں ڈھالنے کا انھیں سلیقہ آتا ہے۔ ان کی غزل میں تازہ خیالی کے ساتھ سادہ بیانی نے ایک عجیب سی کشش اور تاثیر بھر دی ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن نے بجا فرمایا ہے کہ ''اس شان کی غزل لکھنے والے اردو میں انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔'' اردو کے مشہور نقاد شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا ہے کہ ''غلام مرتضٰی راہی کی شاعری کا میں تیس سال سے قائل ہوں، ان کی غزلوں میں اب بھی وہی آب و تاب ہے، اور کہیں سے تھکن کے آثار نہیں ہیں۔ تازہ دمی کی ایسی مثال راہی کے ہم عصروں میں شاید ہی کسی کے یہاں مل سکے۔'' مظہر امام، ڈاکٹر وارث علوی، ڈاکٹر شمیم حنفی، ڈاکٹر حامدی کاشمیری، ڈاکٹر علیم اللہ حالی، ڈاکٹر عتیق اللہ نے راہی کو ان کی غزل کے حوالے سے سراہا ہے۔

فی زمانہ اردو میں جدید غزل کی بھرمار ہے۔ ایسی جاندار اور معنی افروز جدید غزل بہت کم نظر آتی ہے جو غلام مرتضٰی راہی سے منسوب اور مخصوص ہے۔

اچھا دبیز کاغذ، اُجلی کتابت، صاف ستھری طباعت اور دیدہ زیب سرورق۔ پختہ جلد۔ قیمت صرف ایک سو پچاس روپے۔ راہی پبلی کیشنز فتح پور سے یا بھارت کے مختلف شہروں میں معروف کتب فروش اداروں سے دستیاب ہو سکتی ہے۔ ☆☆☆

(ادارہ)

یادیں باقی رہ جاتی ہیں

خراجِ عقیدت: ڈاکٹر خورشید جہاں

ڈاکٹر خورشید جہاں

دائیں سے: جلیل اشرف، حفیظ اللہ نیولپوری، مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر خورشید جہاں (یونیورسٹی بلڈنگ کی سیڑھیوں پر)

دائیں سے: ڈاکٹر خورشید جہاں، ڈاکٹر وہاب اشرفی اور جلیل اشرف

دائیں سے: ڈاکٹر خورشید جہاں، جلیل اشرف اور ڈاکٹر علیم اللہ حالی (۲۲ جولائی ۲۰۰۲ء کا یادگار گروپ)

دائیں سے: پروفیسر خورشید جہاں، جلیل اشرف، پرویز کمال الدین، پروفیسر علیم اللہ حالی

سوانحی کوائف: ڈاکٹر خورشید جہاں

ترتیب: ڈاکٹر جلیل اشرف

نام: خورشید جہاں

قلمی نام: خورشید جہاں (خورشید عالم زیب اور خورشید جہاں اشرف کے نام سے بھی مضامین لکھے)

پیدائش: ۱۷ر جولائی ۱۹۴۷ء بکرم گنج (شاہ آباد)

وفات: ۲۹ر نومبر ۲۰۰۵ء آزاد نگر، پلاول روڈ، ہزاری باغ

آبائی وطن: موضع زنگی پور ضلع نالندہ، وطن ثانی: ہزاری باغ (جھارکھنڈ)

تعلیم: بی۔ اے (آنرز)، ایم۔ اے (اردو)، پی ایچ ڈی

ملازمت: صدر شعبۂ اردو، رانچی یونیورسٹی، رانچی

شریک سفر: ڈاکٹر جلیل اشرف

اولادیں: فشا خورشید، افشا خورشید

تصانیف و تالیفات:

''جدید اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات (۱۹۸۸ء، دوسرا ایڈیشن: ۲۰۰۲ء، کئی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل)

ترتیب: ''ادب نما'' ۔ (۲۰۰۲ء)

زیر ترتیب: ''جدید تر تنقید'' ۔ مقالات کا مجموعہ

زیر اشاعت: ''ہوئے کیوں نہ غرق دریا'' ۔ انشائیوں کا مجموعہ

اعزازات: ''جدید اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات'' پر کئی انعامات ملے

دیگر مشاغل: کئی علمی اور تہذیبی اداروں کی مختلف ذمہ داریاں

کئی پی ایچ ڈی مقالات کی نگرانی

قطعہ تاریخِ وفات پروفیسر خورشید جہاں

پروفیسر طلحہ رضوی برق

کون اٹھ گیا دنیا سے جو ہر سمت سے اے برقؔ
اک بین، بکا، نالہ و فریاد، فغاں، آہ
رضواں نے ندا دی کہ ہوئیں داخلِ جنت
"زیبائے افق اچھی وہ خورشید جہاں آہ"
۱۴۲۶ھ

نادم بلخی

موت خورشید جہاں سے آتے ہی یہ کہہ گئی ہے
دارِ فانی میں نہیں باقی رہا تیرا قیام اب
غمزدوں سے سالِ رحلت نے کہا نادمؔ کہ سن لو
خلد والی نے لیا فردوس میں اچھا مقام اب
۶۴۴ ۴۷ ۳۱۶۰ ۳۵۰ ۱۰۰ ۳۱۸۱۱۱۰ ۱۴۲۶ھ (مادہ تاریخ)

پروفیسر عبدالمنان طرزی

موت کی آغوش میں پھر زندگی ہے سو گئی
پھر فضائے حق میں ہستی آج ہے اک کھو گئی
حادثہ اردو ادب کا ہے یہ اک بے شک بڑا
بزم خورشید جہاں سے ہے جو خالی ہو گئی
۳۹ ۱۱۲۰ ۵۹ ۷۰ ۱۵ ۴۲۶۲۱۹ = ۲۰۰۵ء

خورشید جہاں: چند باتیں

پروفیسر وہاب اشرفی

کچھ لکھتے ہوئے کلیجہ منھ کو آتا ہے۔ پروفیسر خورشید جہاں اب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ وہ ۲۹ر نومبر ۲۰۰۵ء کو بحیثیت ڈین فیکلٹی آف آرٹس کی خدمات انجام دیتے ہوئے اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔ یہ خبر مجھے اسی دن ملی۔ میری اپنی علالت کا سلسلہ ان دنوں خاصا پریشان کن مرحلے میں تھا۔ میں ہزاری باغ نہیں پہنچ سکا جس کا قلق مجھے تاحیات رہے گا۔

خورشید سے میری وابستگی پرانی تھی۔ جس وقت وہ ایم۔اے کا امتحان دے رہی تھیں تو انھوں نے مجھ سے رابطہ قائم کیا اور معاونت چاہی۔ تب سے یہ سلسلہ ان کی پی ایچ ڈی کی ڈگری کے حصول تک قائم رہا۔ گاہے بگاہے میں ہزاری باغ جاتا تو زیادہ تر ان کے یہاں قیام کرتا۔ جلیل اشرف، جو ان کے شوہر ہیں، وہ بھی میرے شاگرد رہے ہیں۔ اس طرح میاں بیوی مہمان نوازی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے اور میرے آرام و سکون کے لیے ہر لمحے سنجیدہ رہتے ہیں۔

میں شعر و ادب کے معاملے میں سہل پسند نہیں اور یہی اپنے شاگردوں سے بھی توقع کرتا رہا۔ خورشید جہاں نے اپنے مقالے کے موضوع کے انتخاب کے سلسلے میں مجھ سے رجوع کیا تو میں نے ان کی تنقیدی صلاحیتوں کے پس منظر میں ہی وسیع کینوس کا موضوع انتخاب کرنا چاہا۔ میرے ذہن میں یہ آیا کہ کیوں نہ کوئی تقابلی نوعیت کا کام ہو۔ آخرش عنوان طے ہوا۔ اب انھیں ''جدید اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات'' پر تحقیقی مرحلے سے گزرنا تھا۔ موضوع مشکل تھا اور گہرا مطالعہ چاہتا تھا۔ مغربی ادبیات کے بعض رخوں سے بھی واقفیت ضروری تھی۔ خورشید جہاں نے بڑی محنت کی۔ ان کے گھر میں کتابوں کا ایک اچھا خزانہ ہے۔ وہ تو کام آیا ہی، بعض کتابیں کافی تلاش و جستجو کے بعد حاصل کی گئیں۔ جب ان کا کام شروع ہوا تو کئی موقعے پر انھوں نے سپر ڈال دینے کا اشارا کیا جسے میں سختی سے رد کرتا رہا۔ وہ از سرِ نو کمربستہ ہوتیں اور نئے عزم کے ساتھ اپنے پرجیکٹ میں لگ جاتیں اس طرح مقالے کا پہلا ڈرافٹ مرتب ہوا۔ میں نے جب اسے دیکھا تو اس کے بہت سے حصے کو رد کر ڈالا۔ ان کے چہرے پر جھنجھلاہٹ کے آثار تھے۔ لیکن میری حوصلہ افزائی سے وہ ایک بار پھر تازہ دم ہوئیں اور نئی لگن سے کام شروع کیا۔ دو تین مہینے کے بعد جب دوسری بار مسودہ میرے سامنے آیا تو میں نے صرف اس کا ایک حصہ رد کیا جسے محترمہ نے ایک ماہ کے اندر ہی نئی صورت دے دی۔ اب مقالہ تیار تھا۔ اس کے ممتحن نے اسے اول درجے کا تحقیقی مقالہ قرار دیا

اور اس کی اشاعت کی سفارش بھی کی۔ مقالہ شائع ہوا تو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اس کی خوب خوب پذیرائی ہوئی اور جلد ہی اس کا دوسرا ایڈیشن بھی آ گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ پاکستان کے کسی ادارے نے اسے شائع کرنا چاہا ہے۔ معلوم نہیں کہاں تک پیش رفت ہوئی۔

خورشید جہاں ایک ذی علم خاتون تھیں۔ معاملات میں انتہائی چوکس۔ جس طرح وہ اپنے گھر بار کو سجا بنا کر رکھتیں اسی طرح اپنے علمی وقار کو بھی مزین کرنے کی کوشش کرتیں۔ ایک بار انھوں نے جدید اہم نقادوں پر مجھے چند مضامین دکھائے جن میں ہندو پاک کے کئی نامور نقاد تھے۔ میں نے جہاں تہاں سے انھیں دیکھا اور چھپوانے کی طرف مائل کیا۔ تب وہ بے حد بیمار رہنے لگی تھیں۔ انھیں دل کا عارضہ تھا اور ذیابیطس کی بھی مریض تھیں۔ ایسے حالات میں بھی ان کا علمی شغل جاری تھا۔ اب وہ انشائیہ لکھنے لگی تھیں۔ اساتذہ کی غفلت اور بے ایمانیوں کا انھیں بڑا صدمہ تھا۔ چنانچہ وہ یونیورسٹی کے ہی مسائل کو یا تعلیم و تعلم کی زبوں حالی کو نشان زد کرتیں اور انشائیہ کا پیکر عطا کرتیں۔ ایک انشائیہ ذیابیطس کے مرض سے متعلق ہے، اپنی نوعیت کے اعتبار سے بے حد منفرد بھی ہے۔ دوسرے انشائیائی مضمون بھی کم اہم نہیں۔ افسوس کہ اب تک نہ تو ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ شائع ہوا اور نہ ہی ان کے انشائیوں کا۔ حال ہی میں مجھے ڈاکٹر جلیل اشرف نے بتایا کہ وہ دونوں مجموعے جلد ہی شائع کر رہے ہیں۔ جب میں یہ لکھ رہا ہوں تو جلیل اشرف کی کچھ باتیں ان ہی کے حوالے سے یاد آ رہی ہیں۔ عجیب بات تھی کہ ادبی معاملات میں ہمیشہ میاں بیوی مجھ سے رجوع کرتے اور جو میں فیصلہ کر دیتا تو وہ ان کے لیے پتھر کی لکیر ہو جاتی۔ جلیل اشرف کے پی ایچ ڈی کے مقالے کے سلسلے میں خورشید کو کافی الجھن تھی۔ ایک بار ان دونوں ہی نے مجھ سے رانچی میں ملاقات کی اور فیصلہ یہ ہوا کہ پاکستانی نقاد ڈاکٹر سلیم اختر پر کام کیا جائے۔ چنانچہ کام کا خاکہ تیار ہو گیا اور دونوں ہی متعلقہ کتابوں کی تلاش و جستجو میں لگ گئے۔ زندگی کے احوال کے حصول کے بارے میں سوائے سلیم اختر سے رجوع کرنے کے کوئی اور چارہ نہ تھا، سو کیا گیا۔ اب مقالے کی تیاری میں جلیل اشرف مسلسل مجھ سے رابطہ قائم کرتے رہے۔ میری ہدایتوں کی روشنی میں کئی بار کئی مباحث تبدیل کیے گئے۔ تجزیہ کرنے اور پھر نتائج اخذ کرنے میں، میں نے ہر قدم پر ان کی معاونت کی، گویا میں دیکھتا رہا کہ اس مقالے کی ترتیب میں کون سی بحث کیسا رخ اختیار کر رہی ہے۔ خورشید جہاں بھی اس ضمن میں جلیل اشرف سے تعاون کرتی رہیں۔ اس طرح مقالہ تیار ہوا اور اس کی کتابی صورت میں ہندو پاک میں اشاعت ہوئی۔ پاکستان بھی عجب جگہ ہے۔ مجھے محمود واجد نے بتایا کہ وہاں یہ افواہ گشت کر رہی ہے کہ جلیل اشرف کا جو تحقیقی مقالہ سلیم اختر پر کتابی صورت میں شائع ہوا ہے وہ در اصل خود سلیم اختر کا لکھا ہوا ہے۔ یہ بالکل بے بنیاد بات ہے اور چانڈو خانے کی گپ ہے۔ میں اس کی ایک ایک سطر کے نشیب و فراز سے گزرا ہوں اور مجھے معلوم ہے یہ مقالہ سرتاسر جلیل اشرف ہی نے لکھا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ میں بحیثیت نگراں اور خورشید جہاں بحیثیت لائف پارٹنر ان کی معاونت کرتی رہیں۔ بے چارے سلیم اختر کا دور دور تک

سرو کار نہیں لیکن الزام تراشی بھی کیسے کیسے گل کھلا سکتی ہے!

خورشید جہاں بڑی تیزی سے اعلیٰ مقاصد کے حصول کی طرف رواں دواں تھیں کہ انھیں مختلف قسم کے امراض نے اس طرح دبوچا کہ ان کے قدم رک سے گئے ورنہ وہ وائس چانسلر وغیرہ کے عہدے پر فائز ہو سکتی تھیں۔ پھر علمی کام کو وہ آگے بڑھا سکتی تھیں لیکن یہ ممکن نہ ہو سکا اور اللہ نے انھیں بلا لیا۔

خورشید جہاں بڑی صاف ستھری نثر لکھتی تھیں۔ مختصر جملے اس طرح ان کے قلم سے نکلتے تھے جیسے چشمے کا پانی شفاف اور رواں دواں ہو۔ ذیل میں ان کے بعض انشائیوں سے چند اقتباسات نقل کرتا ہوں:

''بچوں کی آمد کے رکتے ہی میاں کا شوق پھر ابھر آیا۔ اب وہ صرف شوقیہ نہیں بلکہ ضرورتاً مجھے تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ اتنے دنوں میں زمانے کی ہوا بدل چکی ہے اور تعلیمی نظام میں بہت سے سدھار ہوئے ہیں، مثلاً جس نے مڈل تک بھی نہ پڑھا ہو وہ میٹرک میں پرائیوٹ طور پر نہ صرف شامل ہو سکتا ہے بلکہ نہایت آسانی سے فرسٹ ڈویژن لا سکتا ہے، اور اپنی عمر جتنا جی چاہے کم کر کے لکھوا سکتا ہے۔ اگر آپ کو امتحان کے سوالات سمجھ میں نہ آتے ہوں تو آپ اپنے پرائیوٹ ٹیوٹر یا گارجین کی مدد سے انھیں حل کر سکتے ہیں۔ آپ کے گارجین کو سوالات حل کر کے آپ کے لیے امتحان ہال میں بھجوانے کی چھوٹ ہے جنھیں آپ بہ آسانی نقل کر سکتے ہیں۔ اگر آپ میں پرچیاں نقل کرنے کی بھی صلاحیت نہ ہو یعنی لکھنا بھی نہ آتا ہو تو آپ کی طرف سے کوئی بھی دوسرا آدمی امتحان دے سکتا ہے۔'' (''من کہ.....'')

''خوشامد اور چاپلوسی کی ڈگری ہمارے پاس نہیں تھی۔ ہم نے اس یونیورسٹی کا پتہ جاننا چاہا جہاں یہ ڈگری ملتی ہے تو جواب ملا یہ صلاحیت خداداد ہوتی ہے اور اس کی کوئی ڈگری نہیں ہوتی۔ البتہ اس کی مدد سے ڈگریاں حاصل کی جا سکتی ہیں۔ خوشامد منزل تک جلد پہنچنے کے لیے شارٹ کٹ کا کام کرتی ہے۔ اس طرف سے مایوس ہو کر ہم نے اس کا نعم البدل طریقہ یعنی رسوخ کا استعمال کیا۔ حالانکہ ہم بڑے اصولوں والے ہیں لیکن بے اصولوں نے ہمارا ٹکرا کرنا شروع کر دیا تھا۔ کچھ تو مصلحتاً ایسا کرنا پڑا اور کچھ اس کی ضرورت بھی تھی۔ محنت کرنے والے محنتی لڑکوں کو اچھے نمبروں کا انعام اور بے کار وقت برباد کرنے والوں کو فیل ہونے کی سزا ملنی چاہیے۔ یہ آدرش تھا ہمارا۔ آخر اس آدرش کو عملی جامہ پہنانے کا موقع ملنا چاہیے تھا سو رسوخ نے یہ موقع فراہم کر دیا۔'' (''اعجاز ہے'')

ان اقتباسات سے ان کی ذہنی کیفیت، لکھنے کا انداز اور فکر کی کیفیت نمایاں ہو رہی ہے۔

اس وقت موقع نہیں کہ ان کا تجزیہ کیا جائے لیکن ان کی نثر کے تیور کا تو اندازہ ہو ہی جاتا ہے۔

☆☆☆

خورشید جہاں: ایک تخلیق کار نقاد

ڈاکٹر علیم اللہ حالی

ریاست بہار کی خواتین اہل قلم میں پروفیسر خورشید جہاں کی خدمات کا اعتراف ہنوز نہیں کیا جا سکا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ عام طور پر فن کاروں اور ان کے فن پاروں کی تفہیم و تحسین کے سلسلے میں یوں بھی بخل سے کام لیتا رہا ہے۔ خورشید جہاں تو خاتون تھیں اور ہنوز ہم خواتین کی ذہانت و ذکاوت اور ان کی دانشوری وطباعی کو دل سے قبول کرنے کے لائق نہیں بن سکے ہیں۔ کچھ لوگ تو احمد ہمیش کی طرح یہ سوچتے ہیں کہ خواتین تو اچھی شاعری کا موضوع ہوتی ہیں، وہ اس کی خالق کیوں کر بن سکتی ہیں۔ بالعموم خواتین کو ذہنی توانائی اور تخلیقی معنی انجھار کے معاملے میں مردوں سے کمتر اور کمزور تصور کیا جاتا ہے۔ مردانہ فسطائی ذہن بھی ہیے ہیے قصے برا استوار رہتا ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ عورتیں صرف چاہی جاسکتی ہیں اور خود چاہت کے جذبے سے عاری ہوتی ہیں۔ غرض رجولی معاشرہ طرح طرح سے عورتوں کو زیر کرنے کے حربے تلاش کرتا رہا ہے۔

اس صورت حال میں بہت سی دوسری خواتین اہل قلم کے ساتھ اگر خورشید جہاں کی تخلیق و تحریر کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے تو تعجب کی کیا بات ہے۔ لیکن جب ہم تمام تر تعصبات و تاثرات سے آزاد ہو کر ان کی تخلیقات اور ان کی تنقیدی تحریروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس خاکستر میں بہت سی دبی ہوئی چنگاریاں مل جاتی ہیں۔

پروفیسر خورشید جہاں کا ذہن اساسی طور پر فن کارانہ اور تخلیق کارانہ تھا اور یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ فن کار حقائق اور وقوعوں کی گہرائی و گیرائی پر دسترس رکھنے کا حامل ہوتا ہے۔ وہ چونکہ واقعات کے اندرون میں اُتر کر مفہوم کے جہانِ پنہاں تک رسائی حاصل کر لیتا ہے اس لیے اس کی تنقیدی نگاہ بھی زیادہ روشن اور دروں بیں ہوتی ہے۔ میں نے اپنی تحریروں میں کئی جگہ اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ تنقید کا صحیح وارث تخلیق کار ہی ہو سکتا ہے۔ اگر تنقید نگار کا منصب یہ ہے (اور یقیناً یہی ہے) کہ وہ فن پارے کی صحیح تفہیم کرے، فن کار کے فکر و جذبے کی بلندی اور لطافت سے خود منور ہو کر دوسرے قارئین کے ذہنوں کو اتنا ارتفاع بخش دے کہ وہ بھی رموزِ فن سے آشنا ہو جائیں۔ تنقید نگار جب فن کار کی طرح الفاظ کے کثیر الجہات ہونے کے راز سے واقف ہو جاتا ہے تو تخلیقی تنقید کے نمونے سامنے آتے ہیں۔ یہ creative insight ایک منزل پر پہنچ کر تخلیق و تنقید کے فرق کو ختم کرنے لگتا ہے۔ یہ دوئی جس قدر ختم ہوتی جاتی ہے، اسی قدر تخلیق دل نشیں اور تنقید بصیرت افروز ہونے لگتی

ہے۔

پروفیسر خورشید جہاں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز انشائیہ نگاری سے کیا ہے۔ انشائیہ ایک ایسی صنف ہے جہاں تخلیقی ذہن متعینہ اصناف ادب اور مروجہ ہیئتوں سے ہٹ کر آزادانہ انداز میں کام کرتا ہے۔ یہ اصناف کے خارجی اصول وقواعد کو قبول نہیں کرتا، یہاں مکمل ناوابستگی کی وجہ سے ایک طرح کے کھلے پن کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس صنف کے طفیل انشائیہ نگار کے یہاں تخیل کی کارکردگی غیر معمولی طور پر بڑھنے لگتی ہے۔ اور جب انشائیہ نگار تنقید کی طرف مائل ہوتا ہے تو اس کی تنقیدی نگارشات میں بھی اسی کھلے پن کی خصوصیت پیدا ہو جاتی ہے، اس کی تنقید بھی تخیل کی بوقلمونی دکھانے لگتی ہے۔ خورشید جہاں کے تنقیدی مقالات ان خصوصیات سے متصف ہیں۔

خورشید جہاں کی تنقیدی کتاب "جدید اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات" نے بجا طور پر خاص مقبولیت حاصل کی ہے۔ یہ موضوع اگرچہ اب نیا نہیں رہا لیکن جب یہ کتاب منظر عام پر آئی تھی تو اس وقت اردو کے تنقیدی اثاثے کا مطالعہ اس جہت سے نہیں ہو پایا تھا۔ خورشید جہاں نے نہ صرف یہ کہ اردو کے ان تنقید نگاروں کا توسیعی مطالعہ پیش کیا ہے جنھوں نے اپنے انتقادی افکار کے نشوونما میں مغربی تصورات سے مدد لی ہے بلکہ انھوں نے بڑی جرأت کے ساتھ ایسے بعض ناقدین کی خامیوں اور نارسائیوں کا ذکر بھی کیا ہے، جو مغرب سے استفادے کے سلسلے میں یاد تو کیے جاتے ہیں مگر انھوں نے اس میں جگہ جگہ ٹھوکریں بھی کھائی ہیں۔ اکثر یہ ہوا ہے کہ ہمارے بعض ناقدین نے مغرب کے ان تنقیدی اصولوں اور نظریات کو بھی رہنما تصور کر لیا ہے جن کی خود مغربی تنقیدی ادب میں کچھ خاص اہمیت نہیں رہی ہے۔ مغرب سے اپنی دلچسپی اور مغربی ادب پر دسترس ظاہر کرتے ہوئے ہمارے بعض ناقدین نے اردو کے اوسط درجے کے ادبا و شعرا کو محض ادنیٰ تشابہ کی بنیاد پر انگریزی، فرانسیسی اور جرمنی زبان کے اہم شعرا کے مماثل قرار دے کر گمراہ کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ بڑی آسانی کے ساتھ کسی کو اردو کا شیکسپئر، بائرن، ورڈزورتھ، شیلی، کیٹس اور ملٹن وغیرہ قرار دے دیا جاتا ہے۔ اردو ادب کے عام قارئین اس Branding سے گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ خورشید جہاں نے اردو کے بعض اکابر ناقدین کی گرفت بھی کی ہے اور مغربی ادب کے ضمن میں ان کی Little Learning کی نشان دہی کی ہے۔ غرض نقد و ادب کے باب میں مغربی تاثرات کی بے راہ روی نے اردو شعر و ادب اور نقد و بصر پر جو منفی اثرات مرتسم کیے ہیں ان کی وضاحت کا فریضہ پروفیسر خورشید جہاں نے جس سلیقے سے انجام دیا ہے اس کی نظیر بالعموم نہیں ملتی۔

اردو میں مغربی افکار و خیالات سے استفادے کی روش ترقی پسند تحریک کے دور میں خاص طور پر آبرومند ہوئی۔ خورشید جہاں نے اردو کے ان تمام ناقدین کا ذکر کیا ہے اور ان کے تنقیدی افکار کا تجزیہ کیا ہے جنھوں نے مغربی فکر و فلسفہ سے روشنی حاصل کی ہے۔ علی سردار جعفری، سجاد ظہیر، ممتاز حسین، احتشام حسین، ڈاکٹر

عبدالعلیم، اختر انصاری، حسن عسکری، محمد احسن فاروقی اور دوسرے بہت سے ترقی پسند ناقدین کے افکار و آرا کا جائزہ لیتے ہوئے خورشید جہاں نے ان کی یافت اور نارسائیوں کا ذکر کیا ہے اور اس نتیجے تک پہنچایا ہے کہ مغربی افکار نے ہمارے یہاں نقد و بصر کے لیے نئی راہیں تو بنائی ہیں لیکن ہمیں آنکھ بند کر کے تمام مفسرین کے خیالات سے اتفاق نہیں کرنا چاہیے بلکہ خوب و زشت کا راست فیصلہ کرنا ضروری ہے۔

پروفیسر خورشید جہاں کی دیدہ ریزی کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے مغربی اصول نقد سے تاثرات کے حصول میں مختلف تنقیدی دبستانوں کے ارتقا کی تصویر بھی پیش کی ہے۔ انھوں نے تاثراتی تنقید، جمالیاتی تنقید، نفسیاتی تنقید، رومانی تنقید، تاریخی، مارکسی، سائنسی اور عملی تنقید کے شعبے میں اردو نقد نگاری کی پیش رفت کا اجمالی جائزہ لیتے ہوئے مغربی نقد و نظر کے اثرات کی متعدد مثالیں سامنے رکھی ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ آج اس روایت کی توسیع میں اردو کے جدید تر تنقیدی منظرنامے پر بھی یہ نقوش روشن ہیں۔

خورشید جہاں کی تنقیدی نگارشات میں مطالعے کی وسعت، فکر کی کشادگی، نکتہ آفرینی اور اظہار و بیان کی شفافیت کا احساس ہوتا ہے۔ ان تمام عناصر نے مل کر ان کی تحریر میں دل آویزی پیدا کر دی ہے۔ ان کے مزاج کی بشاشت اور فرح مندی (جو ان کی تخلیقی شخصیت کا عطیہ ہے) نے ان کی تنقیدی تحریروں کو منفرد و ممتاز بنا دیا ہے۔

☆☆☆

"لیکن آج ......؟ بھلا ہو یاب تعلیم کا جنھوں نے مردہ ہوتی ہوئی علم کی کھیتی میں کھاد ڈال دی ٹائم باؤنڈ پروموشن کی۔ پھر کیا تھا چاروں طرف خوردہ جنگلی گھاس کی طرح ریسرچ اسکالر اُگ آئے۔ ایک ایک گائیڈ کی نگرانی میں درجنوں لوگ تحقیق کا کام کرنے لگے۔ ہر طرف ایک ہوڑ لگی تھی کہ ملازمت کے تیرہ سال مکمل ہونے سے پہلے پہلے ڈاکٹر بن جانا ہے تاکہ لیکچرر سے ریڈر میں پروموشن مل سکے۔

کچھ پیشہ ور باکمالوں نے باضابطہ دکان سجائی، سائنس ہو یا ادب، فلسفہ ہو یا سیاست، کوئی سبجیکٹ ہو اور کوئی بھی موضوع ہو صرف Synopsis ان کے حوالے کر دیجیے۔ تین ہزار سے دس ہزار تک کی قیمت میں تھیسس دستیاب ہے۔ اگر صرف مواد چاہتے ہیں تو تین ہزار روپے۔ اگر ڈکٹیشن چاہتے ہیں تو پانچ ہزار اور اگر لکھی لکھائی تھیسس چاہتے ہوں تو دس ہزار۔ منظور؟ اگر ہاں تو روپے لے کر آ جائیے، وقت مقررہ پر پی ایچ ڈی کا ریزلٹ آپ کے ہاتھ میں ہوگا، اور کیا چاہیے تھا، جن ہاتھوں نے کبھی نصاب کی کتابوں کو نہ چھوا تھا، اب وہی ہاتھ پی ایچ ڈی کا ریزلٹ سنبھال رہے تھے۔ پروموشن فارم بھرے جا رہے تھے۔ ریڈروں کی کھیپ کی کھیپ پہنچ رہی تھی۔"

(ڈاکٹر خورشید جہاں کے انشائیے "ٹائم باؤنڈ پروموشن" سے ایک اقتباس)

خورشید جہاں کی انشائیہ نگاری

غلام مرتضیٰ راہی

خورشید جہاں کی انشائیہ نگاری پر اگر مکالمہ شروع کریں تو کئی باتیں سامنے آتی ہیں۔ ان کے یہاں مزاح کم، طنز زیادہ ہے۔ مزاح میں انھوں نے جس تہذیب اور تمیز کا مظاہرہ کیا ہے وہ خود میں ایک مثال ہے۔ حالانکہ ہمارے یہاں انشائیہ نگاری پر بڑی بحثیں جاری رہی ہیں، اب بھی ہیں، لیکن اس ایک بات پر توسب متفق ہیں کہ گفتگو بے تکلفی سے ہوتی ہے۔ گویا بات چل رہی ہو اور بات کچھ بھی نہ ہو۔ لیکن بات میں بات نکلے اور بات میں بات ہی نہیں، بلکہ کچھ ایسی نکلے کہ دل کو لگے۔ جس طرح کوئی عام سا آدمی کوئی فلسفیانہ موشگافی کرے تو لوگ حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ بسا اوقات نیمل ناک میں بھی بہت گہرے پہلو نکل آتے ہیں کہ لوگ متحیر رہ جاتے ہیں۔ لیکن عجیب بات ہے کہ سوچ سمجھ کر تسلسل سے بات کرنا، ایسی بات جس کی تفہیم ہو سکے۔ ایسی بات کہ جس کا کوئی سرچشمہ ہو، کوئی سرا ہو آسان ہے۔ لیکن ایسی بات جس میں بات کچھ نہ ہو اور بہت کچھ ہو، ذرا مشکل سے ہی بن پاتی ہے۔ اس کے لیے کچھ خاص ذہن ودیعت ہوتے ہیں اور خورشید جہاں کے یہاں صورت حال یہی ہے۔ وہ بات بہت معمولی سطح سے شروع کرتی ہیں مگر زندگی کے اہم ترین مسائل کو چٹکیوں میں اس طرح اڑا دیتی ہیں گویا کچھ بھی نہ ہو لیکن جب اس کے عمق میں جائیں تو عجیب احساسات پیدا ہوتے ہیں۔

حالانکہ جب بھی میں انشائیہ کے حوالے سے دیکھتا ہوں پاکستان میں انشائیہ نگاروں کی ایک بڑی نسل ڈاکٹر وزیر آغا کے زیر تربیت پل کر جوان ہوئی ہے۔ اس میں طرح طرح کے انداز اختیار کر رہی ہے۔ ہندوستان میں انشائیہ نگاروں کی تعداد کم ہے، لیکن جو ہے وہ بہت اہم ہے اور دونوں طرف کے اسالیب ادا میں فرق ہے، طرز ادا الگ ہے۔ وہاں بات شروع ہو کر اس انداز میں نمودار ہوتی ہے کہ سلسلہ کہیں کا کہیں جا نکلتا ہے۔ گویا ایک نئی دنیا تخلیق ہو جاتی ہے لیکن اصل مرکزی خیال ایک ہی ہے۔ کسی موضوع پر کلام کرتے وقت اس موضوع کے پیچیدہ پہلوؤں کو دیکھنا الگ بات ہے۔ اسے یونہی بیان کر دینا یا پھر اس سے زندگی کے جوہر کو اخذ کر لینا ایک الگ بات ہے۔ چھوٹی چھوٹی اشیا کو زندگی کا حصہ بنا دینا ان کے ساتھ ربط قائم کرنا، تال میل بٹھانا انشائیہ کا اہم پہلو ہے۔

ڈاکٹر خورشید جہاں کے اچھے انشائیے میرے پیش نگاہ ہیں۔ مجھے ان کا تجزیہ کرنے کا حکم ملا ہے۔

بہر حال حسب مقدور کچھ نہ کچھ عرض ضرور کروں گا۔ حالانکہ سچ یہ ہے کہ یہ میرا میدان نہیں ہے لیکن پھر بھی انشائیوں میں ''شوگر نامہ''، ''نیا پے اسکیل''، ''ہوئے کیوں نہ غرق دریا''، ''سبق''، ''من کہ''، ''انجانے'' شامل ہیں جن میں اگر ایک طرف بہجت آفریں سمندر ہیں تو دوسری طرف خار صحرا بھی۔ خورشید جہاں کی نگاہ زندگی پر بہت گہری ہے۔ ان کی زندگی نے کچھ زیادہ وفا نہیں کی ورنہ بہت سی چیزیں لکھ رہی ہوتیں۔ بہر حال خود انھوں نے جو خیال ظہار کیا ہے وہ یہ ہے کہ:

''میں ایک معلّمہ ہوں۔ طالب علموں اور اساتذہ میں جو بے ایمانی اور سہل پسندی پیدا ہوگئی ہے اسے میں اپنے طنز کا نشانہ بناتی ہوں۔''

اس مختصر تحریر سے صاف ظاہر ہے کہ وہ کس قدر شفاف دل خاتون تھیں۔ ذرا بھی اس طرح کی باتیں جو سماج میں برائی کو فروغ دیں، برداشت نہیں کر پاتی تھیں۔ ان کے اندر کوئی چیخ اٹھتا تھا اور وہ دل کا زہر کاغذ پر انڈیل دیتی تھیں لیکن ایک خاص اسلوب، ایک خاص انداز کے ساتھ جو ان کا اپنا منفرد انداز تھا، جس میں بیان کی صفائی اور تاثر تھا۔

خورشید جہاں رانچی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کرنے کے بعد ۱۹۷۱ء میں کے بی ویمنس کالج ہزاری باغ میں بحیثیت لیکچرار شعبۂ اردو متقرر ہوئیں اور آخر تک درس و تدریس، تعلیم و تعلم سے ہی وابستہ رہیں۔ وہ ۷ار جولائی ۱۹۴۷ء میں پیدا ہوئی تھیں اور ۲۹ر نومبر ۲۰۰۵ کو انتقال کر گئیں، گویا بہت مختصر عمر پائی۔ لیکن اس درمیان میں ادبی سطح پر بڑا کام کر گئیں۔ ان کے شوہر ڈاکٹر جلیل اشرف شعبۂ اردو، سینٹ کولمبس کالج، ہزاری باغ سے وابستہ ہیں جنھوں نے تصنیف و تالیف اور تحقیق کے میدان میں بڑا کام کیا ہے اور ان کا ادبی و تخلیقی سفر اب بھی جاری ہے۔

خورشید جہاں نے انشائیے ہی نہیں، تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ ''جدید اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات'' نامی کتاب شائع ہو چکی ہے جو یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے ادبی سطح پر اہم کام کیے ہیں۔ انھیں اعزازات بھی ملے، سمیناروں اور کانفرنسوں میں ان کی شرکت اہمیت کی حامل رہی ہے۔ مختلف علمی و تہذیبی اداروں کی ذمہ داریاں بھی انھوں نے سنبھالیں۔ انھیں اپنے حسن عمل سے خوب صورت بنایا۔ ان کی زیر نگرانی پندرہ ادبی مقالات بھی لکھے گئے جن میں بیشتر شائع ہو چکے ہیں۔ ان پر پی ایچ ڈی کی ڈگریاں مل چکی ہیں۔ بعض زیر تکمیل مقالات میں ''غلام مرتضیٰ راہی۔ حیات و کارنامے'' بھی ہے جو جناب حسن نظامی، مرحومہ کی نگرانی میں مکمل کر رہے تھے، ابھی ونوبا بھاوے یونیورسٹی میں یہ مقالہ داخل نہیں ہوا۔ بہر حال زندگی تو کچھ اس طرح ہے، بقول اقبال:

جاوداں پیہم رواں ہر دم جواں ہے زندگی

بات اصل میں بنیادی طور پر خورشید جہاں کی انشائیہ نگاری پر تھی۔ ضمنی طور پر کچھ باتیں سامنے اس لیے لائی گئیں کہ اس مختصر تحریر میں کچھ جامعیت کا عنصر پیدا ہو جائے اور قارئین خورشید جہاں مرحومہ کی سرگرمیوں سے واقف ہو سکیں کہ ۵۶ سال کی عمر میں انھیں صرف ۳۶ سال ہی ایسے ملے تھے جس میں انھوں نے اپنا سب کچھ کام کر دیا۔ ایسا کام کہ انھیں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ اب ان کی مزید کتابیں جو زیرِ اشاعت ہیں، جب اشاعت پذیر ہوں گی تو ان کا مقام و مرتبہ خصوصاً انشائیہ نگاری کے میدان میں متعین ہو جائے گا۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ خورشید جہاں اگر کہیں کوئی سماجی برائی دیکھتی تھیں تو ان کا دل چیخ اٹھتا تھا۔ وہ قلم اٹھا لیتی تھیں اور لکھنے پر مجبور ہوتی تھیں۔ مگر افسوس ظاہر کرنے کا طریقہ ان کے یہاں دراصل بیدار کرنے کا طریقہ ہے۔ اس میں سوئے ہوئے انسان کو بیدار کرنے کے مختلف انداز ہوتے ہیں۔ خورشید جہاں اس ہنر سے واقف تھیں۔ اپنی فکر کے سیلِ بے باک و بے کراں کو شگفتہ لہجے میں ڈھال دیتی تھیں۔ ایک تازگی پیدا کر دیتی تھیں جو قاری کے لیے بے حد اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ دراصل یہ تحریریں اس طرح سے سماج پر ایک طنز ہوتی تھیں جن میں ذکر تو عام باتوں کا ہوتا تھا مگر انداز دل میں چبھ جانے والا ہوتا تھا۔ اپنے تخلیقی لمحوں میں خورشید جہاں پوری طرح اپنے فن کے ساتھ ہوتی تھیں۔ چنانچہ "شوگر نامہ" میں انھوں نے یہ بتانے کی کوشش کی کہ اگر کسی کو کوئی مرض ہو جائے تو ہر شخص کوئی نہ کوئی علاج بتاتا ہے۔ گویا قدم قدم پہ ہیں ناصح گلی گلی دلبر۔

"جب شوگر کی بیماری ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ گئی تو کچھ لوگوں نے مبارک باد دی کہ یہ امیروں کی بیماری ہے۔ گویا آپ کو امیری کی سند مل گئی ہے۔ کسی نے کہا کہ یہ انٹیلیکچولس کی بیماری ہے گویا آپ کا شمار انٹیلیکچولس میں ہونے لگا۔ کسی نے کہا کہ یہ بیماری ہی نہیں ہے، آپ پرہیز سے رہیں تو بالکل صحت مند رہیں گے۔ اس بیماری کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی جتنی قسمیں ہیں اس سے کہیں زیادہ اس کے معالج ہیں۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ آپ کو یہ روگ لگتے ہی جس سے ملاقات ہوگی وہ بطور ہمدردی ایک تیر بہدف علاج بتا دے گا۔ غرض جتنے منھ اتنی دوائیں۔ آپ اس پر عمل کرنے پر مجبور ہوں گے کیونکہ ہر قیمت پر اس سے چھٹکارا چاہتے ہیں۔

"ڈاکٹر نے شکر کا استعمال بالکل بند کر دیا ہے۔ ہم پہلے بھی میٹھی چیزیں کم ہی کھاتے تھے۔ اس لیے شکر چھوڑنے کا زیادہ غم نہیں ہوا۔ لیکن چاول، آلو چھوڑنا تکلیف دہ ثابت ہوا اس لیے پورے طور پر انھیں نہیں چھوڑ سکے۔"

اس تحریر میں یوں تو دیکھنے میں ایک تسلسل سا دکھائی دیتا ہے لیکن عدم تسلسل بھی موجود ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ سماج پر ایک طنز بھی ہے۔ یہ امر واقعی ہے کہ آج کے زمانے میں آپ یونہی کسی سے کسی بیماری کا ذکر کر دیں وہ فوراً دوا بتا دے گا۔ اسے تیر بہدف بھی بتائے گا۔ میں ایسا محسوس نہیں کرتا ہوں کہ انشائیہ نگاری

باقاعدہ صنف نہیں ہے، یقیناً ہے اور بعض اصناف سخن سے زیادہ بلند مقام پر فائز ہے۔ اس کی تاریخ قدیم ہے۔ انگریزی ادب تو اس سے بھرا پڑا ہے۔ لیکن تا حال اس بات کا طے نہ ہونا کہ انشائیہ کیا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس کے حق میں فال نیک ہے۔ اس نقطۂ نظر سے مزے سے باتیں کیجیے، جو چاہے باتیں کیجیے، یہاں تک کہ سنجیدہ موضوع پر بھی باتیں ہیں۔ میں ایسا محسوس نہیں کرتا ہوں کہ صرف غیر سنجیدہ باتیں ہی انشائیہ کے زمرے میں آتی ہیں۔ ایسی سنجیدہ تحریریں جو کسی خاص موضوع پر ہوں، جن میں ادبی چاشنی ہو، وہ انشائیہ ہو سکتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ناول نگاری، افسانہ نگاری، تاریخ نگاری یا صحافتی فن پارے انشائیہ نگاری کے زمرے میں نہیں آسکتے ہیں۔ یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ اس طرح کی مثالیں دوسری زبانوں میں ملتی بھی ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے ''چارلس لیمب'' کا حوالہ دیا ہے، جو انگریزی کا بڑا انشائیہ نگار ہے، علاوہ ازیں انھوں نے ڈاکٹر وزیر آغا کی چالیسویں سالگرہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ ہمیں بتاتے ہیں:

''اظہار ذات کے لیے انشائیہ نگار بالواسطہ طریق کار بھی اختیار کر سکتا ہے بلکہ بیشتر انشائیہ نگار اس طریقہ کو اپناتے ہیں۔ ایسے ادب پارے میں انشائیہ نگار اپنی ''میں'' کو یوں سامنے لاتا ہے کہ قاری کو اس کا احساس تک نہیں ہونے دیتا۔ اس مقصد کے لیے زندگی میں بھی بظاہر غیر اہم پہلوؤں کو لیتے ہوئے اپنی باتوں کو فنی اہمیت بخشتا ہے۔ جس کے لیے وہ منفرد اور بعض اوقات انوکھے یا چونکا دینے والے زاویہ ہائے نگاہ سامنے لاتا ہے۔ مسلم الثبوت اقدار اور معیاروں کا ایسے انداز سے تجزیہ کرتا ہے کہ ڈھول کا پول کھل جائے۔ الغرض وہ زندگی اور اس کے متنوع مظاہر کو نئے نئے معنی بخشتا ہے۔ انشائیہ ایک مہذب ذہن کی پیداوار ہے اور مہذب قاری ہی اس کا لطف اٹھا سکتا ہے۔ یہ انفرادیت کا اظہار تو ہے، ابلاغ ذات بھی ہے، نرگسی میلانات کا حامل بھی۔ مگر یہ سب چیزیں جس لطافت سے انشائیہ کی شکل میں جلوہ پیرا ہوتی ہیں وہ بڑا ریاض چاہتی ہیں۔''

خورشید جہاں کے انشائیوں میں فلسفے کی گراں باری نہیں ہے بلکہ وہ لطافت کارفرما ہے جو ایک تخلیق کار کے یہاں ہونی چاہیے لیکن میں نے ہمیشہ یہ بات محسوس کی ہے کہ فن پاروں میں جہاں تمام باتیں ہوتی ہیں فن پارہ یہ بھی بتاتا ہے کہ اس کا خالق مرد ہے یا عورت۔ میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ نسائیت کی لچک خواتین کی تحریروں میں فطری طور پر ہوتی ہے جو مرد تخلیق کاروں کے یہاں نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مزاج کا ہی ایک حصہ ہو سکتا ہے اور یہ بالکل فطری بات ہے، خورشید جہاں کے یہاں بھی یہ کیفیت پائی جاتی ہے۔ ان کے انشائیوں میں یہ کیفیت سب سے زیادہ نمایاں ہوئی ہے، لیکن انشائیہ ''من کہ'' میں زیادہ اہمیت سے آئی ہے۔ حالانکہ تقریباً تمام انشائیوں میں کچھ نہ کچھ منفرد انداز ہے اور حس کا احساس مسلسل ہوتا رہتا ہے اور یہی کیفیت تحریر کے حسن کو دوبالا کر دیتی ہے۔ ایک اقتباس دیکھیے جس میں ایک لفظ ''ورا'' سے کیا کیا باتیں پیدا کی گئی ہیں

"بانگ درا۔ بانگ درا" میں نے یہ لفظ دو تین مرتبہ دہرایا۔ اچانک میرے ذہن کے کسی گوشے میں اس کا مطلب کلبلانے لگا۔ بانگ کا مطلب ہے کہ مرغے کی مخصوص آواز جو وہ ہمیں جگانے کے لیے حلق سے نکالتا ہے۔ لڑکیوں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ "درا" دراصل درے سے بنا ہے مگر یہاں شاعر کی مراد مرغ کے دربے سے ہے جہاں صبح صبح مرغ بانگ دیتا ہے۔ اس طرح "بانگ درا" کا مطلب ہوا دربے سے ابھرنے والی آواز جو صبح کا پیغام دیتی ہے۔"

انشائیہ نگار، انشائیے میں اس طرح کا کمال پیدا کرلے یہ بڑی بات ہے کہ اہم ترین سنجیدہ الفاظ سے مضحک بے معنی یا مزاحیہ لفظوں کو پیدا کرلے، حالانکہ خورشید جہاں نے ایسے مواقع پر بے معنی لفظ نہیں پیدا کیے ہیں لیکن "درا" دراور دربے کا تصور پیدا کرنا ان کی اعلیٰ تخلیقی صلاحیت کا کارنامہ ہے۔

میں نے ان کے سارے انشائیوں میں ایک زیریں لہر اس انداز کی محسوس کی ہے جس میں عرفان ذات کا جلوہ ہے۔ انھوں نے عمر مختصر پائی لیکن وہ تمام کیفیات کو اپنے لفظوں میں سمیٹ لینا چاہتی تھیں اور انشائیوں کے نت نئے پیکر تخلیق کرنا چاہتی تھیں۔ واقعی اگر ان کی زندگی وفا کرتی تو یقیناً ہم بہت سے اہم ترین انشائیوں سے متعارف ہوتے جس میں زندگی کے تلخ و شیریں ذائقے ہوتے لیکن پھر بھی ان کی ان کوششوں کو کسی طرح بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا اور ناقدین ادب ان پر توجہ دیتے رہیں گے۔

☆☆☆

’’جدید اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات‘‘: ایک جائزہ

رئیس انور

اردو زبان و ادب کا بنیادی مزاج جمہوری اور عوامی ہے۔ اس کا دامن ہمیشہ آس پاس کی بولیوں، زبانوں اور ادبی لہروں کو سمیٹنے کے لیے کھلا رہا ہے۔ ابتدأ ہندوی اور برج بھاشائی عناصر و عوامل میں فارسی رنگ و بو کی آمیزش سے اس کا ارتقا ہوا۔ پھر گنگا جمنی روایت بنی مگر انگریزی زبان و ادب کے چلن کے بعد استفادے کی ایک اور راہ نکلی۔ نئی اور تازہ کار صنفیں اور ہیئتیں رائج ہوئیں۔ نثر میں ناول، افسانہ اور انشائیہ کے علاوہ تنقید بڑے شدومد کے ساتھ ابھری۔ یوں تو تنقید کا ہلکا پھلکا رواج اردو میں پہلے بھی تھا مگر انگریزی میں مبادیاتِ ادب کی جس طرح پرکھان کی جاتی ہے، اردو میں یہ وصف ناپید تھا۔ حالؔی کا احسان ہے کہ انھوں نے بڑی سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا اور جو کچھ ان کے فہم و شعور میں سما سکا، اسے بڑے آسان اور سلجھے ہوئے انداز میں اردو والوں کے سامنے رکھا جس سے سوچ بچار اور مطالعے کا ایک نیا رخ سامنے آیا اور تنقید کے تعلق سے ۱۸۹۳ء والی تحریر ہی دراصل بیسویں صدی میں ایک مطالعاتی اور انجذابی تحریک بن گئی۔

امداد امام اثر، عبدالرحمٰن بجنوری، سجاد ظہیر، مجنوں گورکھپوری، فراق گورکھپوری، محمد حسن عسکری، کلیم الدین احمد، شمس الرحمٰن فاروقی، وزیر آغا، محمد حسن، قمر رئیس، اسلوب احمد انصاری، عبدالمغنی، وہاب اشرفی، ابوالکلام قاسمی وغیرہ ایسے نقاد ہیں جنھوں نے ایک صدی کے دوران مغربی تنقید کے ان رجحانوں کا مطالعہ کیا جن سے بین الاقوامی سطح پر ادب متاثر ہوا ہے۔ ان نقادوں کے ذریعے مغرب کے نئے تنقیدی نظریوں کا اطلاق بھی ہوا اور نظریہ سازی کے لیے ماحول بھی تیار ہوا۔ اردو میں تنقید کی کثیر الجہات ترقی کے سلسلے میں ان قلم کاروں کی خدمات کا اعتراف لازمی ہے جنھوں نے مغربی تنقید کی کئی کتابوں کا اردو ترجمہ کیا یا مغربی افکار اور نظریوں پر تفصیلی گفتگو کی۔ نیز اردو تنقید پر ان کے اثرات کا احاطہ کیا۔ ایسے نقادوں میں ڈاکٹر خورشید جہاں ایک ممتاز مقام رکھتی ہیں۔ عموماً خاتون تنقید نگار خالص تنقیدی مباحث سے دور رہی ہیں مگر ڈاکٹر خورشید جہاں نے بڑی سلامت روی سے یہ ہفت خواں طے کیے ہیں اور ’’جدید اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات‘‘ جیسی علمی کتاب پیش کی۔ انھوں نے جس انہماک، وقتِ نظر اور عالمانہ اختصار کے ساتھ نظریاتی بحثوں کو قلم بند کیا، اس سے ان کے پختہ شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ ۲۰۴ صفحوں کی اس کتاب میں دوسرے اندراجات کے علاوہ یہ سات ابواب ہیں:

۱۔ مغرب میں تنقید اور اس کا ارتقا

۲۔ تنقید کے مختلف دبستان اور ان کے بنیادی اصول

۳۔ رومانی و نفسیاتی تنقید

۴۔ تاریخی، مارکسی و سائنٹفک تنقید

۵۔ عملی تنقید

۶۔ اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات

۷۔ جدید اردو تنقید پر امریکی تنقید (نئی تنقید) کے اثرات

سارے ابواب بڑے معلوماتی اور کارآمد ہیں۔ کہیں بہت اختصار سے کام لیا گیا ہے اور کہیں تفصیل سے۔ ہر باب مغرب کے ان سرچشموں کی طرف ضرور اشارہ کرتا ہے جن سے کسی نہ کسی سطح پر اردو تنقید متاثر ہوئی ہے۔ پہلے باب میں افلاطون کی جمہوریہ، ارسطو کی بوطیقا، ہوریس کی آرٹس پوئیکا اور لانجائنس کی 'اون دی سلائم' کے علاوہ دانتے، فلپ سڈنی، کولرج، گوئٹے، سانت بیو، میتھو آرنلڈ، رسکن، والٹر پیٹر، ٹالسٹائی، ہنری جیمس، کروچے، آئی اے رچرڈس، کرسٹوفر کاڈویل، ایلیٹ وغیرہ ایسے مفکر قلم کار ہیں جنھوں نے مغربی ادبیات میں رجحان سازی کی اور بحث و مباحثے، غور و فکر اور ترمیم و تنسیخ کا ایک نیا منظر نامہ سامنے آیا جس کی خوش گوار رنگینی سے مشرقی شعر و ادب میں نئی چمک پیدا ہوئی۔

دوسرے باب میں رسکن، آسکر وائلڈ، والٹر پیٹر اور اینگارن کے حوالے سے تاثراتی اور جمالیاتی تنقید پر روشنی ڈالتے ہوئے دونوں کے درمیان خط فاصل کھینچا گیا ہے، نیز ڈاکٹر شارب ردولوی نے اپنی کتاب "جدید اردو تنقید، اصول و نظریات" میں جو دونوں کو گڈمڈ کر دیا ہے، اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اس کے بعد والے باب میں رومانی اور نفسیاتی تنقید کو فرائڈ اور یونگ کی تشریحات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں اردو کے تنقیدی سرمائے کا جائزہ لیتے ہوئے حالی، آزاد، شبلی، سلیم پانی پتی، رسوا، میراجی، شبیہ الحسن، وزیر آغا اور ریاض احمد کی تحریریں زیر بحث آئی ہیں۔

چوتھا باب اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں اردو تنقید پر ایک لمبے عرصے تک سایہ فگن رہنے والے تین نظریوں...... تاریخی، مارکسی اور سائنٹفک کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ افلاطون سے لے کر مارکس اور اینگلز تک کے تاریخی اور سماجی نظریوں سے واقف کراتے ہوئے مغرب کے مارکسی نقادوں ایلیک ویسٹ، جارج تھامس، جارج لوکاس، فلپ سڈنی وغیرہ کا سرسری طور پر ذکر کیا ہے۔ پھر اردو کے نامور نقادوں...... حالی، آزاد، اختر حسین رائے پوری، سجاد ظہیر، احتشام حسین، مجنوں گورکھپوری، عبدالعلیم، اختر انصاری، سردار جعفری، ممتاز حسین، عبادت بریلوی، محمد حسن، اسلوب احمد انصاری، ظ۔ انصاری، قمر رئیس اور سید محمد عقیل کی کارگزاریوں پر اجمالی گفتگو کی ہے۔

عملی تنقید کے لیے ایک الگ باب ہے جو بظاہر محض سات صفحوں میں سمٹا ہوا ہے مگر حقیقتاً گاگر میں ساگر کی ایک مثال ہے۔ اس میں سب سے پہلے عملی تنقید کا ایک ہیولیٰ پیش کرنے والے ڈرائیڈن سے لے کر جانسن، میتھو آرنلڈ، کالرج، ایلیٹ، رچرڈ سن، اوسلن اور میکیان تک کا تذکرہ ہے اور ان میں سے چند قلم کاروں کے اندازِ نظر کا تعارف بھی موجود ہے۔ پھر اردو کے عملی نقادوں کی کارکردگی پر تبصرہ کرتے ہوئے ''یادگارِ غالب'' کے تحت حالیؔ، اور 'شعر العجم' کے حوالے سے شبلیؔ پر رائے زنی کی ہے۔ ویسے کلیم الدین احمد اور شمس الرحمٰن فاروقی کو عمدہ عملی نقاد قرار دیا ہے۔

چھٹا باب بہت طویل اور مفصل ہے۔ اسے دیکھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ پچھلے پانچ ابواب دراصل تمہیدی حیثیت رکھتے ہیں کیوں کہ اس میں حالیؔ، آزادؔ، شبلیؔ، امداد امام اثرؔ، مہدی افادی، عبدالرحمٰن بجنوری، عبدالقادر سروری، محی الدین قادری زورؔ، مجنوں گورکھپوری، فراق گورکھپوری، سردار جعفری، اختر حسین رائے پوری، سید احتشام حسین، عزیز احمد، محمد حسن، ممتاز حسین، محمد حسن عسکری، آل احمد سرور، اختر اورینوی، کلیم الدین احمد، محمد احسن فاروقی وغیرہ کی تحریروں اور اندازِ نظر سے بحث کی ہے۔ اس سلسلے میں نقادوں کی رایوں سے بھی مدد لی ہے۔ یہ تجزیہ اعتدال پسندانہ ہے اور اس سے اردو کے ان نامور نقادوں کی تنقیدی کاوشوں میں مغربی فکر و نظر کے عمل دخل کا بھرپور علم ہوتا ہے۔

آخری باب اپنے عنوان ہی سے پُرکشش ہے۔ ہر چند یہ بھی بہت مختصر ہے، اس میں امریکی نظریہ سازوں کے حوالے سے وزیر آغا، شمس الرحمٰن فاروقی، عبدالمغنی، شمیم حنفی، باقر مہدی، ابن فرید، شکیل الرحمٰن، گوپی چند نارنگ، وارث علوی، محمود ہاشمی، وہاب اشرفی، سید محمد عقیل وغیرہ کی تنقیدی نگارشات کا ذکر ہے مگر حد درجہ اختصار کی وجہ سے جابجا تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ اگر اسے اقتباسوں اور تعبیر و تجزیہ سے مزین کر کے مزید کارآمد بنایا جاتا تو کتاب کے نام سے قاری کے ذہن میں ابھرنے والے تصور یا توقع کو کماحقہٗ پورا کیا جا سکتا تھا۔

بہرحال ہر کتاب میں سدھار کی گنجائش رہتی ہے۔ اس میں بھی بہتری لائی جا سکتی ہے۔ موجودہ صورت میں یہ کتاب اردو تنقید اور اس کے متعلقات کا ایک ایسا جائزہ ہے جو تقریباً سو برس کی تنقیدی سرگرمیوں پر مشتمل ہے۔ اس میں کم از کم چار پیڑھیوں کے تجزیاتی عمل میں مغربی افکار و نظریات کی کارفرمائی پر روشنی ڈالی ہے۔ ان چار پیڑھیوں میں انگریزی سے ترجمہ کی ہوئی تحریروں کے ذریعے یا براہ راست استفادہ کرنے اور لکیر پکڑ کر چلنے والی پیڑھی بھی ہے۔ مغربی افکار کے زیرِ اثر مشرقی ادبیات کو ہیچ سمجھنے والی احساسِ کمتری میں مبتلا پیڑھی بھی ہے۔ مغربی اصولوں اور نظریوں کو اردو کے مزاج میں ڈھالنے والی بھی ہے اور مغرب و مشرق کے صحت مند عناصر کی مدد سے نئی تھیوری بنانے والی پیڑھی بھی ہے۔ اس طرح مصنف نے ضمنی طور پر بڑی خوبصورتی سے اردو تنقیدی نظریوں کی ایک ایسی ارتقائی تصویر پیش کر دی ہے جس پر مغربی رنگ و روغن بھی چڑھا ہوا ہے۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ شعر و ادب کی تنقید ادب کی تخلیق کی طرح ایک مشکل اور نازک کام ہے اور تنقیدی ادب کا محاسبہ اس سے بھی زیادہ کٹھن ہے۔ یہ نہایت خشک اور فلسفیانہ شغل ہے۔ اس نوع کے کام میں خواتین نے کم ہی حصہ لیا ہے۔ ڈاکٹر خورشید جہاں نے بڑی حوصلہ مندی اور مستقل مزاجی سے جوکھوں کا کام کیا ہے۔ پیچیدہ اور پھیلے ہوئے مواد کو انھوں نے جس سلیقے سے اکٹھا کیا ہے، ترتیب و تزئین کے مرحلے سے گزار کر ایک معلوماتی کتاب کے قالب میں بھر دیا ہے، وہ کوئی صاحب علم ہی کر سکتا ہے۔ ان کا یہ کہنا بجا ہے کہ "یہ کتاب مطالعے کے نئے امکانات کا اشاریہ ضرور مرتب کرتی ہے۔" یقیناً ان کی اس علمی کاوش سے اردو تنقید کا مطالعاتی دائرہ بھی وسیع ہوتا ہے اور ارتقا کی منزلوں سے بھی واقفیت ہوتی ہے۔ یہی امر اس کی اہمیت کا اہم جواز ہے۔

☆☆☆

نمونہ تحریر

بساطِ شوق

پروفیسر خورشید جہاں

ہم اپنے گھریلو خرچ کا بجٹ خواہ کتنی محنت سے کیوں نہ بنائیں، ہر ماہ کوئی نہ کوئی گڑ بڑ ضرور ہو جاتی ہے اور مہینے کے آخر میں پیسوں کی کھینچا تانی شروع ہو جاتی ہے۔ آخر ہم ایسا کیا کرتے ہیں۔ ہمارا سوچا سمجھا قدم کہاں غلط پڑ جاتا ہے کہ ہم لڑکھڑا کر رہ جاتے ہیں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

تنخواہ ملتے ہی ہم سب سے پہلے مہینے بھر کے راشن کا حساب کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی روزمرہ کے استعمال کی چھوٹی موٹی لیکن ضروری چیزوں کی لسٹ بناتے ہیں اور بازار کی طرف چل پڑتے ہیں۔ سیٹھ کی دکان پر پہنچ کر سامان کی فہرست سیٹھ کے حوالے کر دیتے ہیں۔ وہ فہرست پر نظر ڈالتے ہی شروع ہو جاتا ہے۔

ہارلکس لینا ہے تو میں آپ کو دکھاتا ہوں، یہ ایک کلوگرام ہارلکس کا جار ہے۔ ایک ہی پیس بچا ہے جو میں نے خاص طور پر آپ کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔ ایک بڑا جار تو سامان رکھنے کے لیے ہو ہی جائے گا۔ ساتھ ہی ہارلکس پینے کے لیے ایک مگ بھی مفت ہے۔

ہمیں ۵۰۰ گرام کی شیشی چاہیے، مگر ہم فوراً سوچتے ہیں "ہارلکس تو ہمیں برابر لینا ہوتا ہے کیوں نہ یہ بڑا ہی لے لیں مگ بھی مل جائے گا۔ دوسرے مہینے ہم ہارلکس نہیں لیں گے۔ سو ایڈ انہیں اور ہم پانچ سو گرام کے بجائے ایک کلوگرام کا جار خرید لیتے ہیں۔

ڈٹرجنٹ پاؤڈر کون سا؟ دکاندار ہمارے بتانے سے پہلے ہی کہہ اٹھتا ہے۔ ہم دیتے ہیں آپ کو ڈٹرجنٹ پاؤڈر۔ بالکل نیا آیا ہے۔ ابھی بازار میں اس کی بہت مانگ ہے۔ ڈھائی کے جی پیکٹ پر ایک نہانے کا صابن فری ہے۔ ہم سوچتے ہیں جب پاؤڈر خریدنا ہی ہے تو اس نئے پاؤڈر کو آزما کر کیوں نہ دیکھا جائے۔ سارے ڈٹرجنٹ پاؤڈر ایک ہی جیسے ہوتے ہیں، پر اس میں نہانے کے صابن کی ٹکیہ مفت ہے تو کچھ نہ کچھ تو بچت ہے ہی اور ہم ایک کے جی کی جگہ ڈھائی کے جی کا ڈٹرجنٹ پاؤڈر خرید لاتے ہیں۔

برتن صاف کرنے کا پاؤڈر لینا ہے تو یہ لیجیے میڈم ایک کے جی پاؤڈر پر ایک کے جی پاؤڈر فری۔ یعنی ایک کے جی کے دام میں دو کے جی پاؤڈر لے جائیے اور ہم دکاندار کے دام میں پھنس جاتے ہیں۔

گلوکوز کا جار خریدیے مگ لے کر جائیے۔ میگی کے دس پیکٹ خریدیے بچوں کے لیے فلائنگ ڈش

لے جائیے۔ شیونگ کریم کا بڑا ٹیوب لیجیے ساتھ میں شیونگ لوشن فری۔ ٹیلکم پاؤڈر کا لارج سائز لیجیے۔ دس روپے کی چھوٹ۔ سرسوں تیل اگر پندرہ کلوگرام لیں گی تو پلاسٹک کا بڑا جار مفت۔ بعد میں کوئی سامان اس میں رکھیے۔ یہ اسکواش لیجیے، ایک ٹوتھ پیسٹ ۵۰ گرام اس کے ساتھ بالکل مفت۔

اس طرح کا لالچ ہر مہینے ہمیں دیا جاتا ہے اور ہم ایک پنتھ دوکاج کے اصول پر عمل کرتے ہوئے بے ضرورت ہی ایک کے جی کی جگہ ڈھائی کے جی اور ایک صابن کی ٹکیہ کی جگہ دو اور تین خریدتے رہتے ہیں۔ جب کوئی چیز ضرورت سے زیادہ گھر میں موجود ہو تو اس کا استعمال بھی بڑی فراخ دلی سے کیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوسرے مہینے وہ ساری ضرورتیں پھر منھ پھاڑے کھڑی ہو جاتی ہیں۔ مثلاً برتن صاف کرنے کا پاؤڈر بڑے ڈبے میں بھرا ہوا دیکھ کر آپ کی ملازمہ اس کا بے دردی سے استعمال کرتی ہے۔ ذرا چکنائی صاف کرنے کے لیے مٹھی بھر پاؤڈر استعمال کرنے میں اسے کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی، بلکہ مٹھی بھر پاؤڈر وہ اپنے گھر کے برتن صاف کرنے کے لیے بھی ہر روز رکھ لیتی ہے۔

کپڑوں کی دھلائی کے معاملے میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ ملازمہ زیادہ محنت کیوں کرے۔ بڑا سا ڈبہ موجود ہے۔ دو چار ہی کپڑے دھونے ہوں تو بھی اتنا ہی پاؤڈر خرچ کرتی ہے جتنے میں درجن بھر کپڑے دھل جائیں۔

مفت میں ملے ہوئے ٹوتھ پیسٹ اور برش کا استعمال بھی بے جا ہوتا ہے۔ کچھ بچوں کو ٹوتھ پیسٹ کھانے کا شوق ہوتا ہے، ہم اس کی زیادہ پرواہ نہیں کرتے کہ اول تو مفت ملی ہے، پھر گھر میں ضرورت سے زیادہ ہی موجود ہے۔ سبھوں کے لیے الگ الگ ٹوتھ پیسٹ ہونے کے باوجود مفت کے چکر میں ایک فیملی سائز ٹوتھ پیسٹ کا ٹیوب بھی ہمیشہ موجود ہوتا ہے۔ ٹوتھ برش سب کے پاس ہیں۔ پھر بھی مفت ملے ہوئے برشوں کی ایسی بھرمار ہوتی ہے کہ کوئی اس سے چپلیں صاف کر رہا ہے کوئی برتن کے میل چھڑا رہا ہے۔ کسی نے واش بیسن کی صفائی کے لیے رکھ چھوڑا ہے، کوئی اپنی بنائی ہوئی اسکیچ پر رنگ اسپرے کر رہا ہے تو کوئی اپنے دوستوں اور رشتہ داروں میں فراخ دلی سے تقسیم کر رہا ہے۔ مال مفت دل بے رحم۔ مفت میں ملی ہوئی چیزوں کی بھرمار ہو جاتی ہے تو ہم دکاندار کو منع کرتے ہیں کہ ہمارے پاس بہت ہیں تو کہنے لگتے ہیں:

''کوئی بات نہیں آپ کو اس کی قیمت مل جائے گی۔'' اور ہم بچتے بچتے پھر اس کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ پانچ دس روپے کے لالچ میں دس کی جگہ بیس اور بیس کی جگہ پچاس روپے کا سامان خرید لیتے ہیں۔

کپڑوں کی دکان میں جائیے۔ ساڑیوں کی سیل لگی ہوئی ہے۔ کہیں چادریں آدھی قیمت پر مل رہی ہیں، کہیں پردوں پر چھوٹ ہے اور ہم ان رعایتوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک کی جگہ کئی کئی ساڑیاں یہ سوچ کر خرید لیتے ہیں کہ ہر موقع پر ایک نئی ساڑی پہننے کو مل جائے گی اور پیسے بھی بہت کم لگیں گے۔ ایک قیمتی ساڑی پر جو

پیسے لگ رہے ہیں اتنے ہی پیسوں میں دو قیمتی ساڑیاں مل رہی ہیں تو کیا بُرا ہے۔ چادروں کی ضرورت ہو نہ ہو سستی سمجھ کر ہم انھیں بھی پیک کروا لیتے ہیں۔ پردے بدلنے کی ضرورت روز روز نہیں ہوتی، مگر ہم اس کے سیٹ بھی خرید لیتے ہیں۔ اس طرح الماریوں میں بے تحاشا کپڑے ٹھنستے چلے جاتے ہیں۔ ایسی سیل ہمیشہ کسی نہ کسی شاپ پر لگی رہتی ہے۔

آج کل damaged ساڑیوں کے نام پر گھریلو بجٹ damage ہوتا رہتا ہے۔ وہ ساڑیاں جن پر برائے نام کوئی خرابی ہے جو غور کرنے پر بھی دکھائی نہیں دیتی ان کی سیل لگی رہتی ہے جن کے اشتہارات ریڈیو اور ٹی وی پر بھی آتے رہتے ہیں۔ ان مراکز کے پتے بتائے جاتے ہیں جہاں جہاں یہ سیل لگی ہوئی ہے۔ ایک تہائی اور ایک چوتھائی داموں پڑنے والی پُرکشش ساڑیاں ہمیں زبردستی اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔

ہمیں زیر کرنے کا ایک اور حربہ بھی ہے جو بہت کارگر ثابت ہوتا رہا ہے۔ کسی دکان پر عورتوں کی زبردست بھیڑ دیکھ کر ہم بھی وہاں پہنچتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ پانچ ہزار کے کپڑوں کی خریداری پر اسٹیل کا ایک ڈنر سیٹ، تین ہزار پر ٹی سیٹ، دو ہزار پر چھ پلیٹیں، ایک ہزار پر چار گلاس اور پانچ سو پر دو گلاس۔ اس سے نیچے کوئی گفٹ نہیں۔ ہم بظاہر سگھڑاپے اور سلیقہ مندی کا ثبوت دیتے ہیں اور اسٹیل کے برتنوں پر ہونے والے خرچ کو بچا لیتے ہیں۔ جبکہ برتنوں سے کہیں زیادہ خرچ ہم اپنے کپڑوں کی خریداری پر کر چکے ہیں۔ ہم ضرورت بھر ہی کپڑے خریدتے اور بقیہ پیسوں سے برتن خرید لیتے تو زیادہ عقل مندی کی بات ہوتی لیکن نہیں، ہم پر تو مفت، فری اور گفٹ کا بھوت سوار ہوتا ہے:

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا

ایک جوڑی چپل گھر میں استعمال کے لیے خریدنی ہے، جوتے کی دکانوں سے گزرتے ہوئے ہم نے کہیں Reduction یا Sale کا کارڈ لگا ہوا دیکھ لیا اور اسی دکان میں گھس پڑے۔ چپل صرف اپنے لیے لینی تھی۔ لیکن باہر نکلے تو شوہر، بیٹی، بیٹا سب کے لیے ایک ایک جوڑی چپلوں کے ڈبے بھی ساتھ ہو لیے۔ بلکہ کبھی کبھی پورے سال کے استعمال کے لیے اسٹاک کر لیا گیا۔

اب آپ ہی بتائیں ہم سے غلطی کہاں ہوئی؟ ہم نے تو دنیا بھر کی عقل مندی دکھائی۔ سمجھ داری اور اچھی سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا، پھر بھی ہمیں فضول خرچ ہونے کا طعنہ دیا جاتا ہے۔

اب ہمیں کیسے معلوم ہوتا کہ جتنی چیزیں ہم خرید رہے ہیں، وہ ہمیں ایسے منظر دکھائیں گی کہ......!

☆☆☆

جہانِ ادب

- صبا اکرام کو ہندی اردو ساہتیہ اکیڈمی، لکھنؤ کا ادبی ایوارڈ دیا گیا۔

کراچی میں مقیم اردو کے معروف شاعر اور نقاد صبا اکرام کو "ہندی اردو ساہتیہ اکیڈمی،" لکھنؤ کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ یہ ایوارڈ انھیں ۵/اپریل ۲۰۰۸ء سے ۷/اپریل ۲۰۰۸ء کے دوران منعقدہ ٔ جشن قرۃ العین حیدر' سیمینار کی افتتاحی تقریب کے موقع پر تفویض کیا گیا جس کی صدارت ہریانہ کے گورنر جناب اے۔ آر۔ قدوائی نے کی جب کہ مہمانِ خصوصی جھارکھنڈ صوبہ کے گورنر سید سبط رضی تھے۔

واضح رہے کہ ہندی۔ اردو ساہتیہ اکیڈمی لکھنؤ کی یہ اعزازی تقریب ہر سال بڑے پیمانے پر منائی جاتی ہے۔ اس کے روحِ رواں جناب اطہر نبی اور کنونیز وتی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر ارتضیٰ کریم ہیں۔

اس موقع پر منعقدہ قرۃ العین حیدر پر سیمنار کی مجلسِ صدارت میں ڈاکٹر شارب ردولوی، جناب عابد سہیل، کناڈا میں مقیم افسانہ نگار رضا الجبار اور کراچی کے صبا اکرام شامل تھے، جب کہ نظامت ڈاکٹر ارتضیٰ کریم کے ذمے تھی۔ مقررین میں میرٹھ یونیورسٹی کے ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، علی گڑھ یونیورسٹی کے صغیر افراہیم اور سیما صغیر اور مقامی مقررین میں وارث کرمانی کے علاوہ کئی اور ادیب شامل تھے۔

اس ایوارڈ کے ملنے پر ادارہ "روشنائی" صبا اکرام کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہے۔

- پچھلے دنوں آرٹس کونسل آف پاکستان کی ادبی کمیٹی کے زیرِ اہتمام سینئر صحافی اور قلم کار محترمہ حمیرا اطہر کے فکاہیہ کالموں کی کتاب "بات سے بات" کی تقریب پذیرائی زیرِ صدارت پروفیسر سحر انصاری منعقد ہوئی جس میں مہمانِ خصوصی بھارت سے آئے ہوئے نامور شاعر وسیم بریلوی تھے جبکہ مہمان اعزازی جناب عبدالحسیب خاں تھے۔ نظامت کے فرائض علی حسین ساجد نے انجام دیے۔ تلاوت کلام پاک کی سعادت قاری احتشام الحق مفتی نے اور نعت رسول مقبول محمد رفیق رانا نے پیش کی۔

آغا نور محمد پٹھان نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ یہ مصنفہ کی ساتویں کتاب ہے، اس میں چالیس کالم شامل ہیں۔ طنز و مزاح کی کتاب مفرح القلوب کا کام کرتی ہے۔ ہمارے یہاں کراچی میں فکاہیہ ادب کم لکھا جا رہا ہے۔ اکادمی ادبیات کی طرف سے ہم نے انعام دینے کا اعلان کیا تھا اور کراچی سے صرف ایک کتاب اس مقابلے میں موصول ہوئی جبکہ لاہور میں برابر ایسی کتابیں شائع

ہورہی ہیں۔ محترمہ ش۔فرخ نے کہا کہ اچھے کو گھر تک پہنچانا اور بُرے کو انجام تک پہنچانا حمیرا کا کام ہے۔ ان کے جملے گھمیوں کی طرح پھوٹتے ہیں اور پتھر کی طرح گنجے کے سر پر پڑتے ہیں۔ اخبار خواتین میں ہمارا ان کا ایک لمبے عرصے تک ساتھ رہا۔ وہ بے حد ملنسار اور وقت پر کام آنے والی خاتون ہیں۔ سماجی مسائل پر ان کے کالم بے حد متاثر کرتے ہیں اور وہ حقائق کو بلا کم و کاست بیان کر دیتی ہیں۔ جناب رضوان صدیقی نے کہا کہ حمیرا اطہر نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اسے نہایت سہل، رواں اور شگفتہ انداز میں تحریر کیا ہے۔ ان کالموں میں معلومات کے ساتھ طنز و مزاح کا ملا جلا سواد بھی حاصل ہوتا ہے۔ وہ پہلی خاتون صحافی ہیں جنھوں نے مسز اندرا گاندھی سے انٹرویو لیا اور اے پی این ایس سے تین بار انعام حاصل کیا۔ انھوں نے صرف حافظے کی بنیاد پر لندن کے سفر کے بارے میں خوب صورت کالم لکھے ہیں۔ جناب عبدالحسیب خاں نے کہا کہ حمیرا ہمارے موجودہ معاشرتی حالات پر قلم اٹھاتی ہیں۔ سیدہ یا نے عام آدمی بالخصوص غریبوں کی زندگی کے بارے میں بھی قلم نہیں اٹھایا۔ حالانکہ ان کے ناگفتہ بہ حالات زندگی ہماری توجہ کے مستحق ہیں۔ گاؤں دیہات کے لوگ چار ہزار چھ سو روپے تنخواہ میں کیسے گزارہ کرتے ہیں اس کا کسی کو اندازہ نہیں۔ ان پر بھی لکھا جانا چاہیے۔ مہمان خصوصی ممتاز شاعر جناب وسیم بریلوی نے کہا کہ میں آرٹس کونسل کی ادبی کمیٹی کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کی تقریب رونمائی منعقد کی اور دلچسپی لی۔ آج اتنی بڑی تعداد میں لوگ جمع ہو گئے ہیں جب کہ ہمارے یہاں (بھارت) میں چند لوگ ہی ایسی تقاریب میں شرکت کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ حمیرا اطہر کے وکاہیوں کا جہاں تک تعلق ہے ان میں بے باکی، بے لاگ سچائی اور اس سے بڑھ کر ان وکاہیوں میں جھانکتی ہوئی سیاسی، سماجی، تہذیبی، ثقافتی اور ادبی دردمندی نے مجھے خاصا متاثر کیا۔ بسا اوقات ایک دن کی خبر پوری زندگی بن جاتی ہے۔ جب تک آپ روایت اور سماج سے مخلص نہیں ہوں گے اس وقت تک وکاہیہ کو کامیابی سے تحریر نہیں کر سکیں گے۔ اس کے بعد انھوں نے چند اشعار اور ایک نظم "امانت" پیش کی جسے حاضرین نے بے حد پسند کیا۔ صدر گرامی جناب سحر انصاری نے کہا کہ حمیرا نے اسی شہر میں اپنا ایک وقار قائم کیا ہے۔ کالم نگاری ان کا محبوب شعبہ ہے۔ ان کے مزاج میں طنز و مزاح کی خصوصیت موجود ہے جس سے ان کے بیدار ذہن کا اندازہ ہوتا ہے۔ میں انھیں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ محترمہ حمیرا اطہر نے تمام شرکا، اور اپنے استادوں کا شکریہ ادا کیا جو آج یہاں موجود تھے۔ اسکول اور کالج کے پرانے اساتذہ کو جنھوں نے ان کی ذہنی تربیت کی اور اس قابل بنایا کو انھوں نے زبردست خراج تحسین پیش کیا۔ انھوں نے ایک مختصر سا مضمون بھی پیش کیا۔ آخر میں ان کے شوہر جناب رشید بٹ نے اپنے

تاثرات بیان کیے اور تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

- معروف کہنہ مشق شاعر اور ادیب جناب مشتاق شبنم ۲۶ مارچ ۲۰۰۸ء کو اورنگی ٹاؤن کراچی میں اچانک انتقال کر گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین۔
وہ ۱۹۳۸ء میں پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ ان کی عمر ۷۰ برس تھی اور پچھلے کئی برسوں سے ان کی آواز بند ہوگئی تھی، غالباً انھیں گلے کا کینسر تھا۔ انھوں نے شاعری اور نثر دونوں کو ذریعہ اظہار بنایا۔ وہ پچھلے پچاس سال سے شاعری کر رہے تھے۔ پٹنہ میں ان کے استاد ازعظیم آبادی تھے۔ مشتاق شبنم نے اورنگی میں رہ کر نوجوان نسل کی شعری تربیت کی۔ ان کے بہت سے شاگرد ہیں۔ افسوس ان کا کوئی شعری مجموعہ شائع نہ ہوسکا۔ اس کام کو اگر ان کے اہل خانہ اور شاگرد کرسکیں اور ان کا مجموعہ کلام منظر عام پر آجائے تو اس سے ان کا نام شعر و ادب کی دنیا میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ کاش ایسا ممکن ہو سکے۔

- سہ ماہی ''نوادر'' لاہور کے مدیر اعلیٰ جناب سید مسعود زیدی ۲۳ اپریل ۲۰۰۸ء بروز بدھ لاہور میں اچانک دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ ان کی عمر تقریباً ۶۵ برس تھی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔ آمین۔
ان کے پس ماندگان میں دوسری اہلیہ سے ایک بیٹا ہے۔ وہ نہایت با اخلاق اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ انھوں نے اپنے والد ڈاکٹر سید نظیر حسنین زیدی مرحوم کے ایصال ثواب اور ان کے علمی کاموں کو آگے بڑھانے اور ان کی یاد کو زندہ رکھنے کے لیے مسجد، امام بارگاہ اور دیگر فلاحی ادارے اور مجلس یادگار سید نظیر حسنین زیدی لائبریری قائم کی۔ مجلہ ''نوادر'' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو علم و ادب کے فروغ میں عرصہ دراز سے حصہ لے رہا ہے اور اپنی نوعیت کا ایک منفرد رسالہ ہے۔ خدا کرے اس مشکل وقت میں جس سے ادب دوچار ہے اس کے زندہ رہنے کی کوئی سبیل پیدا ہو سکے۔

- سنا ؤنی آئی ہے کہ ڈاکٹر ستیہ پال آنند کی اہلیہ محترمہ پچھلے دنوں کناڈا میں انتقال کر گئیں۔ وہ کافی عرصہ سے بیمار تھیں۔ اللہ تعالیٰ آنند جی کو یہ صدمہ برداشت کرنے کا حوصلہ دے اور مرحومہ کی روح کو سکون عطا کرے۔ ادارہ ان مرحومین کے غم میں برابر کا شریک ہے اور نہایت سوگوار ہے۔
ڈاکٹر ستیہ پال آنند کا نیا پتہ یہ ہے:

13055 مارلی کریک روڈ، ہرنڈن۔ V.A- 20151، یو ایس اے

Phone: 703 481 0957 (یو ایس اے)

......لب آزاد ہیں تیرے

جوگندر پال، دہلی

''روشنائی'' افسانہ صدی نمبر حصہ سوم مجھے مل گیا تھا اور اس کے ملنے کی اطلاع آپ کو ان ہی دنوں لکھ بھیجی تھی۔ ادھر یہ سارا عرصہ گری پڑی طبیعت کے باعث میرا لکھنا پڑھنا ٹھپ رہا۔ ٹھیک ہوتے ہی اسے ہاتھ میں لے لیا اور بڑے شوق اور دلچسپی سے مطالعہ میں جٹ گیا۔ افسانہ صدی نمبر کے یہ تینوں حصے آپ نے بڑی محنت اور محبت سے تیار کر کے اردو افسانے کے تاریخی منظر کو پیش کیا ہے اور بڑی ذمہ داری سے یہ اہم کام انجام دیا ہے اور ہم پڑھنے والوں کی مبارک باد کے مستحق ہیں۔ میں انگریزی کا ۹۹ء کا ایک رسالہ دیکھ رہا تھا۔ اس میں سینیل ترویدی کو دیئے ہوئے اپنے ایک انٹرویو میں کہانی کے بعض اہم تر پہلوؤں پر ایک بہت اچھی بحث کے مطالعے کے بعد مجھے خیال آیا کہ اسے اردو میں بھی چھپنا چاہیے۔ آپ بھی پڑھیے اور جی چاہے تو اس کا اردو ترجمہ کروا کے ''روشنائی'' میں چھاپ لیجیے۔

نامی انصاری، کانپور

''روشنائی'' ۔۳۲ کے اداریے میں سرکاری سطح پر اردو کو نظر انداز کرنے کا آپ نے جو تجزیہ پیش کیا ہے وہ سو فی صدی درست ہے۔ ارسٹو کریٹ طبقہ یہ کبھی نہیں چاہتا کہ ارسٹو کریٹ طبقے اور عام اردو داں طبقے کے بیچ جو خلیج ہے وہ کم ہو یا ختم ہو جائے۔ بظاہر تو وہ اردو کو فروغ دینے کے لیے ہزار د... ے کرے گا اور زبانی تحسین کے ہزاروں پھول نچھاور کر دے گا لیکن عملاً وہ کوئی ایسا کام نہیں کرے گا جس سے انگریزی کی عملداری ختم ہو یا اس پر آنچ آئے۔ ہندوستان میں بھی تقریباً یہی حال ہے۔ ہندی راشٹر بھاشا ضرور بن گئی ہے لیکن مرکزی سرکار کا سارا کام کاج انگریزی میں ہوتا ہے۔ ہندی بیلٹ کے ادیب و دانشور ہزار کوشش کرتے ہیں مگر یہ بھاری پتھر ٹس سے مس نہیں ہوتا۔

اس شمارے میں اقبال انصاری کا افسانہ پڑھ کر میں متحیر رہ گیا۔ ان کا اسٹائل بہت کچھ موپاساں سے ملتا ہے۔ پوری داستان کہہ کر آخری چند سطور میں موپاساں قاری کے ذہن کو ایسا جھٹکا دیتا ہے کہ وہ سوچتا ہی رہ جاتا ہے اور افسانہ مدتوں اس کے ذہن سے چپکا رہ جاتا ہے۔ اقبال انصاری کی تکنیک بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ ان کی بُنت بڑی دلآویز اور موثر ہوتی ہے اور قاری ایک ایک لفظ پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اس شمارے میں اور بھی بہت سے مضامین اور افسانے قابل مطالعہ ہیں جن کو دھیرے دھیرے پڑھ رہا ہوں۔ ڈاکٹر نگینہ جبیں نے جیلانی بانو کے افسانوں کے مجموعے (بات پھولوں کی) کا قابل قدر تجزیہ پیش کیا ہے

جو تفصیلی بھی ہے اور قابلِ مطالعہ بھی۔ طارق چھتاری کا مضمون بھی اچھا ہے مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ نذر قاضی عبدالستار کی کتاب کی رسمِ اجرا کے موقعے پر لکھا گیا توصیفی مضمون ہے۔ ورنہ ان کے کارنامے جتنے وقیع ہیں اتنے ہی متنازعہ بھی ہیں۔ خاص کر "حضرت جان" لکھ کر گویا انھوں نے پورنوگرافی کی ایک مثال (اردو میں) قائم کردی ہے۔

قیصر تمکین، لیڈز (انگلینڈ)

آپ کو شاید یقین نہ آئے مگر حقیقت یہ ہے کہ مجھے آپ کی مشکلوں کا پورا احساس ہے۔ بے شمار مزاحم کے باوجود ایک معتبر، مستند اور قابلِ مطالعہ جریدہ نکالنا ہفت خواں طے کرنے سے کم نہیں۔ اللہ آپ کی جرأت، صبر و استقامت اور خدمت علمی و ادبی کا جذبہ سلامت رکھے۔ آمین۔

تازہ ترین شمارہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ بڑی قابلِ مطالعہ نگارشات سے مزین ہے۔ میں نے ایک ایک صفحے کا بالاستیعاب مطالعہ کیا، بہت سی باتیں پڑھنے کے بعد ان کے بارے میں سوچتا رہا۔ میرے خیال سے اگر کسی جریدے کا مواد سوچنے پر مجبور بھی کرے تو یہ اس کی بڑی کامیابی ہے۔

میں نے آغا صاحب کے بارے میں حتی المقدور ایک جامع مضمون لکھا تھا اور چونکہ کوئی اچھا جریدہ اس وقت نظر میں نہیں تھا اس لیے وہ مضمون خود آغا صاحب کو بھیج دیا۔ خدا کرے ان کے پاس محفوظ ہو۔ مجھے تو اب ٹیلی فون کرتے بھی تامل ہوتا ہے کیونکہ وہ بمشکل ہی فون تک پہنچتے اور کچھ باتیں کرنے کی دقت گوارہ کر پاتے ہیں۔ آج ہی انشاء اللہ انھیں بھی خط لکھوں گا کیونکہ ان کے لیے خط پڑھنا یا لکھنا زیادہ وجہ زحمت نہیں ہے۔

حیدر طباطبائی آج ہی صبح "فون تے" تھے۔ میں نے بہت زور دے کر اس بات پر انھیں آمادہ کرلیا کہ وہ جلد از جلد آغا سہیل کے بارے میں لکھ کر آپ کو بھیجیں گے۔

طارق چھتاری، علی گڑھ

آپ کا رسالہ ہندوستان میں بہت دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔ دو حصوں میں "افسانہ صدی نمبر" نکال کر آپ نے بہت اہم اور مفید کام کیا ہے۔ ادھر میں نے اقبال مجید کے ایک افسانے کا تجزیہ کیا ہے۔ آپ کو ارسال کررہا ہوں۔ مضمون کا عنوان ہے "اقبال مجید کا افسانہ پیٹ کا کیچوا"۔ اگر "روشنائی" میں شائع ہونے کے قابل ہو تو اگلے کسی شمارے میں شامل کرلیجیے گا۔

ضیا فاروقی، کانپور

"روشنائی" جناب ظفر اقبال ظفر صاحب کے توسط سے نظر نواز ہوتا رہتا ہے۔ چند روز پیشتر اچھے

بھائی (سید ابوالحسنات حقی صاحب) نے زرین پبلی کیشنز کی دو کتابیں مطالعہ کے لیے عنایت کیں۔ایک آپ کی ترتیب دی ہوئی ابوالخیر کشفی صاحب کی شخصیت پر ہے، دوسری خود کشفی صاحب کی "ہمارے ادبی لسانی اور تعلیمی مسائل" ہے۔دونوں کتابیں نہ صرف خوبصورت اور دیدہ زیب ہیں بلکہ علمی لحاظ سے بھی بھرپور ہیں۔

عبدالاحد ساز، بمبئی

شمارہ۔۳۲ ہر بار کی طرح بامعنی ہی ہے۔گوشہ نامی انصاری خصوصاً متوجہ کرتا ہے۔میں نے نامی انصاری صاحب کی شعری تصنیف "حسابِ جاں" پر تبصرہ کیا تھا جو "ایوانِ اردو" دہلی اور "نیا ورق" بمبئی میں شائع ہوا تھا۔نامی صاحب نے میری شاعری پر اپنے تاثرات بھی عنایت کیے تھے۔

وحید الحسن، امریکہ

چند ہفتے قبل "روشنائی کا افسانہ نمبر۔۳ ملا۔بعض وجوہ کی بنا پر نمبر۔۱ اور نمبر۔۲ نہیں مل سکا۔اس نمبر کے دیکھنے کے بعد کافی افسوس ہوا۔آپ نے ایک گراں قدر کام کیا ہے۔اس زمانے کی اتنی ساری کتابوں اور رسالوں کو کھنگالنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔آج کے پڑھنے والوں کے لیے اور لکھنے والوں کے لیے بھی یہ ریفرنس کا کام دے گا آپ کی محنت سے بہتوں کا فائدہ ہوگا۔

ڈاکٹر اسد فیض، اسلام آباد

افسانہ صدی نمبر آپ کا زندہ جاوید کارنامہ ہے۔اسی طرح آپ کی تازہ ترجمہ شدہ کتاب "کہانیوں کی کہکشاں" بھی جنوبی ایشیا کی مختلف زبانوں کی کہانیوں کو اردو داں طبقہ سے متعارف کروانے کی ایک قابلِ قدر کوشش قرار دی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر غلام شبیر رانا، جھنگ شہر

قرۃ العین حیدر کے اسلوب پر ایک مضمون چند روز تک آپ کی خدمت میں ارسال کر دوں گا۔ اسے آپ "روشنائی" میں شامل کر لیں تو ممنون ہوں گا۔

آپ کی ادارت میں "روشنائی" نے فروغِ علم و ادب میں اہم خدمات انجام دی ہیں۔ادبی مجلات میں اسے ممتاز مقام حاصل ہے۔حریتِ فکر اور جرأتِ اظہار اس رجحان ساز مجلے کا اعزاز و امتیاز ہے۔اس شمارے میں شامل "گوشہ اقبال عظیم" افادیت اور جامعیت میں اپنی مثال آپ ہے۔آپ نے اس نابغۂ روزگار ادیب کو خراجِ تحسین پیش کر کے ایک قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے۔

اعلیٰ معیار کی تحریروں سے مزین نثر اور شاعری کا یہ گلدستہ مجھے بہت پسند آیا۔ میری طرف سے ہدیۂ تبریک قبول فرمائیں۔ قلمی معاونین کی تحریریں اور مکاتیب روح میں اتر جانے والی اثر آفرینی سے معمور ہیں۔ میری دعا ہے "روشنائی" کا یہ سفر جاری رہے اور آپ کی ادارت میں "روشنائی" سفاک ظلمتوں کو کافور کرنے میں اپنا کردار ادا کرتا رہے۔

نذیر فتح پوری، پونا

ماہ فروری ۲۰۰۸ء کے آخری عشرے میں جموں کے ایک مشاعرے میں ظفر اقبال ظفر سے ملاقات ہوئی تو "روشنائی" کا ایک شمارہ دیا جس میں مظفر حنفی کے فکر و فن پر ایک گوشہ شامل ہے۔ میں نے آپ کا یہ رسالہ پہلی بار دیکھا۔ ابھی تک مطالعہ نہیں کر سکا۔ بس سرسری گزرا ہوں۔ حنفی صاحب کے فکر و فن پر مضامین پہلے بھی مطالعے میں آچکے ہیں۔ آذر حفیظ سے متعلق بھی اہم گوشہ نما ہے۔

میں سہ ماہی "اسباق" ۲۷ سال سے شائع کر رہا ہوں۔ میری اپنی اب تک ۳۱ کتابیں مختلف موضوعات پر چھپ چکی ہیں۔ میں آئندہ سے "اسباق" آپ کو ارسال کروں گا۔ آپ بھی مجھے "روشنائی" ارسال فرمایا کریں۔

کراچی کے "سفیر اردو" میں عرصہ ہوا میرے تعلق سے ایک گوشہ آچکا ہے۔ کچھ چیزیں "روشنائی" کے لیے ارسال کر رہا ہوں۔ رسید ملی تو مجھے خوشی ہوگی۔

درد چاپدانوی، کانپور

سہ ماہی "روشنائی" کا وقیع و نفیس شمارہ حضرت عشرت ظفر کے توسط سے ہمدست ہوا۔ یقیناً "روشنائی" کا یہ شمارہ بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ ادب کے نامور اور معروف فن کار پر جس شرح و بسیط کے ساتھ ناقدین ادب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے جی بے حد خوش ہوا۔ قلم کاروں کے انداز نگارش میں محبوب راہی کا عشرت ظفر کی کتاب "حرف باریاب" پر تبصرہ اور "شجر تنہا" عشرت ظفر کا تبصرہ دامن دل کو کھینچتا ہے۔

محمد امین الدین، کراچی

ساڑھے سولہ سو صفحات پر مشتمل افسانہ صدی نمبر شائع کرنے کی لگن، محنت، عرق ریزی، جنون اور نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا جیسے محاوروں کو بیچ کر دکھانے والی کوششوں کی تعریف نہ کرنا سراسر زیادتی ہوگی۔ آپ نے تین جلدوں میں افسانہ صدی نمبر شائع کر کے ادب کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔ حصہ اوّل میں شامل وہ تمام افسانے جو اردو ادب میں کلاسیک کا درجہ حاصل کر چکے ہیں ان کے بارے میں کچھ کہنا

سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگا۔آپ نے افسانوں کی کہکشاں سجادی ہے۔آپ کے تمام عنوانات مثلاً پہلا قدم،انگارے گروپ،سنگ میل،اگلا قدم،نئی جہات اور جہانِ دیگر بھی بہت مناسب ہیں لیکن کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ اردو افسانے میں سو سال کے دوران ابھرنے والی ان تحریکوں مثلاً ترقی پسند افسانہ،علامتی افسانہ،جدید افسانہ،مابعد جدید افسانہ،تجریدی افسانہ وغیرہ کے عنوانات سے بھی کچھ گوشے سجاتے تو قاری کو ان کروٹوں سے بھی آگاہی حاصل ہوتی۔دوسرے حصے کے کئی افسانوں مثلاً رام نواس ۱۹۴۶ء(حسن منظر) سانولی (سید قاسم محمود)، بھائی جان کی کہانی (قیوم راہی)،طلاق (اُمِ عمارہ)،سوزانے (منیر الدین احمد)،سارہ کی گواہی (اے خیام)،دریا (محمود احمد قاضی)،لالی کی بیٹی (نیلم احمد بشیر)،شکستہ پر (بیگ احساس)،اونٹ (شموئل احمد)،روزن (طاہرہ اقبال)،قرض کہانی (بلقیس شاہین)،بوڑھا (طاہر نقوی)،تسبیح دانے (حامد سراج) نے بہت زیادہ متاثر کیا۔دیگر افسانے بھی اچھے ہیں،صرف ایک دو کہانیاں انتخاب میں شامل نہ ہوتیں تو اچھا ہوتا۔حصہ سوم آپ نے حال ہی میں عنایت کیا تھا۔اسے ابھی نہیں پڑھ سکا ہوں۔آپ نے ان تینوں حصوں میں صرف مضامین ہی اتنے یکجا کر دیئے ہیں کہ افسانے کی تنقید پر ایک مکمل کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔چند ایک چھوٹی موٹی خامیاں بھی ہیں مگر اتنے بڑے کام کے سامنے انھیں نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔آپ کی یہ کاوش ایک ایسی اہم دستاویز ہے جو افسانے پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے بہت معاون و مددگار ثابت ہوگی۔میں آپ کی اردو زبان و ادب کے دریا میں ڈالی ہوئی نیکی پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔

جمن احمدانی،ماتلی،ضلع بدین (سندھ)

''روشنائی''۔۳۳ ملا۔اردو ادب کے حوالے سے تازہ تحریروں کا لطف اٹھایا۔ہوئے ایسا لگا جیسے صبح کی کرنوں سے نہائے ہوئے آبشاروں کے جھرنے۔اور ہر جھرنے کا رنگ منفرد۔سندھی رائٹر کی حیثیت سے اردو ادب کا مطالعہ بہت کم ہے اس لیے ''روشنائی'' میں دیئے گئے مضامین پر بحث نہیں کر سکتا۔افسانے کے حوالے سے رتن سنگھ کا ''دردمند'' کچھ کمزور ہے۔انور عنایت اللہ نے افسانہ ''خون سے بہت ڈر لگتا ہے'' میں کردار کو رائفل کے ساتھ کارتوسوں کی پیٹی پکڑائی ہے جبکہ رائفل میں تو گولیاں لوڈ ہوتی ہیں،کارتوس نہیں۔شمشاد احمد ''تیسری عالمی جنگ'' میں کامیاب ہیں۔بلقیس شاہین احساساتی کیفیت کو کہانی کے روپ میں ڈھالنے میں کامیاب ہیں۔رضوان صدیقی،لیئیق احمد،اقبال انصاری،فرزانہ احمد کے افسانے بھی اچھے ہیں۔

شاعری میں باقر نقوی،شاذی فریاد،شہلا نقوی اور دوسرے شعرائے کرام کا کلام بھی دل کو چھوتا ہوا محسوس ہوا۔میں سندھی میں لکھی ہوئی اپنی شاعری کو اردو رنگ دے کر بھیج رہا ہوں۔پسند آئے تو ''روشنائی'' میں جگہ دے دیجیے گا۔